سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
ایک مطالعہ
استاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

سیرتِ نبویؐ

ایک مطالعہ

استاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ

ترجمہ

سجاد حسین مہدوی

یکے از مطبوعاتِ

دارالثقلین

پوسٹ بکس نمبر ۲۱۳۳- کراچی ۷۴۶۰۰ -پاکستان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نام کتاب: سیرت نبویؐ ایک مطالعہ

تقاریر: استاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ

ترجمہ: سجاد حسین مہدوی

نظر ثانی و تہذیب: سید سعید حیدر زیدی

ناشر: دارالثقلین

تاریخ اشاعت: صفر المظفر ۱۴۲۸ھ مطابق مارچ ۲۰۰۷ء

قیمت: ۱۲۰ روپے

انتساب

شہید مرتضیٰ مطہریؒ کے محبوب استاد

رہبر کبیر حضرت امام خمینی علیہ الرحمہ

کے نام

استاد شہید مرتضیٰ مطہریؒ کا ایک تاثر

امام خمینیؒ کے بارے میں

میں نے تقریباً بارہ برس اس عظیم شخصیت سے حصول علم کیا ہے' پھر بھی جب میں پیرس کے اپنے حالیہ سفر کے دوران ان سے ملنے اور ان کی زیارت کے لئے گیا' تو میں نے ان کی شخصیت میں کچھ ایسی چیزیں دیکھیں جنہوں نے نہ صرف مجھے حیرت زدہ کر دیا' بلکہ میرے ایمان میں بھی اضافے کا باعث بنیں۔ جب میں واپس آیا' تو میرے دوستوں نے پوچھا: تم نے کیا دیکھا؟ میں نے جواب دیا: میں نے چار طرح کے آمن (ایمان) دیکھے:

آمَنَ بِهَدَفِه: وہ اپنے مقصد پر ایمان رکھتے ہیں۔ اگر ساری دنیا بھی اکٹھی ہو جائے' تو انہیں ان کے مقصد سے نہیں ہٹا سکتی۔

آمَنَ بِسَبِیْلِه: انہوں نے جس راستے کا انتخاب کیا ہے' اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ کوئی انہیں اس راستے سے نہیں ہٹا سکتا۔ بالکل اس ایمان کی مانند جو رسولِ اکرمؐ اپنے مقصد اور اپنے منتخب کئے ہوئے راستے پر رکھتے تھے۔

آمَنَ بِقَوْلِه: میں جتنے دوستوں کو جانتا ہوں' اُن میں سے کوئی ایک بھی ان کی طرح ایرانی عوام کے عزم و حوصلے پر یقین نہیں رکھتا۔ لوگ انہیں نصیحت کرتے ہیں کہ جناب ذرا آہستہ آہستہ اور دیکھ بھال کر! لوگ ٹھنڈے پڑ جائیں گے' لوگ پیچھے ہٹ جائیں گے۔ لیکن وہ فرماتے ہیں: نہیں! عوام ایسے نہیں ہیں جیسا تم کہتے ہو۔ میں لوگوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ اور ہم سب دیکھ رہے ہیں کہ روز بروز ان کے قول کی صحت زیادہ سے زیادہ واضح ہو رہی ہے۔

سب سے آخر میں اور سب سے بڑھ کر آمَنَ بِرَبِّه ہے۔ ایک نجی محفل میں انہوں نے مجھ سے فرمایا تھا: ''یہ ہم نہیں ہیں جو یہ کر رہے ہیں۔ میں واضح طور پر خدائی ہاتھ محسوس کر رہا ہوں۔''

وہ انسان جو خدا کے ہاتھ اور اسکی تائید کو محسوس کرتا ہے اور خدا کی راہ میں قدم بڑھاتا ہے' تو خدا بھی اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ کے مصداق اس کی مدد میں اضافہ فرماتا ہے۔

فہرست

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

سیرت نبویؐ پر استاد شہید مرتضٰی مطہریؒ کی کتاب پیش خدمت ہے۔

کتابِ حاضر تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ جسے دیباچہ کہا گیا ہے، اس میں استاد شہید مرتضٰی مطہریؒ کے قلم سے لکھے گئے دو مقالات شامل ہیں۔ ان میں سے ایک مقالے کا عنوان ''سہ طرفہ دعوتیں'' اور دوسرے کا عنوان ''اسلامی موج'' ہے۔ یہ دو مقالات ''محمدؐ خاتمِ پیامبران'' نامی کتاب کی پہلی اور دوسری جلد پر لکھے گئے استاد شہید مرتضٰی مطہریؒ کے مقدمے ہیں، یہ کتاب چند علما کے مقالات پر مشتمل ہے، جسے پندرھویں صدی ہجری کے آغاز کے موقع پر حسینیہ ارشاد تہران نے شائع کیا تھا۔

زیرِ نظر کتاب کا دوسرا حصہ، جو اصل کتاب ہے تہران کی ایک مسجد میں ۱۳۹۶ھ کے ایامِ فاطمیہ کی مناسبت سے ''سیرت نبویؐ'' کے موضوع پر استاد شہید مرتضٰی مطہریؒ کی آٹھ تقاریر پر مشتمل ہے۔ اس گفتگو کا اصل موضوع ''اسلام کی نظر میں شناخت کے منابع'' تھا، اور استاد مطہریؒ نے چند منابع کا ذکر کرنے کے بعد اولیائے دین کی سیرت کو بھی اسلام کی نظر میں شناخت کے ایک منبع کے طور پر پیش کیا اور وہاں سے سیرت نبوی کی بحث میں داخل ہوئے۔ اس بحث میں داخل ہونے سے پہلے استاد شہید مطہریؒ نے اس گمراہ کن فکر کے بارے میں بھی مختصراً اظہارِ خیال فرمایا ہے کہ اولیائے دین کی پیروی ممکن نہیں۔ ہم نے اس گفتگو کو ان آٹھ تقاریر کا مقدمہ بنایا ہے۔

ظاہر بات ہے سیرت نبوی کے بارے میں گفتگو ایک انتہائی وسیع اور مختلف پہلوؤں کی حامل گفتگو ہے' اور اگر کوئی اس بارے میں کتاب لکھنا چاہے' تو یہ کتاب کئی ضخیم جلدوں کی صورت میں تیار ہوگی۔ جیسا کہ خود استاد مطہریؒ نے اس کتاب میں تحریر کیا ہے کہ: چند سال پہلے میں نے سوچا کہ اس خاص روش پر جس کے متعلق میں بعد میں عرض کروں گا سیرتِ پیغمبرؐ کے موضوع پر ایک کتاب لکھوں۔ میں نے متعدد یادداشتیں (notes) تیار کیں' لیکن میں جتنا آگے بڑھا' یہ دیکھا کہ گویا ایک ایسے سمندر میں اتر رہا ہوں جو بتدریج گہرا ہی ہوتا چلا جارہا ہے۔ البتہ میں نے اس کام کو ترک نہیں کیا ہے' البتہ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میں یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ میں سیرتِ رسول لکھ سکتا ہوں لیکن ما لا یُدرَکُ کُلُّہُ لا یُترَکُ کُلُّہُ. (جس چیز کو پورے طور پر حاصل نہ کیا جاسکے اسے پورے طور پر چھوڑنا بھی نہیں چاہیے) میں نے یہ عزم کیا ہوا ہے کہ خدا کی مدد اور نصرت سے ایک دن اس موضوع پر کچھ ضرور لکھوں گا' تاکہ بعد میں آنے والے دوسرے لوگ اس سے بہتر لکھیں۔ اسی بنا پر ہم نے یہ بہتر سمجھا کہ اس کتاب کا نام ''سیرت نبویؐ' ایک مطالعہ'' رکھیں۔

اس کتاب کا تیسرا حصہ' جسے ضمیمے کا نام دیا گیا ہے' استاد مرتضیٰ مطہریؒ کی ایک تقریر اور پیغمبر اکرمؐ کے سو کلمات کے ترجمے پر مشتمل ہے۔ یہ تقریر رسولِ اکرمؐ کی مختصر سوانح حیات اور آنحضرتؐ کے چند کلمات کے تجزیے پر مشتمل ہے' جسے استاد مطہریؒ نے سترہ ربیع الاول ۱۳۹۴ھ کو حسینیہ ارشاد تہران میں کیا تھا۔ ان سو کلمات کا بھی ایک قصہ ہے' جس کا تذکرہ کتاب میں کیا گیا ہے۔

ہم نے کتاب کے ترجمے میں انتہائی احتیاط اور امانتداری سے کام لیا ہے' اور نظر ثانی کے دوران جہاں ضرورت محسوس ہوئی ہے وہاں اس انداز { } کے بریکٹس لگا کر بات کو واضح انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ نیز جو حاشیے نظر ثانی کے دوران لگائے گئے ہیں انہیں بھی اسی انداز کے بریکٹس کے اندر رکھا گیا ہے۔ امید ہے ہمارے ادارے سے شائع کردہ دوسری کتب کی طرح' یہ کتاب بھی قارئین سے سندِ قبولیت حاصل کرے گی۔

☆☆☆

دیباچہ

الف: سہ طرفہ دعوتیں

دعوت یعنی کسی گروہ سے تعلق رکھنے والے ایک فرد کا' دوسرے لوگوں کو کسی عقیدے اور کسی مذہب کی طرف بلانا اور انہیں اس کی طرف مائل کرنا' انسانی سماج سے مخصوص مسائل میں ہے۔

ان دعوتوں کی تاثیر کا دائرہ طول وعرض اور گہرائی کے اعتبار سے یکساں نہیں' بلکہ مختلف ہے۔ اکثر ان کی تاثیر کم اور چھوٹے پہلوؤں میں ہوتی اور ہوا کرتی ہے۔ اسی لئے یہ تاریخی اور سماجی اعتبار سے توجہ کے لائق اور قابلِ اہمیت نہیں ہوتیں۔ لیکن بعض دعوتیں ایسی ہیں جو کم از کم کسی ایک پہلو سے کافی آگے نکل گئیں۔ مثلاً یہ دعوتیں مختصر مدت ہی کے لئے سہی لیکن ایک بڑے حلقے پر اثر انداز ہوئیں' یا کم لوگوں کے درمیان کئی صدیوں تک قائم ودائم رہیں' یا ان دعوتوں نے محدود مدت کے لئے' لوگوں کی ایک مختصر جماعت پر گہرے نقوش چھوڑے۔ اس قسم کی دعوتیں اہمیت دیئے جانے کے قابل' تجزیہ وتحلیل کے لائق اور بسا اوقات تحسین وتعریف کی مستحق بھی ہوتی ہیں۔

جو چیز سب سے زیادہ قابلِ اہمیت اور لائق توجہ ہے' وہ ایسی دعوتیں ہیں جو تمام پہلوؤں میں آگے بڑھی ہوں۔ انہوں نے بہت بڑے دائرے کو بھی اپنی لپیٹ میں لیا ہو' مسلسل کئی صدیوں تک انتہائی شان کے ساتھ حکومت بھی کی ہو اور ساتھ ساتھ انسان کی روح کی گہرائیوں

میں جڑ بھی پکڑی ہوئی ہو۔

اس قسم کی سہ طرفہ دعوتیں سلسلۂ انبیا سے مخصوص ہیں۔ کونسے ایسے فکری یا فلسفی مکتب کا سراغ لگایا جا سکتا ہے جس نے دنیا کے بڑے ادیان کی طرح کروڑوں افراد پر، تمیں صدیوں تک، بیس صدیوں تک یا کم از کم چودہ صدیوں تک حکومت کی ہو اور لوگوں کی روح کی گہرائیوں تک پر اثر انداز ہوا ہو؟ یہی وجہ ہے کہ انبیا بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر حقیقی تاریخ ساز رہے ہیں۔

تاریخ انسان کے ہاتھ کی بنی ہے اور انسان ہر چیز سے بڑھ کر پیغمبروں کے ہاتھ کا بنایا اور سنوارا ہوا ہے۔ اگر انسان کو جدت طرازی اور تعمیر و ترقی کا میدان فرض کر لیا جائے، تو کوئی ہنر مند اور کوئی صنعت گر انبیا کی برابری نہیں کر سکتا۔ خالقِ کائنات نے کائنات کو انسان کے لئے مسخر کیا ہے، انسان کو قوت ایمانی کے تابع کیا ہے اور اس قوت کی لگام انبیا کے ہاتھ میں دی ہے۔

ایمان کے علاوہ جو کچھ بھی ہے، خواہ وہ عقل ہو یا علم، ہنر ہو یا صنعت، قانون ہو یا کچھ اور یہ سب انسان کی جبلی خواہشات کی تسکین اور لامحدود خواہشات کی تکمیل کے لئے اس کے ہاتھ میں آلۂ کار ہیں۔ انسان ان سب کو اپنے مقاصد کے حصول اور اپنی نفسانی خواہشات کی تسکین کے لئے استعمال کرتا ہے اور ایک اوزار (یا آلۂ کار) کی طرح ان سے استفادہ کرتا ہے۔ صرف قوت ایمانی (وہ بھی وہ ایمان جو انبیا پیش کرتے ہیں) ہی وہ چیز ہے جو ایک طرف تو قرآنی تعبیر کے مطابق روح کو نئی زندگی دیتی ہے (۱) یعنی کچھ ارفع اور انسانی اور مافوقِ طبیعی اہداف کو پیش کرتے ہوئے نئی خواہشات وجود میں لاتی ہے اور اس کی پیروی میں نرم جذبات اور لطیف احساسات پیدا کرتی ہے اور آخر کار انسان کی اندرونی دنیا کو بدل کر اسے وسعت بخشتی ہے، اور دوسری طرف فطری خواہشات اور جبلتوں کو اعتدال میں لاتی اور انہیں کنٹرول کرتی ہے۔

انسان کی علمی اور فنی طاقت کے لئے کوئی قلعہ ناقابلِ تسخیر نہیں ہے، سوائے ایک قلعے کے،

۱۔ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ. (اے ایمان والو اللہ و رسول کی آواز پر لبیک کہو جب وہ تمہیں اس امر کی دعوت دیں جس میں تمہاری زندگی ہے۔ سورۂ انفال ۸۔ آیت ۲۴)

اور وہ ہے انسانی روح اور اس کے نفس کا قلعہ۔ پہاڑ' صحرا' سمندر' خلا' زمین' آسمان سب کی سب چیزیں انسان کی علمی اور فنی عملداری میں شامل ہیں' واحد مرکز جو اس کی عملداری سے باہر ہے وہی چیز ہے جو خود انسان سے نزدیک ترین ہے۔ اس قلعے کو فتح کرنا بقول مولانا روم:

کار عقل و ہوش نیست

شیر باطن سخرۂ خرگوش نیست (۱)

اتفاق سے انسان کے آرام و سکون' امن و عدالت' آزادی و مساوات اور آخر کار انسان کی خوش بختی اور سعادت کا خطرناک ترین دشمن اسی قلعے میں چھپا اور اس کی گھات میں بیٹھا ہوا ہے۔

"اَعْدیٰ عَدُوِّکَ نَفْسُکَ الَّتِی بَیْنَ جَنْبَیْکَ." (۲)

آج کا انسان اس قدر علمی کامیابیوں کے باوجود دردانگیز نالے بلند کر رہا ہے۔

یہ کیوں نالہ کناں ہے؟

اس میں کس پہلو سے کمی اور نقص پایا جاتا ہے؟

کیا اخلاق و عادات اور ''آدمیت'' کے علاوہ کسی اور پہلو سے {اُس میں کوئی کمی پائی جاتی} ہے؟

آج انسان علمی اور فکری اعتبار سے اس مقام پر پہنچ چکا ہے کہ اب وہ آسمانوں پر سفر کا ارادہ رکھتا ہے اور سقراط اور افلاطون جیسے لوگ اسکی شاگردی کا اعزاز قبول کرنے کو تیار ہوں گے۔ لیکن روحانیت' اخلاق اور عادات و اطوار کے اعتبار سے وہ ایک شمشیر بدست وحشی کی مانند ہونے سے زیادہ کچھ اور نہیں ہے۔ آج کے انسان نے علم و فن میں اپنی تمام تر معجزانہ ترقیوں کے باوجود آدمیت اور انسانیت کے اعتبار سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھایا' بلکہ اپنے تاریک ترین دور کی جانب پلٹ گیا ہے۔ البتہ ایک فرق کے ساتھ' اور وہ یہ کہ ماضی کے برخلاف وہ اپنی علمی'

۱۔ یہ عقل و ہوش کا کام نہیں ہے۔ باطن کا یہ شیر خرگوش کا تر نوالہ نہیں ہے۔

۲۔ حدیث نبوی ہے: تمہارا سب سے بڑا دشمن وہی نفس ہے جو تمہارے دو پہلوؤں کے درمیان ہے۔

فلسفی اور ادبی طاقت کو کام میں لا کر' انسانیت کے خلاف اپنے تمام جرائم کو اخلاق' انسان دوستی' حریت پسندی اور صلح دوستی کے جھوٹے نعروں کی آڑ میں انجام دیتا ہے۔ دوٹوک سچ کی جگہ منافقت اور ظاہر و باطن کی دوئی نے لے لی ہے۔ کسی اور زمانے میں عصرِ جدید کی طرح عدالت' آزادی' اخوت' انسان دوستی' امن' صلح' سچائی' امانت' صداقت' احسان اور خدمت کی بات نہیں کی گئی اور اس دور کی طرح کسی اور دور میں ان امور کے برخلاف عمل بھی نہیں ہوا۔ اور یوں آج کا انسان اللہ تعالیٰ کے اس قول کا مصداق بن گیا ہے کہ:

"وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یُّعْجِبُکَ قَوْلُهٗ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ یُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰی مَا فِیْ قَلْبِهٖ وَ هُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ. وَ اِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْهَا وَ یُهْلِکَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ."(۱)

آج کی دنیا میں ایک طرف تو انسان دوستی کے کان پھاڑ دینے والے دعوے سنائی دے رہے ہیں' اور دوسری طرف قوم پرستی' جو خود نفرت کی ایک قسم ہے' سے پیدا ہونے والے تعصبات' خود پسندیاں' قساوتیں اور آتش افروزیاں روز بروز زیادہ سے زیادہ ہو رہی ہیں۔ یہ ان تناقضات میں سے ایک تناقض ہے جن میں آج کے انسان کی منطق مبتلا ہے۔

کیا اس سے زیادہ بے بنیاد بات اور اس سے بڑھ کر بیہودہ دعوت کوئی اور ہو سکتی ہے کہ ایک طرف تو ہم مذہب کو' جو انسانی اقدار کی واحد بنیاد ہے' پس پشت ڈال دیں اور دوسری طرف انسانیت اور اخلاق کا دم بھریں اور لفاظی کے زور پر اور خالی خولی وعظ و نصیحت کے بل پر انسان کی طبیعت کو تبدیل کرنا چاہیں؟ یہ عمل بغیر ضمانت اور بغیر سکیورٹی کے نوٹ چھاپنے کی مانند ہے۔

۱۔ انسانوں میں ایسے لوگ بھی ہیں دنیاوی زندگی (کی مصلحتوں) کے بارے میں جن کی باتیں تمہیں متعجب کرتی اور بھلی محسوس ہوتی ہیں اور جو اپنے دل کی باتوں پر خدا کو گواہ بناتے ہیں' حالانکہ وہ سخت ترین دشمن ہیں۔ اور جب وہ تمہارے پاس سے اٹھ کر جاتے ہیں تو زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں اور کھیتیوں اور نسلوں کو برباد کرتے ہیں۔ (سورہ بقرہ ۲۔ آیت ۲۰۴' ۲۰۵)

ایسا نہیں ہے کہ اس صدی کا انسان ان نقائص اور کمزوریوں کو محسوس نہیں کر رہا' یا ان کے حل کی فکر میں نہیں ہے۔ نہیں! وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ انہیں محسوس کر رہا ہے۔ یہ طمطراق کے ساتھ پیش کیے جانے والے فلسفے' یہ عظیم بین الاقوامی ادارے اور ''حقوق انسانی'' کے بلند و بالا اعلامیے' نقائص اور کمزوریوں کے اس احساس کے سوا اور کس چیز کا نتیجہ ہیں؟

لیکن بدقسمتی سے ''بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے'' کا وہی مشہور تجربہ ایک بار پھر دہرایا جا رہا ہے۔ خرابی وہی پرانی خرابی اور مشکل وہی قدیم مشکل ہے' اور وہ ہے اجرا و نفاذ کرنے والی قوت کا فقدان۔

یہ فلسفے' یہ ادارے' یہ اعلامیے اور یہ قراردادیں محروم انسان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکے۔ بلکہ ان کا الٹا نتیجہ برآمد ہوا ہے' اور جو رسی انسان کو کنویں سے نکالنے کے لیے ڈالی گئی تھی' وہ پھندا بن کر اس کے گلے میں پڑ گئی ہے اور یہ پھندا روز بروز تنگ سے تنگ ہوتا چلا جا رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نظامِ خلقت میں جس چیز کو دوسری چیز کا محکوم خلق کیا گیا ہے' اسے فلسفے' اعلامیے' مقالے اور تقریر کے ذریعے اس چیز پر حاکم نہیں بنایا جا سکتا۔ علم' فکر اور فلسفہ دنیا کی طبیعت (nature) پر تو حاکم ہے' لیکن انسانی طبیعت کا محکوم ہے۔ انسانی حقوق جب تک صرف ایک فلسفے کی شکل میں رہیں گے' طبعاً انسانی طبیعت کے لیے ان کی حیثیت ایک آلۂ کار کی سی رہے گی۔

آج ہم ایک ایسی دنیا میں زندگی گزار رہے ہیں' جس میں انسانی طبیعت کی محکوم چیزوں نے بہت فروغ حاصل کر لیا ہے اور بہت مستحکم ہو گئی ہیں' لیکن جو چیز اس کی طبیعت پر حاکم ہے وہ کمزور رہ گئی ہے' یا اس نے کم از کم اُن دوسری چیزوں کے برابر ترقی حاصل نہیں کی ہے۔ چنانچہ انسانی طبیعت کے محکوم مسائل میں اس قدر ترقیوں کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ جو شخص جس راہ پر چل رہا اور جس مقصود کا طالب ہے اس پر تیز رفتاری اور قوت کے ساتھ رواں دواں ہے لیکن اس کی خواہشات کی نوعیت' زندگی اور زندگی کے مقصد کے بارے میں اس کے اندازِ فکر اور اس کے جذبات و رجحانات اور لطیف احساسات اور آخر کار ان مسائل میں جو انسان کی طبیعت پر حاکم ہیں'

کوئی معمولی سی تبدیلی بھی واقع نہیں ہوئی ہے۔

انسان نے حتی الامکان اپنے اردگرد کے ماحول کو تبدیل کیا ہے' لیکن اپنے آپ کو اور اپنے انداز فکر کو اور اپنے جذبات ورجحانات کو تبدیل نہیں کرسکا یا نہیں کرنا چاہتا۔ آج کے انسان کی مشکلات کی جڑ اسی جگہ تلاش کرنی چاہئے۔ جیسا کہ انسان کو دین' روحانیت' ایمان اور نبی کی ضرورت کی بنیادوں کو بھی اسی مقام پر تلاش کرنا چاہئے۔

عظیم اسلامی مصلح اور مفکر' اقبال کہتے ہیں:

''انسانیت کو آج تین چیزوں کی ضرورت ہے: دنیا کی روحانی تعبیر' فرد کی انفرادی آزادی (۱) اور دنیا پر اثر انداز ہونے والا ایسا بنیادی اصول جو روحانی بنیاد پر انسانی سوسائٹی کے تکامل کی توجیہ کرے۔''

وہ مزید کہتے ہیں:

''اس میں شک نہیں کہ جدید یورپ نے نظریاتی اور مثالی سسٹم بنائے ہیں' لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ جو حقیقت صرف اور صرف عقلِ محض کے راستے حاصل کی جائے اس میں زندہ اعتقاد کی حرارت نہیں ہو سکتی جو صرف ذاتی الہام سے حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عقلِ محض نے نوعِ بشر پر کوئی اثر نہیں ڈالا ہے' جبکہ دین ہمیشہ لوگوں کی ترقی اور انسانی معاشروں میں تبدیلی کا باعث رہا ہے۔ یورپ کی مثالی گری' ہرگز اس کی زندگی میں ایک زندہ عامل کی حیثیت حاصل نہیں کرسکی ہے اور اس کا نتیجہ ایک حیران پریشان ''میں'' کی صورت میں سامنے آیا ہے جو ایک دوسرے کے ساتھ ناہم آہنگ جمہوریتوں کے درمیان اپنی تلاش میں ہے کہ جن کا واحد کام مالداروں کے لئے غریبوں سے استفادہ کرنا ہے۔ میری بات پر یقین کیجئے کہ آج کا یورپ انسانیت کے اخلاق کی ترقی میں سب سے بڑی

۱۔ صرف سیاسی اور اجتماعی آزادیاں کافی نہیں ہیں۔

رکاوٹ ہے۔''(۱)

اگر ہندوستان کا مرحوم وزیر اعظم نہرو ایک مدت تک لادینیت میں زندگی بسر کرنے کے بعد اپنی عمر کے آخری حصے میں خدا کی تلاش پر آمادہ ہوتا ہے اور اس بات کا معتقد ہو جاتا ہے کہ:

''وہ جدید تمدن جو (آج) رواج پا رہا ہے' اس کے معنوی خلا کے مقابلے میں ہمیں کل سے زیادہ روحانی اور معنوی جوابات تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔'' اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ انسان کی آج کی مشکلات کی اصل جڑ کو سمجھ چکا ہے اور اس نے یہ بات جان لی ہے کہ آج کے انسان کو کسی بھی دوسرے دور سے زیادہ روحانی اور معنوی آزادی کی ضرورت ہے اور اس ضرورت کو انسان کے انداز فکر اور اس کے تصور کائنات (جس کے تحت وہ اس کائنات اور زندگی کو با مقصد سمجھے' عبث اور فضول نہیں) میں بنیادی تبدیلی لائے بغیر پورا نہیں کیا جا سکتا ہے۔

اور اگر ہم ''برنارڈ شا'' کو دیکھتے ہیں' جو کہتا ہے کہ:

> ''میں یہ پیشگوئی کرتا ہوں اور ابھی سے اس کے آثار بھی نظر آنے لگے ہیں کہ محمد کا دین مستقبل کے یورپ کے لئے قابلِ قبول ہو جائے گا۔ میرے خیال میں اگر اُن جیسا کوئی انسان جدید دنیا کا فرمانروا ہو جائے' تو وہ دنیا کے مسائل اور مشکلات کے حل میں اس طرح کامیاب ہوگا کہ صلح اور سعادت کے سلسلے میں انسان کی تمنا پوری ہو جائے گی۔''

تو یہ اس لئے ہے کہ وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ دنیا کی روحانی تفسیر اور لوگوں کی روحانی آزادی کی ضرورت کے علاوہ عالمی تاثیر رکھنے والا ایسا بنیادی اصول بھی درکار ہے جو انسانی معاشرے کے کمال کی روحانی بنیاد پر توجیہ کرے اور بقولِ اقبال: ''ایسی وحی پر مبنی ہو جو زندگی کی اندرونی ترین گہرائی سے بیان ہوئی ہو اور اس کی شکل کے ظاہر کو باطنی رنگ دے۔''

قرآنِ کریم اپنی دلنشین اور خوبصورت آیات میں تین چیزوں کو انسان کی شدید ترین

۱۔ احیائے فکرِ دینی در اسلام۔ ص ۲۰۳' ۲۰۴

ضروریات شمار کرتا ہے:

ا۔ "اللہ" پر ایمان۔ اس بات پر ایمان کہ "دنیا کا ایک مالک ہے جس کا نام خدا ہے"۔ بالفاظ دیگر دنیا کی روحانی تفسیر۔

۲۔ رسول اور اس کی رسالت پر ایمان۔ یعنی ایسی آزادی بخش اور جاندار تعلیمات پر ایمان' جو معاشرے کے کمال کی روحانی بنیاد پر تفسیر کرے اور ظاہری زندگی کو معنوی رنگ دے۔

۳۔ خدا کی راہ میں جان و مال سے جہاد (۱) یعنی معنوی آزادی اور آزادگی۔

ان ضروریات سے زیادہ واضح کوئی اور ضرورت نہیں مل سکے گی۔

مختلف مکاتب' مسالک' ادیان اور مذاہب کے درمیان صرف اسلام ہے جو ان تینوں ضروریات کا جواب دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسلام کے ظہور کو چودہ سو سال گزر جانے کے باوجود آج بھی دنیا اسی قدر اس کی محتاج ہے جتنی روز اوّل تھی۔ جس دن ان ضروریات کا احساس عام ہو جائے گا (اور وہ دن دور نہیں) اس دن انسان کے پاس اپنے آپ کو اسلام کی آغوش میں ڈال دینے کے سوا کوئی اور چارہ نہ ہوگا۔

آج تمام مذاہب سے ایک قسم کی دوری واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ اسلام بھی اپنے اندر ایک قسم کے بحران سے دوچار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام اس حوالے سے کلیسا کی غلطیوں کو بھگت رہا ہے۔ {یورپ کی} نشاۃ ثانیہ کے دور میں کلیسا نے سائنس اور تمدن کے خلاف جس غلط ردِ عمل کا مظاہرہ کیا' اُس نے عمومی طور پر مذہب کی حیثیت پر کاری ضرب لگائی اور سطحی افکار {رکھنے والے لوگ} یہ سمجھنے لگے کہ علم و دانش کی مخالفت دین و مذہب کی خاصیت ہے۔ یہ رائے زیادہ عرصے قائم نہیں رہے گی۔ آج بھی جن لوگوں نے کم از کم اسلامی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے' اُن پر واضح ہے کہ اسلام اور کلیسا کا معاملہ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اسلام خود ایک عظیم تمدن کا بانی ہے اور اس

ا۔ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ (اللہ اور اسکے رسول پر ایمان لے آؤ' اور راہِ خدا میں اپنے جان و مال سے جہاد کرو۔ سورۂ صف ۶۱۔ آیت ۱۱)

نے اپنی پُر افتخار تاریخ میں جامعات (universities) بنائی ہیں' نابغۂ روزگار دانشور دنیا کے حوالے کیے ہیں اور علم و تمدن کی بڑی مدد کی ہے۔ یہ لوگ (تاریخِ اسلام کے مطالعے سے) انسانی تمدن کے لئے اسلام کی عظیم اور فخر سے سربلند کر دینے والی خدمات کی قدر و قیمت اور آج کے یورپ پر اسلامی تمدن کے عظیم احسان سے آگاہ (ہوتے ہیں) اور انہیں معلوم (ہو جاتا ہے) کہ جو چیز اسلام کے بارے میں درست ہے' وہ اس کے بالکل برعکس ہے جو کلیسا کے بارے میں صادق آتی ہے۔ کلیسا نے نہ صرف کسی تمدن کو وجود نہیں بخشا بلکہ جس تمدن نے اسے قبول کیا اس نے اُسے بھی تباہ کر دیا۔ لیکن اسلام بذاتِ خود ایک شاندار تمدن وجود میں لایا اور اسے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اسلام وہ واحد دین ہے جو خود ایک ہمہ جہت تمدن کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہوا۔ بقول شیخ محمد عبدہ:

> ''یورپ نے جس دن سے اپنے مذہب کو چھوڑا ہے' ترقی کی ہے اور ہم نے جس دن سے اپنے مذہب کو ترک کیا ہے' زوال میں مبتلا ہوئے ہیں۔''

ان دو مذاہب کا فرق یہیں سے واضح ہو جاتا ہے۔۔۔ یورپ نے عالمِ اسلام سے تعلق پیدا ہونے کے بعد اپنا مذہب چھوڑا' اور ان کا (اپنے مذہب کو) چھوڑنا اسلامی اقدار کی جانب ان کے جھکاؤ کی صورت میں واقع ہوا۔

ب: اسلامی موج

دنیائے طبیعت (nature) ' چاہے وہ بے جان طبیعت ہو یا جاندار طبیعت ' اُس میں پیش آنے والا ہر حادثہ ' ایک تحرک اور جنبش پیدا کرتا ہے اور اپنے اردگرد ایک موج وجود میں لاتا ہے۔

بلکہ ہر حادثہ بذاتِ خود ایک موج اور ایک تحرک ہے جو اس بے کراں سمندر میں نمودار ہوتا ہے۔

یہ سمندر جسے ہم '' کائنات ' طبیعت ' گیتی '' وغیرہ کہتے ہیں اور اس کے طول وعرض اور گہرائی سے صرف خدا ہی واقف ہے ' یہ ہمیشہ موجوں کو اپنے اندر سے باہر کی جانب پھینکتا ہے اور تحریکیں پیدا کرتا ہے۔ اس سمندر سے جو چیز ہمارے سامنے نمودار ہوتی ہے ' ہمارے حواس کے دائرے میں آتی ہے اور ہماری عقل اس کی حقیقت اور ماہیت جاننے پر آمادہ ہوتی ہے (ایک اعتبار سے) یہی امواج اور نشیب وفراز ہیں جنہیں ہم '' حادثہ '' کہتے ہیں اور اس کے مختلف نام رکھتے ہیں اور اس کی معرفت کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر یہ موجیں اور نشیب وفراز یا دوسرے الفاظ میں: اگر یہ '' تعینات '' نہ ہوتے تو معرفت کی کوئی راہ نہ ہوتی ' کیونکہ کوئی نشانی نہ ہوتی ' بلکہ طبیعت اور کائنات کا کوئی ذکر ہی نہ ہوتا۔ کیونکہ طبیعت کی جنبش اور تموّج سے جدائی کا امکان ہی نہیں ہے۔

یہی نشانیاں ' علامات ' پیچ وخم اور نشیب وفراز ہیں جو ہمارے حواس کے لئے چیزوں کی تصویر

کشی کو ممکن بناتے ہیں اور یہ تصاویر عقل کے قاضی کے سپرد کردی جاتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ طبیعت میں موجود ہر چیز جب تک ہے متموج ہے' حرکت و جنبش میں ہے۔ اور جب تک متموج اور حرکت و جنبش میں ہے' اُس وقت تک موجود ہے۔ موجزن اور حرکت میں نہ ہونا' نیستی اور نابودی کے مترادف ہے۔

ساحل افتادہ گفت گرچہ بسی زیستم
آہ نہ معلوم شد ہیچ کہ من چیستم
موج ز خود رفتہ ای تیز خرامید و گفت
ہستم اگر می روم' گر نروم نیستم (۱)

امواج' اپنی ذاتی خصوصیت کے مطابق' اپنی پیدائش کے ساتھ ہی پھیلتی اور وسعت اختیار کرتی رہتی ہیں' مسلسل اپنا دائرہ بڑھاتی رہتی ہیں' محیط اور مرکز کے فاصلے میں اضافہ کرتی رہتی ہیں۔ اور دوسری طرف جتنا اپنے دائرے کو وسیع کرتی ہیں' اتنا ہی اُن کی قوت' شدت اور طول میں کمی آتی جاتی ہے' بتدریج کمزور سے کمزور تر ہوتی جاتی ہیں اور اُن کا طول کم سے کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ (کم از کم ہماری نظر میں) نیستی و نابودی کی طرف بڑھتی جاتی ہیں اور دنیائے عدم سے جا ملتی ہیں۔

موجوں کا ایک دوسرے سے ٹکراؤ' ان میں موجود کمزور موج کے بے اثر ہونے کا سبب بنتا ہے۔ طاقتور موجیں کمزور موجوں کے پھیلاؤ کو روک دیتی ہیں اور انہیں ملکِ عدم روانہ کردیتی ہیں۔ لہٰذا رکاوٹوں اور زیادہ طاقتور عوامل سے ٹکراؤ امواج' حوادث اور مظاہر کائنات کو نابود کردینے والے عوامل میں سے ایک اور عامل (factor) ہے۔ حکما اس قسم کی نیستی اور نابودی کو جور کاوٹوں

۱۔ ایک طرف ساکت پڑے ہوئے ساحل نے کہا کہ میں نے طویل زندگی بسر کی ہے لیکن میں یہ معلوم نہ کرسکا کہ میں کون ہوں۔ از خود رفتہ موج نے تیز تیز چلتے ہوئے کہا' اگر میں موجزن رہوں تو ہوں اور اگر ساکت ہو جاؤں تو نہیں ہوں۔

سے ٹکراؤ کی وجہ سے واقع ہوتی ہے "موتِ اخترامی" کہتے ہیں اور پہلی قسم کی نابودی کو جس کی وجہ بقا کی قوت کا خاتمہ ہوتی ہے "موتِ طبیعی" کہتے ہیں۔

"هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰۤی اَجَلًا وَ اَجَلٌ مُّسَمًّی عِنْدَهٗ." (۱)

انسانی معاشرہ بھی اپنے اندر پیش آنے والے چھوٹے بڑے اور مفید یا مضر واقعات کے مجموعے کے ساتھ موج، جنبش، طوفان اور لرزش سے بھرپور ایک سمندر ہے۔ اس سمندر کی موجیں بھی بتدریج وسعت اختیار کرتی ہیں اور باہم ٹکرا کر ایک دوسرے کو مغلوب کرتی رہتی ہیں۔ لیکن ان موجوں کے برعکس جن کی وسعت بڑھتی ہے تو ان کی طاقت وقوت کم ہو جاتی ہے اور وہ نابود ہو جاتی ہیں اس وسیع وعریض سمندر کی بعض موجیں ایسی ہیں کہ جتنا جتنا ان کے دائرے کی وسعت میں اضافہ ہوتا ہے، ان کی طاقت وقدرت اور طول بڑھتا جاتا ہے اور مخالف امواج کے ساتھ ان کے مقابلے کی قوت بڑھتی رہتی ہے۔ گویا ان میں حیات کی ایک خاص خاصیت پائی جاتی ہے اور ان کے اندر "نمو" اور رشد کی ایک پراسرار قوت پوشیدہ ہے۔

جی ہاں! بعض اجتماعی موجیں زندہ ہیں۔ زندہ موجیں وہی ہیں جن کا سرچشمہ جوہرِ حیات ہے، ان کا راستہ زندگی کا راستہ اور ان کا رُخ ترقی وتکامل کا رُخ ہے۔ بعض فکری، علمی، اخلاقی اور ہنری (artistic) تحریکیں اس لئے زندۂ جاوید رہ جاتی ہیں کہ خود زندہ ہیں اور زندگی کی پراسرار طاقت کی حامل ہیں۔

☆

زندہ ترین اجتماعی امواج، دینی امواج اور دینی تحریکیں ہیں۔ ان امواج اور ان تحریکوں کا جوہرِ حیات اور فطرتِ زندگی کے ساتھ بندھن دوسری تمام چیزوں کی نسبت زیادہ حقیقی ہے۔ کسی

۱۔ وہ ایسی ذات ہے کہ جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے اور پھر ایک مدت کا تعین کیا ہے اور ایک مقررہ مدت اس کے پاس بھی ہے۔ (سورۂ انعام ۶۔ آیت ۲)

بھی دوسری حرکت اور کسی بھی دوسری موج میں زندگی کی اس قدر توانائی اور رشد و نمو کی اس قدر طاقت نہیں پائی جاتی۔

تاریخِ اسلام اس اعتبار سے انتہائی سبق آموز اور جھنجوڑ دینے والی ہے۔ اسلام ابتدا میں ایک بہت معمولی موج کی صورت میں ظاہر ہوا تھا۔ جس دن حضرت محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کوہِ ''حرا'' سے نیچے تشریف لائے' اس حال میں کہ ان کی اندرونی دنیا دگرگوں ہو چکی تھی اور وہ غیب کے سمندر اور ملکوتِ اعلیٰ سے متصل اور فیوضاتِ الٰہی سے لبریز ہو چکے تھے' اور آپ نے یہ صدا دی کہ: قُولُوا لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوا۔ (لا الٰہ الا اللہ کہو' تم کامیاب ہو جاؤ گے)' اُسی دن سے اس موج کا آغاز ہو گیا۔

دنیا میں شور و غل اور شان و شوکت کے ساتھ وجود میں آنے والی ہزاروں امواج کے برخلاف' یہ موج اولین ایام میں ایک ایسے گھر کی چار دیواری تک محدود تھی جس میں صرف تین افراد محمدؐ' خدیجہؑ اور علیؑ کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ کچھ ہی عرصے بعد یہ موج مکہ کے تمام گھروں میں داخل ہو گئی۔ تقریباً دس سال بعد مکہ سے باہر خصوصاً مدینہ میں پہنچ گئی اور کچھ ہی عرصے بعد جزیرۃ العرب کے تمام مقامات پر چھا گئی' اور پھر نصف صدی سے بھی کم مدت میں اس کا دامن اُس زمانے کی پوری متمدن دنیا تک پھیل گیا اور اس کی آواز ہر گوشِ شنوا نے سنی۔

اس موج نے' جیسا کہ زندہ موجوں کی خاصیت ہوتی ہے' اپنی وسعت اور پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ اپنی قوت و طاقت اور طول کو بھی بڑھایا۔ ان چودہ صدیوں میں کوئی دین' کوئی آئین' کوئی مسلک اور کوئی تحریک ایسی نہیں مل سکتی جس نے اسلام کا اثر قبول نہ کیا ہو اور کوئی ایسا متمدن مقام نہیں پایا جاتا جہاں اسلام نے نفوذ نہ کیا ہو۔ آج بھی' چودہ صدیاں بعد اور بعثت کی پندرہویں صدی کے آغاز میں' انسان اسلام کی تدریجی وسعت اور اس کی دن بدن بڑھتی ہوئی قوت و قدرت کا نظارہ کر رہا ہے۔

تاریخ اور اعداد و شمار نشاندہی کرتے ہیں کہ اس مقدس دین نے صدی بہ صدی ترقی کی ہے اور اپنے ماننے والوں کی تعداد میں اضافہ کیا ہے اور یہ ترقی تدریجی اور طبعی رہی ہے اور اگر اندلس

جیسی سرزمین طاقت کے زور پر اسلام کے مقدس اور عظیم الشان پرچم کے سائے سے محروم کی گئی تو زیادہ بڑے اور زیادہ آبادی رکھنے والے علاقے جیسے انڈونیشیا اور چین وغیرہ نے پوری رغبت اور فخر کے ساتھ اس کی پیروی کو قبول کیا ہے۔

قرآن مجید اسلامی تحریک کی نشوونما کی خاصیت کو اس طرح بیان کرتا ہے:

"..... انجیل میں ان کی مثال اس کھیتی کی سی ہے جس میں پہلے پہل نازک سبزہ زمین سے نمودار ہوتا ہے، اسکے بعد خدا اسے طاقتور بناتا ہے، پھر اسے موٹا کرتا ہے، اسکے بعد وہ اپنے تنے پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ تیزی کے ساتھ اس کا نشوونما پانا اور اس کی سبزی اور تروتازگی کسانوں کی خوشی و مسرت کا باعث ہوتی ہے، تاکہ اس طرح خدا کافروں اور بدخواہوں کو جلائے۔" (۱)

اسلامی تحریک نے اپنی چودہ سوسالہ تاریخ میں اپنی مخالف خطرناک امواج جیسے قومی، مذہبی، سیاسی اور ثقافتی امواج کا سامنا کیا ہے۔ ان دیواروں اور رکاوٹوں کو نظرانداز کر دیتے ہیں جو متعصب اور ضدی جاہل عربوں نے ابتدائے اسلام میں اس مقدس موج کے سامنے کھڑی کی تھیں اور جو یکے بعد دیگرے گرتی چلی گئیں۔ تاریخِ اسلام، بالخصوص اس کے ابتدائی دوسو سال مخالف مذہبی، قومی اور سیاسی امواج سے بھرے پڑے ہیں، جن میں سے کوئی بھی اس کا مقابلہ نہ کر سکی اور نیست و نابود ہوگئی اور اب تاریخ میں ان کے نام کے سوا کچھ بھی باقی نہیں ہے۔ صرف اسی ایک صدی کو لے لیجئے، اس میں مغربی استعماریوں نے اسلام کے خلاف ہر کمزور تنکے کا سہارا لیا ہے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔

ان سے بڑھ کر ان چودہ صدیوں میں اٹھنے والی فکری، فلسفی، علمی اور پھر ثقافتی تحریکیں اور موجیں ہیں۔ ثقافتی تحریکیں کسی شئے اور کسی ہستی کے خلاف مزاحمت نہیں کرتیں، لیکن وہ ہر رکاوٹ

۱۔ "...... مَثَلُهُمْ فِی التَّوْرٰةِ وَ مَثَلُهُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِهٖ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ." (سورہ فتح ۴۸۔ آیت ۲۹)

کو اپنے سامنے سے ہٹا دیتی ہیں اور اپنی راہ میں حائل ہونے والے ہر قدیم درخت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتی ہیں۔

اسلام نے اپنی چودہ سو سالہ تاریخ میں نہ صرف یہ کہ کسی ثقافتی تحریک سے ضرب نہیں کھائی' بلکہ خود عظیم ثقافتی تحریکوں کا موجد رہا ہے۔ اس نے تمدن اور ثقافت سے استفادہ کیا' اس کی رہنمائی کی اور اس کو زندگی اور ایمان عطا کیا اور اسے قوت و استحکام بخشا۔

آج جبکہ بیسویں صدی کا دوسرا نصف ہے اور نظریات اور عقائد کی جنگ کا دور ہے' آج بھی اسلام ان کا سخت رقیب سمجھا جاتا ہے۔ وہ خود ان سے استفادہ کرتا ہے یا پھر کامیابی کے ساتھ ان کا مقابلہ کرتا ہے۔ جاندار ہونے اور جاودانی ہونے کی اس سے بہتر اور کیا علامت ہو سکتی ہے؟!

اسلام نے ایک طرف تو عقل کے ساتھ مضبوط رشتہ استوار کیا ہوا ہے' عقل کو دین کے ایک بنیادی رکن کے طور پر قبول کیا ہوا ہے' بلکہ اس سے بڑھ کر اسے باطنی پیغمبر کہا ہے۔

دوسری طرف اس نے مُلک و ملکوت' دنیا و آخرت' جسم و روح' ظاہر و باطن' مادہ و معنی کو ایک ساتھ مدنظر رکھا ہے اور ہر طرف نظر رکھتے ہوئے ہر قسم کی افراط و تفریط سے اپنا دامن محفوظ رکھا ہے۔

اس سے بڑھ کر اپنے ''مکمل پروگرام'' کو اہل قیادت اور لائق نفاذ کرنے والوں کے ذریعے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔

اس لئے عجیب نہیں ہے کہ آج جب پورے چودہ سو سال بعد ہم اس مقدس دین کے شاندار کارنامے کا مطالعہ کرتے ہیں' تو اسے افتخارات سے لبریز پاتے ہیں۔

اس مفاد پرست اور جاہل گروہ کو چھوڑیئے' جو ایسے اسباب کی بنا پر جو کسی پر مخفی نہیں ہیں' گاہ بگاہ اسلام کے بارے میں ناگوار اظہار رائے کرتا ہے' عالمی ضمیر عدل الٰہی کا میزان ہے' حقیقت ہمیشہ کے لئے چھپی نہیں رہتی' تجربے نے یہ بات ثابت کی ہے کہ حقیقت دشمن کے ضمیر کو جھنجوڑتی ہے اور اسے انصاف کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

ان چودہ صدیوں میں عیسائی اسلام کے طاقتور ترین اور منظم ترین مخالف رہے ہیں۔ جب ہم اس طاقتور رقیب کے فیصلوں کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں' تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر دور میں سچائی

اور انصاف کی طرف مائل ہوئے ہیں۔ یہ بجائے خود ایک طرف عالمی ضمیر کی ایک نشانی اور دوسری طرف اسلام کی حقانیت کی علامت ہے۔

ایسی زندہ موج جس نے دنیا کی ثقافتوں کو اپنے اندر جذب کیا ہو، مفکرین، فلاسفہ اور دانشوروں کی زبردست عقلوں کو اپنے سامنے جھکنے اور دشمن کو منصفانہ فیصلے پر مجبور کیا ہو اور جو مسلسل رشد و نمو کی حالت میں ہو، یہاں تک کہ جس نے ستر کروڑ انسانوں سے (۱) اپنے آپ کو منوایا ہو، وہ صرف اور صرف ایسی ہی چیز ہو سکتی ہے، جس کا سرچشمہ "وحی" ہو، جو بشر کے لئے خدا کا پیغام ہو اور جسے انسان کی نجات کے لئے بھیجا گیا ہو۔ ایک ایسی موج جو ایک انسان کے ذہن سے اٹھی ہو وہ کسی صورت اس قدر خاصیت اور اثر کی حامل نہیں ہو سکتی۔

سچ، کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ ایک "اُمّی" انسان، ایک ایسا شخص جس نے کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہ کیا ہو، اور جو جاہلوں "اُمّیوں" کے درمیان، ایک ایسی سرزمین پر رہتا ہو جہاں جہالت، فساد، خودغرضی اور خودپرستی کے سوا کچھ نہ ہو، وہ اٹھے اور ایسی بابرکت اور مفید تحریک ایجاد کرے؟

جی ہاں: فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ. (۲)

صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْمُ.

☆☆☆

۱۔ اس وقت کے اعداد و شمار کے مطابق۔

۲۔ پھوک اور بیکار جھاگ تو ختم ہو جاتا ہے، لیکن جو چیز لوگوں کے لئے سودمند ہوتی ہے وہ زمین میں باقی رہتی ہے۔ (سورۂ رعد ۱۳۔ آیت ۱۷)

مقدمہ

اسلام کی نظر میں اولیائے الٰہی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لے کر ائمۂ اطہار علیہم السلام تک پیشوایانِ اسلام بالفاظ دیگر معصومینؑ کی سیرت شناخت کا ایک ذریعہ ہے۔ اپنے مقام پر ان کا کلام ان کی شخصیت یعنی ان کی سیرت اور روش شناخت کا ایک سرچشمہ ہے۔ سیرت النبیؐ اور اسی طرح سیرتِ ائمہؑ ہمارے لئے ایک منبعِ درس ہے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

"لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللهَ كَثِيْرًا" (۱)

یہ بات کہ سیرت النبیؐ سے کیا مراد ہے اور یہ کس صورت سے ہمارے لئے شناخت کا ایک منبع ہے اس بات کی وضاحت ہم بعد میں عرض کریں گے۔ یہاں ہم صرف ایک نکتہ عرض کر رہے ہیں:

۱۔ سورۂ احزاب ۳۳۔ آیت ۲۱ {تم میں سے اسکے لئے رسول کی زندگی میں بہترین نمونۂ عمل ہے جو شخص بھی اللہ اور آخرت سے امیدیں وابستہ کئے ہوئے ہے اور اللہ کو بہت کثرت سے یاد کرتا ہے۔}

ہم نے جو ظلم قرآن کریم کے ساتھ کیا ہے' وہی ظلم پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور ائمہ طاہرین علیہم السلام کی سیرت کے ساتھ بھی روا رکھا ہے۔ جب کہا جاتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ایسے تھے' تو ہم کہتے ہیں کہ وہ تو پیغمبر تھے' یا جب کہا جاتا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام ایسے تھے' تو ہم کہتے ہیں کہ وہ تو علیؑ تھے' تم علیؑ سے ہمارا موازنہ کرتے ہو؟! نبی اکرمؐ سے ہمارا تقابل کرتے ہو؟! امام جعفر صادقؑ سے ہمارا مقابلہ کرتے ہو؟! وہ حضرات تو ''ز آب و خاک دگر و شہر و دیار دگرند'' (وہ تو ایک دوسری آب و خاک' ایک دوسرے شہر و دیار سے تعلق رکھتے ہیں) اُن کا خمیر کسی اور جہاں سے ہے؟! اور چونکہ ان کا خمیر کسی اور جہاں سے متعلق ہے' اس لئے ہمارا ان سے کوئی ربط نہیں بن سکتا۔ ''کار پاکان را قیاس از خود مگیر'' نیک لوگوں کے عمل کا اپنی ذات سے قیاس نہ کرو۔

کبھی کبھی ایک قوم کے لئے ایک مصرع طاعون کی وبا سے سو گنا زیادہ نقصاندہ ہوتا ہے۔ دنیا کے ایسے گمراہ کن مصرعوں میں سے ایک یہ ہے کہ: ''کار پاکان را قیاس از خود مگیر'' البتہ شاعر کے نزدیک اس مصرع کے معنی کچھ اور ہیں اور ہمارے درمیان اسکے کچھ اور معنی رائج ہیں۔ ہم کہنا چاہتے ہیں کہ اپنے کاموں کا پاک لوگوں کے کاموں سے قیاس نہ کرو' اسے ہم ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں کہ: ''کار پاکان را قیاس از خود مگیر'' یہ مولانا روم کا شعر ہے' جو ایک داستان کے درمیان آیا ہے' اور وہ داستان کچھ اور کہہ رہی ہے اور جو ایک فرضی داستان۔ وہ کہتے ہیں کہ: ایک پرچون فروش کے پاس ایک طوطا تھا: ''بود بقالی مرا و را طوطی ای''۔ یہ طوطا بولتا تھا اور اس کے ساتھ باتیں کیا کرتا تھا۔ دکاندار اس سے کبھی کبھار ایک ملازم کا کام بھی لے لیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی کسی کے وہاں آنے پر وہ شور و غل کیا کرتا تھا' یا کوئی بات کہہ دیا کرتا تھا' یا بعد میں کچھ کہتا تھا۔ دکاندار اس سے خوش تھا۔

ایک دن بے چارہ یہ طوطا شاید ایک ڈبے سے دوسرے ڈبے کی طرف اُڑ رہا تھا' یا شاید ایک مرتبان سے دوسرے مرتبان کی طرف جا رہا تھا کہ روغنِ بادام کا ایک مرتبان الٹ گیا۔ مزید یہ کہ یہ تیل دوسری چیزوں پر بھی گرا اور کئی چیزیں ضائع ہو گئیں اور دکاندار کو ایک بڑا نقصان ہو گیا۔

باوجودیکہ دکاندار طوطے سے بہت محبت کرتا تھا' لیکن اس روز اس نے طوطے کو پیٹ ڈالا: تیرا ستیاناس تو نے یہ کیا کردیا! اس نے طوطے کی ایسی پٹائی کی کہ اس کے سر کے بال جھڑ گئے۔ اس کے بعد سے طوطے نے خاموشی اختیار کرلی اور ایک لفظ بھی نہیں بولا۔

دکاندار کو اپنی حرکت پر پشیمانی ہوئی: میں نے کتنا برا کیا' اپنے خوش خواں پیارے طوطے کے ساتھ میں ننے یہ کیا کردیا! اس نے سب کچھ کر دیکھا' اسے مزے دار کھانے دیئے' پیار کیا' لیکن طوطا اسکے سامنے بول کے نہ دیا۔ اسی طرح ایک مدت گزر گئی۔ ایک دن ایک گنجا آدمی کوئی چیز خریدنے دکان پر آیا۔ طوطے نے اسے دیکھا کہ اس کا سر گنجا ہے۔ جیسے ہی اسکے گنجے سر کو دیکھا' فوراً بول اٹھا اور کہا:

از چہ ای کل با کلان آمیختی
تو مگر از شیشہ روغن ریختی

کہنے لگا: کیا تم نے بھی روغنِ بادام گرایا تھا جو تمہارا سر بھی گنجا ہوگیا؟

طوطا دوبارہ بولنے لگا۔

مولانا یہاں ایک بات کہتے ہیں' اور اسکے بعد بزرگوں کو اپنی ہی طرح سمجھنے والے لوگوں پر اعتراض کرتے ہیں۔ یہاں طوطے نے اپنے آپ کو معیار بنالیا تھا اور پھر اس گنجے کا اپنے آپ سے موازنہ کیا تھا۔ یعنی گنجے کو اپنے جیسا سمجھ لیا تھا۔ مولانا کہتے ہیں کہ ایسا نہ کرو' بزرگوں کو اپنے جیسا نہ سمجھو۔

یہ بات اپنی جگہ درست ہے۔ یہ بہت بڑی غلطی ہے کہ ایک انسان جو اپنے آپ میں بعض جذبات موجود پاتا ہے (وہ دوسروں کو بھی ایسا ہی سمجھنے لگتا ہے)۔ مثلاً ایک شخص جو ایک نماز بھی حضورِ قلب کے ساتھ نہیں پڑھ سکتا' وہ کہتا ہے: ارے صاحب! دوسرے بھی ایسے ہی ہیں۔ کیا کوئی حضورِ قلب کے ساتھ نماز پڑھ سکتا ہے؟! یعنی وہ اپنے آپ کو دوسروں کا معیار بنالیتا ہے۔ یہ غلط ہے۔ ہمیں دوسروں کو اپنی طرح نہیں سمجھنا چاہئے۔ ''کار پاکان را قیاس از خود مگیر'' یعنی اپنے آپ کو نیک لوگوں کے لئے معیار قرار نہ دو۔ یہ بالکل صحیح بات ہے۔ لیکن ہم اکثر یہ شعر پڑھتے

ہیں اور کہتے ہیں: دوسروں کو اپنا معیار نہ بناؤ، یعنی یہ تم کیا سوچنے لگے ہو کہ میں نبی اکرمؐ جیسا بن جاؤں (یعنی نبی کی پیروی کروں)، علیؑ کی مانند اور ان کا پیرو بن جاؤں۔

اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ یہ شعر ہمارے درمیان گمراہ کن ہو گیا ہے۔ جیسا کہ ہم نے قرآن کو اٹھا کر بلند طاق پر رکھ دیا ہے، اسی طرح ہم نے سیرتِ انبیا، اولیا اور خاص طور پر سیرت النبیؐ اور سیرتِ معصومینؑ کو بھی اٹھا کر اونچے طاقوں کی زینت بنا دیا ہے۔ ہم کہنے لگے ہیں کہ: وہ تو نبی ہیں، جنابِ فاطمہؑ بھی جنابِ فاطمہؑ ہیں، امیر المومنینؑ تو امیر المومنینؑ ہیں، امام حسینؑ تو امام حسینؑ ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اگر طویل عرصے تک بھی ہمارے سامنے تاریخِ پیغمبرؐ بیان کی جائے، تب بھی ہمارے لئے سبق آموز نہیں ہوگی، اور بالکل ایسا ہی ہوگا جیسے یہ کہا جائے کہ: فرشتوں نے عالمِ بالا میں یہ کام کیا ہے۔ ٹھیک ہے، فرشتوں نے کیا ہے، ہمارا اس سے کیا تعلق! اگر ایک مدت تک ہمارے سامنے حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں بات کی جاتی رہے، تب بھی ہمارے کانوں پر جوں تک نہ رینگے گی۔ ہم یہی کہیں گے کہ علیؑ تو ہمارے لئے معیار نہیں بن سکتے۔ ایک عرصے تک ہمارے سامنے حضرت امام حسین علیہ السلام کی باتیں کرتے رہیں، لیکن ہم پر کوئی اثر نہیں ہوگا، اور ہم امام حسینؑ کی راہ پر ایک قدم بھی نہیں بڑھائیں گے۔ کیونکہ "کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر"، یعنی شناخت کا یہ سرچشمہ بھی ہم سے چھین لیا گیا ہے۔ حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ ہمارے لئے پیغمبر کی بجائے کوئی فرشتہ بھیج دیتا۔

پیغمبرؐ یعنی انسانِ کامل، علیؑ یعنی انسانِ کامل، حسینؑ یعنی انسانِ کامل، زہراؑ یعنی انسانِ کامل۔ یعنی ان میں بشری امتیازات فرشتوں سے بھی بالاتر کمال کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ یعنی انہیں ایک بشر کی طرح بھوک لگتی ہے تو کھانا کھاتے ہیں، پیاسے ہوتے ہیں تو پانی پیتے ہیں، انہیں نیند کی ضرورت ہوتی ہے، وہ اپنے بچوں سے محبت کرتے ہیں، ان میں جنسی جبلت بھی پائی جاتی ہے، جذبات بھی رکھتے ہیں۔ اس لئے قابلِ اقتدا بن سکتے ہیں۔ اگر ایسے نہ ہوتے، تو یہ لوگ امام اور پیشوا نہ ہوتے۔

اگر نعوذ باللہ امام حسین علیہ السلام میں ایک انسان کے جذبات نہ ہوتے، یعنی جس طرح

ایک انسان کو اپنے بچے کی تکلیف دیکھ کر تکلیف ہوتی ہے' اس طرح امامؑ اپنے بیٹے کو پہنچنے والی تکلیف سے رنجیدہ نہ ہوتے اور اگر ان کے بچوں کو ان کی آنکھوں کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جاتا' تب بھی ان کا دل نہ پسیجتا اور بالکل ایسے ہوتے جیسے ان کے سامنے ایک لکڑی کو ٹکڑے ٹکڑے کیا جا رہا ہو' تو یہ کوئی کمال نہ ہوتا۔ میں بھی اگر ایسا ہوتا تو یہی کرتا۔

اتفاقاً ان کے انسانی جذبات اور بشری پہلو ہم سے زیادہ قوی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ وہ انسانی کمالات کے پہلوؤں سے فرشتوں اور جبرئیلِ امیں سے بالاتر ہیں۔ اسی لئے امام حسینؑ امام ہو سکتے ہیں' کیونکہ وہ تمام انسانی امتیازات کے مالک ہیں۔ ان سے بھی جب ان کا جوان بیٹا اجازت لینے آتا ہے تو ان کا دل کٹ کے رہ جاتا ہے۔ ان میں ہم اور آپ سے سوگنا زیادہ شفقتِ پدری پائی جاتی ہے {اور جذبات و احساسات کا تعلق انسانی کمالات میں سے ہے} لیکن خوشنودیٔ حق کے لئے وہ ان سب جذبات و احساسات کو کچل ڈالتے ہیں۔

فَاسْتَاْذَنَ اَبَاهُ فَاَذِنَ لَهُ. آئے اور کہا: بابا جان! مجھے اجازت دیجئے؟ فرمایا: جاؤ بیٹا۔ یہاں مورخین نے کئی اہم عمدہ نکات بیان کئے ہیں۔ لکھا ہے: فَنَظَرَ اِلَيْهِ نَظَرَ آئِسٍ مِنْهُ وَ اَرْخىٰ عَيْنَيْهِ. ایک نگاہ ڈالی' اُس شخص کی سی نگاہ جو کسی کی زندگی سے مایوس ہو کر اس کو دیکھتا ہے۔ نفسیاتی اعتبار سے اور روحانی حالات کے انسانی جسم پر اثرات کے حوالے سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ جب انسان کو کوئی خوشخبری دی جاتی ہے' تو وہ بے اختیار کھل اٹھتا ہے اور اس کی آنکھیں پھٹ جاتی ہیں۔ اور اگر انسان اپنے کسی عزیز کے سرہانے بیٹھا ہوتا ہے اور اسے یقین ہوتا ہے کہ وہ مر جائے گا' تو وہ اس کو نیم باز آنکھوں سے دیکھتا ہے' یعنی اس کی آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں' گویا ان میں اچھی طرح دیکھنے کی طاقت نہ رہی ہو۔ برخلاف اس وقت کے کہ جب اس کے بیٹے نے کوئی کارنامہ انجام دیا ہو' یا اس کی شادی کی رات ہو' تو اُسے چمکتی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہم نے حسینؑ کو اس حال میں دیکھا کہ ان کی آنکھیں نیم باز تھیں اور وہ اپنے جوان بیٹے کو دیکھ رہے تھے: فَنَظَرَ اِلَيْهِ نَظَرَ آئِسٍ مِنْهُ. گویا علی اکبرؑ کی کشش نے حسینؑ کو چند قدم اپنے پیچھے آنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ چلے تو دیکھا کہ حسینؑ بھی ان کے پیچھے چند قدم چلے اور بولے:

در رفتن جان از بدن گویند ہر نوعی سخن
من خود بہ چشمِ خویشتن دیدم کہ جانم می رود

چلتے رہے اور آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ ایک مرتبہ مردانگی کے ساتھ صدا بلند کی اور عمر سعد کو مخاطب کر کے فرمایا: اے ابن سعد! خدا تیری نسل کو منقطع کر دے جیسے تو نے میری نسل کو منقطع کیا ہے۔ قَطَعَ اللّٰہُ رَحِمَکَ کَمَا قَطَعْتَ رَحِمِیْ۔

☆☆☆

پہلی نشست

سیرت کے معنی اور اس کی اقسام

سیرت کے معنیٰ اور اس کی اقسام

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ رب العالمین باری الخلائق اجمعین. و الصلوٰۃ و السلام علیٰ عبد اللّٰہ ورسولہ و حبیبہ و صفیّہ و حافظ سرّہ و مبلّغ رسالاتہ سیّدنا و نبیّنا و مولانا ابی القاسم محمد و آلہ الطّیّبین الطّاھرین المعصومین. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرّجیم:

"لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللهَ كَثِيْرًا"(۱)

شناخت کا ایک سرچشمہ جس کے ذریعے ایک مسلمان کو اپنی فکر اور نظریے کی اصلاح اور تکمیل کرنی چاہئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ ہے۔

ایک چھوٹا سا مقدمہ بیان کرتے چلیں اور وہ یہ کہ ہم مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں

۱۔ سورۂ احزاب ۳۳۔ آیت ۲۱ {تم میں اس کے لئے رسول اللہ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے جو بھی اللہ اور آخرت سے امیدوار ہے اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتا ہے۔}

ہے ایک نعمت اور دوسرے ادیان کے پیروکاروں کے مقابل ہم مسلمانوں کے لئے ایک افتخار یہ ہے کہ ایک طرف تو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بہت سارا کلام' جسکے بارے میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ آنحضرتؐ ہی کا کلام ہے' یعنی متواتر اور مسلّم ہے' آج ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے' جبکہ کوئی اور دین اس بات کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ یعنی یقینی طور پر یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں جملہ' وہ جملہ ہے جو مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام' یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام' یا کسی اور پیغمبر کی زبان سے سنا گیا ہے۔ بہت سارے جملے موجود ہیں لیکن وہ اتنے یقینی اور قطعی نہیں ہیں' جبکہ ہمارے پاس اپنے نبیؐ کے بکثرت متواتر جملے موجود ہیں۔

دوسری طرف ہمارے پیغمبر کی تاریخ انتہائی واضح اور مستند تاریخ ہے۔ اس اعتبار سے بھی دنیا کے دوسرے رہنماؤں کا ہمارے رہنماؤں کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں۔ حتیٰ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کی باریک اور جزئی باتیں بھی قطعی اور مسلّم صورت میں آج ہماری دسترس میں ہیں' جبکہ کسی اور کے بارے میں ایسا نہیں ہے۔ سال' مہینے' حتیٰ کہ ولادت کا دن اور انتہا یہ ہے کہ ولادت کا ساتواں دن' شیر خوارگی کا دور' وہ دور جو آپ نے صحرا میں گزارا' بلوغت سے پہلے کا زمانہ' عربستان سے باہر آپ کے کیے جانے والے سفر' نبوت سے پہلے مجموعی طور پر جو پیشے آپ نے اپنائے تھے' آپ کی شادی کس عمر میں ہوئی' کتنے بچوں کی ولادت ہوئی اور ان میں سے کتنے آپ سے پہلے ہی اس دنیا سے چلے گئے' کس عمر میں ان بچوں کی وفات ہوئی اور اسی قسم کی دوسری باتیں۔ یہاں تک کہ آپ کی رسالت اور بعثت کے دور کے بارے میں معلومات زیادہ باریکیوں کے ساتھ موجود ہیں' کیونکہ یہ ایک عظیم واقعہ تھا۔ سب سے پہلے کون اُن پر ایمان لایا؟ (ایمان لانے والا) دوسرا اور تیسرا فرد کون تھا؟ فلاں شخص کس سال ایمان لایا؟ اُن کے اور دوسرے لوگوں کے درمیان کیا باتیں ہوئیں؟ انہوں نے کیا کیا کام کیے؟ آپ کا طریقہ کار کیا تھا؟

جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جن کا زمانہ بڑے صاحبانِ شریعت انبیا میں ہم سے سب سے زیادہ نزدیک کا زمانہ ہے' اگر قرآن نے ان کی تائید نہ کی ہوتی' جس کی وجہ سے مسلمانانِ عالم حکم قرآن کی رو سے انہیں ایک سچا اور خدا کا نبی مانتے ہیں' تو دنیا میں انہیں ثابت کرنا اور ان کی تائید

کرنا ناممکن ہو جاتا۔ خود عیسائی بھی تاریخی حوالے سے اس عیسوی تاریخ پر قطعاً اعتقاد نہیں رکھتے جس کی بنیاد پر مثلاً وہ یہ کہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کی تاریخ ولادت کو آج ۱۹۷۵ سال گزر چکے ہیں۔ یہ کوئی حقیقی بات نہیں ہے' بلکہ ایک ایسی بات ہے جسے طے کر لیا گیا ہے۔ اگر ہم کہتے ہیں کہ ہمارے نبیؐ کی ہجرت کو ۱۳۹۵ قمری سال اور ۱۳۵۴ شمسی سال گزر چکے ہیں' (۱) تو اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن یہ بات کہ حضرت عیسیٰ مسیح کی ولادت کو ۱۹۷۵ سال گزر چکے ہیں' یہ ایک ایسی بات ہے جسے مان لیا گیا ہے' تاریخ سے اس کی ہرگز تائید نہیں ہوتی۔ ممکن ہے ان کی ولادت اس تاریخ سے دو تین سو سال قبل ہوئی ہو' یا دو تین سو سال بعد ہوئی ہو۔ اور بعض جغرافیائی مسیحی (وہ مسیحی نہیں جو حضرت عیسیٰ مسیح پر ایمان بھی رکھتے ہیں) تو یہ تک کہتے ہیں کہ کیا مسیح نامی کوئی شخص دنیا میں آیا بھی تھا' یا مسیح ایک افسانوی اور جعلی شخصیت ہے؟ وہ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وجود کے بارے میں بھی شک کرتے ہیں۔ البتہ ہمارے اعتبار سے یہ ایک بکواس ہے۔ قرآنِ کریم نے (حضرت عیسیٰؑ کے وجود کی) تائید کی ہے' اور ہم کیونکہ قرآن پر اعتقاد رکھتے ہیں' لہٰذا اس بارے میں ہمیں کوئی شک نہیں ہے۔ (اسی طرح یہ کہ) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری کون لوگ تھے؟ انجیل کس سن میں اور حضرت عیسیٰؑ کے کتنے سال بعد کتابی شکل میں سامنے آئی؟ کتنی انجیلیں تھیں؟ یہ سب باتیں مشکوک ہیں۔ لیکن ہم مسلمانوں کے لئے' یہ سرچشمہ' خواہ وہ گفتارِ نبی کا سرچشمہ ہو خواہ کردارِ نبی کا سرچشمہ' وہ انتہائی یقینی اور بڑی حد تک قطعی (صرف قابلِ اعتماد ظنی نہیں) صورت میں موجود ہے۔ یہ وہ بات تھی جو ہم اس گفتگو کے مقدمے کے طور پر بیان کرنا چاہتے تھے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجودِ مقدس کی جس چیز سے ہم استفادے کے ذمے دار قرار دیئے گئے ہیں' وہ ان کی گفتار میں بھی ہے اور ان کی رفتار میں بھی' ان کے قول میں بھی ہے اور ان کے فعل میں بھی۔ یعنی نبی اکرم کا کلام بھی ہمارے لئے رہنما اور سند ہے اور ہمیں اس سے استفادہ کرنا چاہئے' اور آپ کا فعل اور رفتار و کردار بھی۔

۱۔ (اس سال سے جس سال شہید مطہریؒ نے یہ تقریر کی۔)

یہاں اس بات کی کچھ وضاحت کرنا ضروری ہے۔ پہلے کلام اور گفتار کے بارے میں گفتگو کرلیں تاکہ اسکے بعد رفتار و کردار کے بارے میں بھی وضاحت کرسکیں۔

کلامِ پیغمبر کی گہرائی

بزرگوں کے کلام کی اہم بات یہ ہوتی ہے کہ ان کلمات میں بہت سے ایسے باریک نکات پوشیدہ ہوتے ہیں جنہیں لوگ درک کرسکتے ہیں۔ خاص طور پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے کلام کے بارے میں خود ارشاد فرمایا ہے (اور عمل نے بھی نشاندہی کی ہے):

"اُعْطِیْتُ جَوَامِعَ الْکَلِمِ." (۱)

"خدا نے مجھے جامع کلمات عطا کیے ہیں۔"

یعنی خدا نے مجھے یہ صلاحیت عطا کی ہے کہ میں ایک مختصر جملے میں مفاہیم کی ایک دنیا بیان کرسکتا ہوں۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کلام کو ہر شخص سنتا ہے، لیکن کیا سننے والا ہر فرد کما حقہ آپ کے کلام کی گہرائی تک پہنچ سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! شاید سو میں سے ننانوے بھی نہیں پہنچتے۔ دیکھتے ہیں خود نبیؐ اکرم کس طرح اس بات کی پیش بینی کرتے ہیں۔ حضورؐ کا ایک جملہ ہے جس کا مفہوم یہ ہے: "جو کلمات تم مجھ سے سنتے ہو انہیں محفوظ کرو ان کی حفاظت کرو اور آئندہ آنے والی نسلوں کے حوالے کرو۔ ممکن ہے مستقبل قریب اور بعید میں آنے والی نسلیں میری باتوں کو میرے سامنے موجود تم لوگوں سے زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکیں۔"

اس مشہور حدیث میں، جو ہماری معتبر کتابوں میں ہے اور اُن احادیث میں سے ہے جنہیں شیعہ اور سنی دونوں نے روایت کیا ہے اور کافی، تحف العقول اور دوسری کتابوں میں موجود ہے، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

۱۔ امالی شیخ طوسی۔ ج ۲۔ ص ۹۸ اور ۹۹

''نَصَرَ اللّٰهُ عَبْداً سَمِعَ مَقَالَتِیْ فَوَعَاهَا وَ بَلَّغَهَا مَنْ لَمْ يَسْمَعْهَا.''

''خدا سرخ رو کرے اس بندے کو جو میری بات سنے' اسے یاد رکھے اور ان لوگوں تک پہنچائے جنہوں نے اسے مجھ سے نہیں سنا۔''

اسکے بعد اس جملے کا اضافہ فرمایا:

''فَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ غَيْرِ فَقِيْهٍ وَ رُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ اِلٰى مَنْ هُوَ اَفْقَهُ مِنْهُ.''(۱)

اس جملے میں کئی نکات موجود ہیں۔ یعنی مستقبل کی طرف اشارہ ہے۔ ''فقہ'' یعنی گہری سمجھ۔ لیکن یہاں مراد ایسا جملہ ہے جس میں گہرائی پائی جاتی ہو۔ ''فقہ'' اور ''فہم'' کے درمیان فرق یہ ہے کہ ''فہم'' صرف سمجھنے کو کہتے ہیں' جبکہ ''فقہ'' گہرائی کے ساتھ سمجھنے کو کہا جاتا ہے۔ جب فقہ کا اطلاق کلام پر ہوتا ہے' تو اس سے مراد ایسا کلام ہے جو زیادہ گہرائی کا حامل ہو۔

آنحضرتؐ نے فرمایا ہے: بعض اوقات کچھ لوگوں کے پاس ایک گہرا کلام ہوتا ہے لیکن وہ خود گہرے نہیں ہوتے۔ وہ ہمیشہ ایک جملہ نقل کرتے ہیں' لیکن خود اس کی گہرائی تک نہیں پہنچ پاتے۔ پھر فرمایا: بسا اوقات کچھ لوگوں کے پاس کوئی جملہ کوئی ''فقہ'' ہوتی ہے۔ یعنی انہیں مجھ سے سنا ہوا کوئی جملہ یاد ہوتا ہے' وہ فقیہ بھی ہوتے ہیں' لیکن اس جملے کو ایک ایسے شخص کے سامنے نقل کرتے ہیں جو خود ان سے زیادہ فقیہ ہوتا ہے۔ یعنی ایک ایسے شخص کے سامنے نقل کرتے ہیں جو خود ان سے زیادہ عمیق ہوتا ہے اور اس کی فکر کی گہرائی ان سے زیادہ ہوتی ہے۔

جس شخص کے لئے نقل کیا جاتا ہے وہ ان چیزوں کو سمجھ جاتا ہے جنہیں وہ نقل کرنے والا شخص نہیں سمجھ پاتا۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ جوں جوں صدیاں بیت رہی ہیں' ہر شعبے میں پیغمبر اکرمؐ کے کلام کی زیادہ سے زیادہ گہرائیاں (ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ پیدا ہو رہی ہیں) منکشف ہو رہی ہیں۔ (البتہ آپ جانتے ہیں کہ نبی اکرمؐ کے اوصیا' ائمۂ اطہارؑ کا معاملہ مختلف ہے۔ ان کے کلمات

۱۔ سفینۃ البحار۔ ج ۱۔ ص ۳۹۲

پیغمبرؐ کے کلمات کی مانند ہیں۔ ہم عام لوگوں کی بات کر رہے ہیں) پہلی اور دوسری صدی کے لوگ تیسری صدی کے لوگوں کی طرح پیغمبر اکرمؐ کے کلمات کی گہرائی تک کسی صورت نہیں پہنچ سکتے تھے اور نہ تیسری صدی کے لوگ چوتھی صدی کے لوگوں کی طرح اور نہ چوتھی صدی کے لوگ پانچویں صدی کے لوگوں کی طرح۔

اسلامی علوم کی تاریخ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے۔ اگر آپ اخلاق کا مطالعہ کریں' فقہ کا مطالعہ کریں' معارف اور فلسفے کا مطالعہ کریں' عرفان کو دیکھیں' تو آپ دیکھیں گے کہ جس موضوع پر بھی نبی اکرمؐ نے کلام فرمایا ہے' بعد کے ادوار میں آنے والے مفسرین واقعاً اس کلام کی گہرائی کو بہتر طور پر سمجھ سکے ہیں۔ یہی پیغمبرؐ کا معجزہ ہے۔

اگر ہم صرف اپنی فقہ کو سامنے رکھیں' اور فقہی مسائل میں (کلمات) پیغمبرؐ کو سمجھنے کے اعتبار سے' مثلاً ایک ہزار سال پہلے کے ایک نابغۂ روزگار شخص جیسے شیخ صدوق' شیخ مفید اور حتیٰ شیخ طوسی کو پیشِ نظر رکھیں' اور پھر نو سو سال بعد کے شیخ مرتضیٰ انصاری کو نظر میں رکھیں' تو ہم دیکھیں گے کہ شیخ مرتضیٰ انصاری نو سو سال بعد شیخ طوسی' شیخ مفید اور شیخ صدوق کی نسبت بہتر طور پر کلام نبوی کا تجزیہ وتحلیل کر سکتے ہیں۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ شیخ مرتضیٰ' شیخ طوسی سے زیادہ ذہین ہیں؟ نہیں' ان کے زمانے کا علم شیخ طوسی کے زمانے سے زیادہ وسیع ہو چکا ہے' علم نے ترقی کی ہے' اس لئے وہ ہزار سال پہلے آنے والے لوگوں کی نسبت بہتر طور پر کلامِ نبوی کی گہرائی تک پہنچ سکتے ہیں۔ آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔ سو سال بعد' دو سو سال بعد ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو نبی اکرمؐ کے کلام کو شیخ انصاری سے کہیں زیادہ گہرائی کے ساتھ سمجھیں گے۔

یہ کلماتِ نبویؐ کے بارے میں بات تھی۔

پیغمبرؐ کے کردار کی گہرائی

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کردار کی تفسیر اور توجیہ میں بھی بالکل یہی بات ہے۔ جس طرح کلامِ رسولؐ با معنی ہوتا ہے اور ایک معنی کے لئے ادا ہوتا ہے' اسی طرح آنحضورؐ کے تمام

اعمال بھی با معنی اور تفسیر کے حامل ہوتے ہیں اور ان میں غور وفکر کرنا چاہیئے:

"لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ لِمَنْ کَانَ یَرْجُوا اللّٰہَ وَ الْیَوْمَ الْاٰخِرَ."

بالخصوص قرآنِ کریم کی اس تعبیر کی رو سے کہ تمہارے لئے پیغمبرؐ کے وجود میں اسوہ اور تاسی ہے' اور پیغمبر کا وجود ایک ایسا منبع اور مرکز ہے جس سے تمہیں (زندگی کی راہ وروش) حاصل کرنی چاہیئے' کسی ایک فرد کا آ کر پیغمبرؐ کے صرف کلمات نقل کر دینا (کافی نہیں ہے)۔ بہت سے راوی ایسے ہیں جو کچھ بھی نہیں سمجھتے۔ یہ بات کافی نہیں ہے کہ ہم آئیں اور پیغمبر اکرم کی تاریخ نقل کریں اور کہیں کہ آپ نے فلاں مقام پر ایسا کیا۔ اہم بات پیغمبرؐ کے عمل کی وضاحت اور اسکی تشریح ہے۔ فلاں مقام پر نبی اکرمؐ نے اس قسم کا طرزِ عمل اختیار کیا' یہ طرزِ عمل کیوں اختیار کیا؟ آپ کا مقصد کیا تھا؟ پس جس طرح گفتارِ رسولؐ میں غور وفکر اور اسکی تفسیر وتشریح کی ضرورت ہے' اسی طرح رفتارِ نبیؐ میں بھی غور وفکر اور اسکی توضیح وتفسیر کی ضرورت ہے۔

ہم اپنے بارے میں افسوس کے اس اظہار سے گریز نہیں کر سکتے کہ ہم جو پیغمبر آخر الزماںؐ کی امت ہیں' اگر ہم میں سے کسی سے پوچھا جائے تو نہ تو ہم پیغمبرؐ کے چند کلمات سے واقف ہیں (حتیٰ ان کے الفاظ تک سے نابلد ہیں چہ جائیکہ ان کے معنی اور تفسیر سے) اور نہ ہم آنحضرتؐ کی سیرت اور آپؐ کے کردار کے حوالے سے چند جملے کہہ سکتے ہیں۔ اس بات کو ہم نے بعض دوسرے مقامات پر بھی کہا ہے۔ ایران کے مشہور لکھنے والوں میں سے ایک شخص جس نے دو تین سال پہلے وفات پائی ہے' البتہ وہ مذہبی شخص نہیں تھا (ابتدائے عمر میں تو بالکل ہی مذہبی نہیں تھا' لیکن عمر کے آخری حصے میں ہماری شائع شدہ کتابوں کے توسط سے اس کا ہم سے رابطہ ہوا اور وہ کچھ کچھ (مذہب کی طرف) مائل ہو گیا تھا) اُس نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا: میں حکمتِ ادیان کے موضوع پر ایک کتاب کا ترجمہ کر رہا ہوں' یعنی وہ حکیمانہ باتیں جو دنیا کے مختلف ادیان میں موجود ہیں۔ وہ حکیمانہ باتیں جو آج دینِ یہود میں موجود ہیں' وہ حکیمانہ باتیں جو انجیل میں موجود ہیں' وہ حکیمانہ باتیں جو زردشت سے منسوب ہیں' وہ حکیمانہ باتیں جو گوتم بدھ سے منسوب ہیں' وہ حکیمانہ

باتیں جو کنفیوشس کی ہیں، وہ حکیمانہ باتیں جو ہمارے پیغمبر کی ہیں۔ کہنے لگا: مجھے صرف سید ہونے کے ناطے برا لگا ہے، کیونکہ اس {کتاب کے مصنف} نے ہر ایک کے بہت سے کلمات نقل کئے ہیں، لیکن جب پیغمبر اسلامؐ پر پہنچا تو صرف چند مختصر جملے نقل کئے ہیں۔ کیونکہ میرا ترجمہ آزاد ترجمہ ہے، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ پیغمبرؐ کے کچھ اور کلمات نقل کروں۔ لیکن {یہ کلمات} میری دسترس میں نہیں ہیں۔ کہنے لگا: میں نے ارادہ کیا ہے کہ سو آیات قرآنِ کریم کی، سو جملے کلماتِ نبیؐ کے اور سو جملے کلماتِ امیر المومنینؑ کے نقل کروں گا۔ قرآنِ کریم کے بارے میں کہنے لگا کہ کیونکہ ترجمہ شدہ قرآن موجود ہے (آقائے قمشہ ای کا ترجمۂ قرآن) اس لئے میں خود ہی اس سے چند آیات کا انتخاب کر سکتا ہوں۔ کلماتِ امیر المومنینؑ کے لئے بھی کیونکہ نہج البلاغہ کے متعدد ترجمے موجود ہیں، لہٰذا میں اُن سے انتخاب کر سکتا ہوں، رہی بات کلامِ نبویؐ کی، تو کیونکہ میں کچھ زیادہ عربی نہیں جانتا اور فارسی میں بھی تلاشِ بسیار کے باوجود مجھے کچھ نہیں ملا ہے، اس لئے اگر ہو سکے تو آپ نبی اکرمؐ کے سو جملے ڈھونڈ کر اُن کا ترجمہ بھی کر دیجئے، جنہیں بعد میں، میں اپنے ذوق کے مطابق اپنے قلم سے تحریر کرلوں گا۔ میں نے کہا ٹھیک ہے، اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سو جملے جمع کر کے اُس کے حوالے کر دیئے، ترجمہ بھی کر دیا کہ کہیں وہ معنی میں غلطی نہ کر بیٹھے، بعد میں اُس نے ''حکمتِ ادیان'' نامی کتاب میں انہیں شائع کر دیا۔(۱)۔ البتہ اس نے وہاں تذکرہ نہیں کیا ہے کہ نبی اکرمؐ کے یہ سو جملے اُس نے کہاں سے لئے ہیں۔ میں بھی نہیں چاہتا تھا، کیونکہ میرا مقصد تھا کہ یہ کام ہو جائے۔

بہر حال وہ ایک مرتبہ میرے پاس آیا اور کہا: جناب! ہمارے نبیؐ کے ایسے جملے ہیں؟! میں تو نہیں جانتا تھا۔ حالانکہ وہ خود ایران کا ایک معروف قلمکار تھا اور ایک ایسا شخص تھا جسے بیرونی دنیا میں بھی اہمیت دی جاتی ہے اور جب ایران کے صفِ اوّل کے قلمکاروں کو شمار کرتے ہیں، تو اُن میں اسے بھی شمار کرتے ہیں۔ ایک ایسا شخص جو بقولِ خود سید ہے اور (پوری) زندگی اس کا واسطہ

۱۔ (یہ جملے کتاب کے آخر میں سو کلمات پیغمبرؐ کے عنوان سے شامل کر دیئے گئے ہیں۔)

کتابوں ہی سے رہا ہے' اسے معلوم نہیں تھا کہ ہمارے نبی کا کلام ایسا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ: ہمارے نبیؐ کے ایسے کلمات ہیں' اور مجھے نہیں معلوم تھے؟! میں نے کہا: ہاں! جب کتاب شائع ہوگئی تو اسکے بعد بولا: جناب! اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام کا کلام دوسرے تمام پیغمبروںؑ کے کلام سے بڑھ کر ہے۔ انتہائی گہرا اور بامعنی ہے۔

ہم مسلمان اس قدر کوتاہی کے مرتکب کیوں ہوئے ہیں کہ ہمارا ایک قلمکار (جو خود بھی قصوروار ہے) یہ تک نہیں جانتا کہ نبی اکرم کا کوئی حکمت آمیز کلام ہے بھی یا نہیں' حالانکہ میں نے ان کلمات کا انتخاب نہیں کیا تھا' بلکہ ان میں سے کچھ میرے ذہن میں تھے' کچھ کو اثنی عشریہ سے لیا تھا اور کچھ کو تحف العقول سے نقل کر کے اسکے حوالے کیا تھا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت و کردار کے بارے میں شاید ہم اس سے بھی زیادہ کوتاہی کے مرتکب ہوئے ہوں گے۔ چند سال پہلے میں نے سوچا کہ اس خاص روش پر جس کے متعلق میں بعد میں عرض کروں گا سیرتِ پیغمبرؐ کے موضوع پر ایک کتاب لکھوں۔ میں نے متعدد یادداشتیں (notes) تیار کیں' لیکن میں جتنا آگے بڑھا' یہ دیکھا کہ گویا ایک ایسے سمندر میں اتر رہا ہوں جو بتدریج گہرا ہی ہوتا چلا جا رہا ہے۔ البتہ میں نے اس کام کو ترک نہیں کیا ہے' البتہ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں سیرتِ رسول لکھ سکتا ہوں لیکن مَا لَا یُدْرَکُ کُلُّهُ لَا یُتْرَکُ کُلُّهُ. (جس چیز کو پورے طور پر حاصل نہ کیا جا سکے اسے پورے طور پر چھوڑنا بھی نہیں چاہئے) میں نے یہ عزم کیا ہوا ہے کہ خدا کی مدد اور نصرت سے ایک دن اس موضوع پر کچھ ضرور لکھوں گا' تاکہ بعد میں آنے والے دوسرے لوگ اس سے بہتر لکھیں۔ لیکن جب انسان غور و فکر کرتا ہے' تو دیکھتا ہے کہ کس قدر گہرائی ہے۔ جس طرح ہمارے نبی کا کلام عمیق ہے' اسی طرح ہمارے نبی کا کردار بھی عمیق ہے اور نبی کریمؐ کے انتہائی معمولی عمل سے بھی قوانین اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ انسان کے لئے دور ترین مسافتوں کی نشاندہی کے لئے نبی کا ایک چھوٹا سا عمل بھی ایک چراغ ہے' ایک قندیل ہے' ایک مشعل ہے۔

سیرت کے معنی

سب سے پہلے ہم لفظ ''سیرت'' کے معنی بیان کریں گے' کیونکہ جب تک اس لفظ کے معنی بیان نہ کردیں' اس وقت تک ہم سیرتِ رسولؐ کی توضیح نہیں کر سکتے۔ ''سیرۃ'' عربی زبان میں ''سَیر'' سے لیا گیا ہے۔(۱) ''سَیر'' یعنی حرکت کرنا' جانا' چلنا۔ ''سیرۃ'' یعنی چلنے کا انداز۔ ''سیرۃ'' فِعلَۃ کے وزن پر ہے اور عربی زبان میں فِعلَۃ نوعیت پر دلالت کرتا ہے۔ مثلاً جَلسَہ' یعنی بیٹھنا اور جِلسَہ یعنی بیٹھنے کا انداز۔ اور یہ ایک گہرا نکتہ ہے۔ سیر یعنی جانا' چلنا لیکن سیرہ' یعنی چلنے کا انداز اور طریقہ۔

اہم چیز نبی اکرمؐ کا اندازِ عمل ہے۔ جن لوگوں نے سیرت لکھی ہے' انہوں نے پیغمبرؐ کے عمل کو تحریر کیا ہے۔ سیرت کے عنوان سے جو کتابیں ہمارے پاس موجود ہیں' یہ سیر ہیں نہ کہ سیرت۔ مثلاً سیرۂ حلبیہ' سیر ہے' سیرت نہیں۔ اس کا نام تو سیرت ہے لیکن اس کی حقیقت سیر ہے۔ اس میں پیغمبرؐ کے عمل کو لکھا گیا ہے' آپ کے اندازِ عمل کو نہیں' پیغمبرؐ کے اسلوب کو نہیں۔

اسلوب شناسی

اسلوب (style) اور طرز و انداز کا مسئلہ بہت اہم ہے۔ مثلاً شعر کے باب میں ''رودکی'' کو بھی شاعر کہتے ہیں' سنائی کو بھی شاعر کہتے ہیں' مولانا روم کو بھی شاعر کہتے ہیں' فردوسی کو بھی شاعر کہتے ہیں' صائب کو بھی شاعر کہتے ہیں' حافظ کو بھی شاعر کہتے ہیں۔

ایک ایسا انسان جو شعر کے اسلوب سے واقف نہ ہو اس کے لئے' ہر چیز شعر ہے۔ وہ کہتا

۱۔ سیرت کا لفظ مسلمانوں نے شاید پہلی یا دوسری صدی ہجری میں استعمال کیا ہے۔ گو کہ ہمارے مورخین نے عملی طور پر اپنی ذمے داری اچھی طرح سے ادا نہیں کی' لیکن لفظ بہت اعلیٰ منتخب کیا ہے۔ شاید قدیم ترین سیرت ابن اسحاق نے لکھی تھی جسے بعد میں ابن ہشام نے ایک کتاب کی شکل دی۔ کہتے ہیں کہ ابن اسحاق شیعہ تھا اور اس کا تعلق تقریباً دوسری صدی ہجری کے دوسرے نصف سے ہے۔

ہے: شعر تو شعر ہوتا ہے اور بس' شعروں میں کوئی فرق نہیں ہوا کرتا۔ لیکن ایک شعر شناس آدمی سمجھتا ہے کہ شعر کے مختلف اسلوب ہوتے ہیں۔ ہمارے پاس ہندوستانی انداز کے شعر بھی ہیں' خراسانی انداز کے بھی' مثلاً عرفانی اسلوب وانداز کے شعر بھی ہوتے ہیں اور اسی طرح دوسرے انداز واسالیب کے شعر بھی۔ شعر شناسی میں جس چیز کو اہمیت حاصل ہے وہ اسکے اسلوب سے شناسائی ہے۔ ملک الشعراء بہار نے اسلوب شناسی پر ایک کتاب لکھی ہے۔ حتیٰ نثر میں بھی اسلوب شناسی ہوتی ہے۔ یہ صرف شعر کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اسلوب شناسی' شعر شناسی اور نثر شناسی سے مختلف چیز ہے۔ نثر کو انسان اس وقت پہچان سکتا ہے جب وہ مختلف نثروں کے اسلوب کو سمجھتا ہو اور شعر کو اس وقت سمجھ سکتا ہے جب وہ شعر میں موجود مختلف اسالیب سے واقف ہو۔

چلتے ہیں ہنر (art) کی طرف۔ ایک ایسا انسان جو آرٹ کے بارے میں نہیں جانتا' اس کے لئے عمارت' عمارت ہے' کاشی کاری بھی کاشی کاری ہے' کتبہ نویسی' کتبہ نویسی ہے۔ لیکن آپ ذرا ہنر شناسوں کے پاس جایئے' آپ دیکھیں گے کہ دنیا میں شاید دسیوں اسلوب (style) موجود ہیں اور ہر صنعت اور ہر ہنر کا ایک خاص اسلوب ہے۔ مثلاً ''ہنرِ اسلامی'' نامی کتاب' جو ایک جرمن نے لکھی ہے' ابھی حال ہی میں اُس کا ترجمہ ہوا ہے' ایک اچھی کتاب ہے۔ ایک مرتبہ انہوں نے مجھے بھی دی تھی' تاکہ میں محافل میں اس کی پبلسٹی کروں' لیکن کیونکہ میرا انداز نہیں ہے کہ پبلسٹی کروں اس لئے میں نے انکار کردیا' اس وقت بھی {اچانک} میری زبان پر اس کا تذکرہ آگیا۔ بہرحال اسلامی آرٹ کے موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے' کہ اسلامی ہنر کا ایک مخصوص انداز ہے۔ اسلامی دنیا میں' اسلامی تمدن میں ایک نیا انداز وجود میں آیا جو اس کا اپنا مخصوص انداز ہے۔ البتہ ممکن ہے تمام دوسرے اسالیب کی طرح اس میں بھی دوسرے اسالیب سے کچھ لیا گیا ہو' لیکن خود اس کی اپنی بھی ایک مستقل حیثیت اور اپنا بھی ایک مخصوص اسلوب ہے۔

اس سے آگے بڑھتے ہیں' آتے ہیں افکار کی طرف۔ ایک ناواقف انسان کے لئے ارسطو ایک عالم' فلسفی اور مفکر ہے' ابوریحان البیرونی ایک عالم اور مفکر ہے' بوعلی سینا ایک عالم اور مفکر ہے' افلاطون ایک عالم اور مفکر ہے' فرانسس بیکن ایک عالم اور مفکر ہے' اسٹوارٹ میل' ڈیکارٹ اور

ہیگل بھی اسی طرح سے ہیں۔ اب دوسری طرف ایک اور گروہ کی طرف چلتے ہیں تو ان کی نظر میں شیخ صدوقؒ ایک عالم ہیں' شیخ کلینیؒ ایک عالم ہیں' اخوان الصفا بھی کچھ علما تھے' یہ سب کے سب شیعہ ہیں' خواجہ نصیر الدین طوسیؒ ایک عالم ہیں۔ لیکن ایک واقف اور مطلع شخص جانتا ہے کہ ان علما کی روش' اسلوب اور انداز کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایک عالم کا انداز و اسلوب استدلالی اور قیاسی ہے۔ یعنی وہ تمام مسائل میں ارسطوئی منطق کی پیروی کرتا ہے۔ اگر اسکے سامنے علمِ طب کو رکھا جائے' تو وہ کوشش کرے گا کہ اُسے بھی ارسطوئی منطق کے تحت حاصل کرے۔ اگر اُسے علمِ فقہ کو دیا جائے' تو وہ اس میں بھی ارسطوئی منطق کے مطابق استدلال کرنا چاہے گا۔ اگر ادبیات اور صرف ونحو کو اس کے حوالے کیا جائے' تو وہ اس میں بھی ارسطوئی منطق کو استعمال کرے گا' اس کا اسلوب ہی یہی یہ ہے۔

ایک شخص اور ہے جس کا اسلوب تجربی ہے' جیسے بہت سے جدید علما۔ کہتے ہیں کہ ابو ریحان البیرونی اور بو علی سینا کے اسلوب میں فرق یہ ہے کہ بو علی سینا کا اسلوب ارسطوئی منطق ہے لیکن ابو ریحان البیرونی کا اسلوب اکثر حسی اور تجربی رہا ہے' باوجود یہ کہ یہ دونوں ہم عصر ہیں اور دونوں ہی نابغۂ روزگار ہیں۔ ایک ہے جس کا اسلوب عقلی ہے' جبکہ دوسرے کا انداز نقلی ہے۔ بعض ایسے ہیں جن کا اسلوب یکسر عقلی نہیں ہوتا' تمام مسائل میں وہ صرف منقولات پر اعتماد کرتے ہیں' منقولات کے سوا وہ کسی اور چیز پر اعتماد نہیں کرتے۔ مثلاً مرحوم علامہ مجلسیؒ اگر طب لکھنا چاہیں گے' تو اُسے بھی منقولات کی بنیاد پر لکھیں گے۔ اور کیونکہ ان کا تکیہ منقولات پر ہے اس لئے وہ منقولات کے صحیح (اور غیر صحیح) ہونے کو بھی زیادہ اہمیت نہیں دیتے' یا کم از کم اپنی کتابوں میں تو سب ہی جمع کر دیں گے۔ وہ اگر ایامِ سعد و نحس کو بھی لکھیں گے' تو بھی منقولات سے استناد کریں گے۔

ایک کا اسلوب منقول ہے' ایک کا معقول' ایک کا اسلوب حسی ہے' ایک کا استدلالی۔ ایک کا اسلوب آج کل کے لوگوں کی اصطلاح میں ڈیالکٹیکی ہے۔ یعنی وہ چیزوں کے حرکت میں ہونے کا قائل ہوتا ہے۔ ایک اور ہے جس کا اسلوب اسٹیٹکس ہے۔ یعنی وہ دنیا کے نظام میں حرکت کو بالکل دخل انداز نہیں سمجھتا۔ کئی اسلوب و انداز پائے جاتے ہیں۔

اب آتے ہیں اعمال میں۔ اعمال کے بھی مختلف انداز ہیں۔ سیرت شناسی یعنی اسلوب وانداز شناسی۔ اولاً ایک کلیت موجود ہے۔ دنیا کے سلاطین اپنے اندر پائے جانے والے بعض اختلافات کے ساتھ ساتھ، کلی طور پر ایک مخصوص انداز، مخصوص سیرت اور ایک مخصوص روش رکھتے ہیں۔ فلسفیوں کا ایک مخصوص انداز ہوتا ہے۔ ریاضت کرنے والوں کا ایک مخصوص انداز ہوتا ہے۔ انبیا کا بھی بطورِ کلی ایک مخصوص انداز ہے اور اگر ہر ایک کو جداگانہ طور پر دیکھیں (تو وہ ایک مخصوص انداز کا حامل نظر آئے گا، مثلاً) پیغمبر اکرمؐ کا اپنا ایک مخصوص انداز ہے۔

یہاں ہم ایک اور نکتے کا بیان ضروری سمجھتے ہیں: یہ جو ہم نے عرض کیا کہ ہنر میں مختلف اسلوب پائے جاتے ہیں۔ شاعری میں مختلف اسلوب ہیں، تفکر میں مختلف اسلوب ہیں، عمل میں مختلف اسلوب ہیں، یہ ان لوگوں کے لئے ہیں جن کا خود کوئی خاص اسلوب ہوتا ہے۔ لوگوں کی اکثریت کا بالکل کوئی اسلوب نہیں ہوتا۔ بہت سے لوگ جو شعر کہتے ہیں، ان کا کوئی اسلوب نہیں ہوتا، انہیں اسلوب کا پتا ہی نہیں ہوتا۔ یہ بہت سے آرٹسٹ (شاید یہ cubist ایسے ہی ہوں) بنیادی طور پر کوئی اسلوب انہیں سمجھ ہی نہیں آتا۔ بہت سے لوگ اپنے تفکر میں کسی خاص اسلوب وانداز اور منطق کے مالک ہی نہیں ہوتے۔ کبھی نقل پر تکیہ کرتے ہیں، کبھی عقل پر بھروسہ کرتے ہیں اور کبھی حسی ہو جاتے ہیں، تو کبھی عقلی بن جاتے ہیں۔ یہ لوگ منطق سے دور ہیں۔ ہم منطق سے دور رہنے والوں کی بات نہیں کرتے۔ عمل {کے میدان} میں بھی لوگوں کی غالب اکثریت کا کوئی اسلوب نہیں ہوتا۔ اگر ہم سے کہا جائے کہ (عمل میں) اپنا اسلوب بیان کرو، اپنی سیرت بیان کرو، اپنی روش بیان کرو، تم زندگی کی مشکلات کے حل کے لئے (کس روش پر عمل کرتے ہو؟ ہمارے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہوتا)

ہر انسان زندگی میں اپنے لئے کوئی مقصد رکھتا ہے۔ اب چاہے اس کا مقصد کچھ بھی ہو۔ ایک انسان کوئی اعلیٰ مقصد رکھتا ہے، ایک کا مقصد پست ہوتا ہے، ایک کا مقصد خدا ہوتا ہے، ایک کا مقصد دنیا ہوتی ہے۔۔۔۔ مختصر یہ کہ انسانوں کے مقصد ہوتے ہیں۔ بعض لوگ اپنے مقصد کے لئے کوئی اسلوب نہیں رکھتے، انہوں نے کسی مخصوص روش کا انتخاب نہیں کیا ہوتا، روش ان کے پلے

ہی نہیں پڑتی۔ لیکن لوگوں کی ایک قلیل تعداد ایسی ہے کہ وہ جس راستے پر چلتے ہیں' ان کا ایک مخصوص اسلوب اور روش ہوتی ہے۔ ایسے لوگ بہت کم ہیں' ورنہ اکثر لوگ منطق سے دور ہی رہتے ہیں' طرز و اسلوب سے فاصلے ہی پر ہوتے ہیں' روش اور طریقۂ عمل سے پرے ہی ہوتے ہیں۔ بقولِ شخصے ہرج ومرج (اُن کے اعمال پر حکم فرما ہے اور وہ) ھَمَجٌ رَعاعٌ ہیں۔

سیرتِ پیغمبرؐ یعنی اسلوب و اندازِ پیغمبرؐ' وہ طریق' سلیقہ اور اسلوب جس سے نبی اکرمؐ اپنے عمل اور اپنی روش میں اپنے مقاصد کے لئے استفادہ کرتے تھے۔ ہماری گفتگو نبی کریمؐ کے مقاصد کے بارے میں نہیں ہے۔ پیغمبرؐ کے مقاصد فی الحال ہمارے لئے واضح ہیں۔ ہماری گفتگو پیغمبرؐ کے انداز و اسلوب کے بارے میں ہے۔ اُس روش کے بارے میں ہے' جسے پیغمبر اکرمؐ اپنے مقصد اور ہدف کے لئے استعمال کرتے تھے۔

مثلاً پیغمبرؐ تبلیغ کیا کرتے تھے۔ پیغمبر کی تبلیغی روش کیا تھی؟ پیغمبر کا اندازِ تبلیغ کیا تھا؟

پیغمبر اکرمؐ مبلغ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے معاشرے کے لئے ایک سیاسی رہنما بھی تھے۔ آپؐ نے مدینہ تشریف لاتے ہی ایک معاشرہ تشکیل دیا تھا' حکومت تشکیل دی تھی' آپؐ خود اُس معاشرے کے رہنما تھے۔ پیغمبرؐ نے معاشرے کی قیادت اور اسکی تنظیم کے لئے کیا روش اختیار کی تھی؟

اسی کے ساتھ ساتھ پیغمبرؐ قاضی (judge) بھی تھے اور لوگوں کے درمیان فیصلے کیا کرتے تھے۔ آپ کی قضاوت کا انداز کیا تھا؟

تمام دوسرے انسانوں کی طرح نبی کریمؐ کی بھی ایک گھریلو زندگی (family life) تھی' آپ کی متعدد بیویاں تھیں' بچے تھے۔ بیوی کے ساتھ سلوک میں آپ کی روش کیا تھی؟ اپنے اصحاب' ساتھیوں اور اصطلاحاً مریدوں کے ساتھ آپ کا اندازِ معاشرت کیا تھا؟

پیغمبرؐ کے جانی دشمن بھی تھے۔ اپنے دشمنوں کے ساتھ پیغمبر کا طرزِ عمل کیا تھا؟

اسی طرح مختلف معاملات میں دوسرے دسیوں انداز' اسلوب اور طرز ہائے عمل جنہیں واضح ہونا چاہئیں۔

عمل میں مختلف اسالیب

مثلاً سیاسی اور سماجی رہنماؤں میں سے بعض کی روش یعنی وہ روش جس پر وہ بھروسہ کرتے ہیں' وہ فقط طاقت ہوتی ہے۔ یعنی انہیں طاقت کے سوا کسی اور چیز پر ایمان اور اعتماد نہیں ہوتا۔ اُن کی منطق یہ ہے کہ: سینگ کا ایک ٹکڑا' لمبی دُم سے بہتر ہے۔ یعنی طاقت کے سوا ہر چیز کو دور اٹھا پھینکو۔ وہی سیاست جس پر آج کل امریکی دنیا بھر میں عمل پیرا ہیں' اُن کا عقیدہ ہے کہ مسائل کا حل صرف اور صرف طاقت کا استعمال ہے' طاقت کے سوا دوسری تمام چیزوں کو چھوڑ دو۔

بعض لوگ سیاست میں اور معاملات کے حل میں ہر چیز سے بڑھ کر دھوکے اور فریب پر اعتماد کرتے ہیں۔ برطانوی انداز کی سیاست' معاویہ والی سیاست۔ اوّل الذکر یزیدی سیاست تھی۔ یزید اور معاویہ دونوں مقصد کے اعتبار سے ایک ہی تھے' لیکن یزید کی روش معاویہ کی روش سے مختلف ہے۔ یزید کی روش طاقت کا استعمال تھی لیکن معاویہ کی روش ہر چیز سے زیادہ دھوکا' فریب دہی اور چالاکی تھی۔

کسی اور شخص کا انداز ممکن ہے اکثر اوقات حقیقی معنی میں اخلاق ہو' صرف دکھاوے کا اخلاق نہ ہو کیونکہ اس صورت میں یہ وہی معاویہ کی مکاری ہو جائے گی۔ سچائی' خلوص' وفا۔ سیاست میں سیرتِ علیؑ اور سیرتِ معاویہ کے درمیان یہی فرق تھا۔ اس زمانے کے اکثر لوگ معاویہ کی سیاست کو ترجیح دیتے تھے' کہتے تھے: سیاست یعنی یہی کام جو معاویہ انجام دیتے ہیں۔ (۱) وہ لوگ حضرت علیؑ کے پاس آتے اور کہتے تھے: آپ بھی وہی روش اختیار کیوں نہیں کرتے جو معاویہ نے اختیار کی ہوئی ہے' تاکہ آپ کا کام آگے بڑھے۔ آپ کو صرف اپنے مقاصد میں

۱۔ آج بھی ہمارے درمیان ''سیاست'' کا لفظ فریب اور مکاری کے مترادف ہے۔ حالانکہ سیاست یعنی معاملات چلانا' اور سائس یعنی مدبر' چلانے والا۔ ہم ائمہ علیہم السلام کے بارے میں کہتے ہیں: وَ سَاسَةُ الْعِبَادِ ، یعنی بندوں کے سیاستمدار' بندوں کے سائس۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ لفظ دھوکا اور فریب کا مفہوم پیدا کر گیا ہے۔

پیشرفت سے غرض ہونی چاہئے‘ بقیہ کچھ بھی ہوا کرے۔ بسا اوقات انسان کو رقم قرض لینے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ اس سے لے کر اس کو دے دیتا ہے‘ کبھی وعدہ کرتا ہے‘ اگر وعدہ خلافی ہوتی ہے تو ہوا کرے۔ وعدہ کر سکتا ہے‘ بعد میں اس پر عمل کرے نہ کرے۔ آپ اپنا کام نکالنے سے غرض رکھئے‘ وہ زیادہ اہم ہے۔ یہاں تک کہ بعض لوگ یہ سمجھنے لگے تھے کہ شاید علیؑ ان طریقوں سے واقف نہیں ہیں‘ معاویہ چالاک اور ہوشیار ہے‘ علیؑ میں یہ چالاکیاں نہیں ہیں۔ {ایسے لوگوں کے لئے} آپ نے فرمایا:

"وَ اللّٰهِ مَا مُعَاوِيَةُ بِاَدْهىٰ مِنِّي."

تمہیں غلط فہمی نہ رہے؟! خدا کی قسم معاویہ مجھ سے زیادہ چالاک اور ہوشیار نہیں ہے۔ تم یہ سمجھتے ہو کہ میں جو فریب کاری نہیں کرتا‘ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اس سے ناواقف ہوں؟!

"وَ لٰكِنَّهُ يَغْدِرُ وَ يَفْجُرُ."

وہ دھوکے اور فریب سے کام لیتا ہے‘ اور فسق و فجور کرتا ہے۔

"وَ لَوْلَا كَرَاهِيَةُ الْغَدْرِ لَكُنْتُ مِنْ اَدْهىَ النَّاسِ."

اگر اللہ تعالیٰ کو دھوکا دہی ناپسند نہ ہوتی‘ تو تم دیکھتے کہ میں ان معنوں میں جسے تم چالاکی کہتے ہو اور معاویہ کو چالاک پکارتے ہو‘ (میں چالاک ہوں یا نہیں؟) اس وقت تمہیں نظر آتا کہ چالاک کون ہے‘ میں یا معاویہ؟

"اَلَا وَ اِنَّ كُلَّ غَدْرَةٍ فَجْرَةٌ وَ كُلَّ فَجْرَةٍ كَفْرَةٌ وَ لِكُلِّ غَادِرٍ لِوَاءٌ يُعْرَفُ بِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ." (۱)

۱۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۹۸ {خدا کی قسم! معاویہ مجھ سے زیادہ چلتا پرزہ اور ہوشیار نہیں ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ وہ غداریوں سے چوکتا نہیں اور بدکرداریوں سے باز نہیں آتا۔ اگر مجھے عیاری و غداری سے نفرت نہ ہوتی‘ تو میں سب لوگوں سے زیادہ ہوشیار اور زیرک ہوتا۔ لیکن ہر غداری گناہ اور ہر گناہ حکم الٰہی کی نافرمانی ہے۔ چنانچہ قیامت کے دن ہر غدار کے ہاتھوں میں ایک جھنڈا ہوگا جس سے وہ پہچانا جائے گا۔}

میں کس طرح سیاست میں دھوکے سے کام لوں؛ جبکہ میں جانتا ہوں کہ دھوکا' فریب اور مکاری فسق وفجور ہے اور یہ فسق وفجور کفر کی حد تک ہے اور قیامت میں ہر مکار ایک پرچم کے ساتھ محشور ہوگا! میں کسی صورت مکاری سے کام نہیں لوں گا۔

اسے کہتے ہیں اسلوب اور روش۔ کسی روش اور اسلوب میں طاقت پر بھروسہ کیا جاتا ہے' کسی میں مکاری پر' کسی روش میں تجاہل پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ یعنی اپنے آپ کو بے خبر ظاہر کیا جاتا ہے۔ ایک عمر رسیدہ سیاست دان تھا' چند سال پہلے مر گیا' وہ اس بات کے لئے مشہور تھا۔ اب مجھے معلوم نہیں کہ وہ حقیقتاً کیا اتنا ہی سیدھا تھا یا نہیں؟ لیکن کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اپنے آپ کو سادہ ظاہر کرتا تھا۔ وزیرِ اعظم تھا۔ ایک بہت بڑے عالمِ دین کو گرفتار کر لیا گیا تھا' لوگ اسکے پاس گئے کہ انہیں کیوں گرفتار کیا گیا ہے؟ کہنے لگا: یہ معاملہ کس کے ہاتھ میں ہے؟ یہ ملک کا وزیرِ اعظم ہے اور کہتا ہے کہ معاملہ کس کے ہاتھ میں ہے؟ میں کس سے بات کروں؟

ہاں' اس نے بھی اپنے لئے ایک روش کا انتخاب کیا ہوا تھا' کہ اپنے آپ کو احمق' نادان اور ناسمجھ ظاہر کرے اور اس طرح سے بقولِ شخصے اپنا کام نکالے۔ مقصد یہ ہے کہ اس کا کام نکل جائے' اگرچہ لوگ کہیں کہ وہ احمق ہے۔ یہ بھی ایک روش اور انداز ہے۔ تجاہل کا انداز' یعنی اپنے آپ کو سیدھا سادا ظاہر کرنا' احمق ظاہر کرنا' اپنے آپ کو بے خبر ظاہر کرنا۔ اور کچھ لوگ اسی روش کے ذریعے اپنا کام نکالتے ہیں۔ یعنی کاموں میں ان کی روش وقت گزاری ہوتی ہے۔ حقیقتاً وقت گزاری پر یقین رکھتے ہیں۔

بعض لوگوں کی روش اکثر دور اندیشی ہوتی ہے۔ بعض لوگ اپنی روش میں دوٹوک اور قاطع ہوتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا انداز دوٹوک اور قاطع نہیں ہوتا۔ بعض لوگوں کی روش انفرادی ہوتی ہے' یعنی تنہا فیصلہ کرتے ہیں۔ بعض لوگ تنہا فیصلہ کرنے پر تیار ہی نہیں ہوتے' جہاں ان کے سامنے معاملہ بالکل واضح ہوتا ہے' وہاں بھی تنہا فیصلہ نہیں کرتے۔ یہ بات خصوصاً سیرتِ نبیؐ میں عجب انداز سے (نظر آتی) ہے۔ مقامِ نبوت میں' ایک ایسے مقام پر جہاں اصحاب کو ان پر ایسا ایمان ہے کہ کہتے ہیں کہ گر آپ ہمیں سمندر میں کود جانے کا حکم دیں' تو ہم سمندر میں کود پڑیں

گے۔ ایسے مقام پر بھی آپ نہیں چاہتے کہ آپ کی روش انفرادی ہو اور معاملات میں آپ تنہا فیصلہ کریں۔ اس لئے کہ اس کا کم از کم نقصان تو یہ ہے کہ تصور کیا جائے گا کہ آپ اپنے اصحاب کو اہمیت نہیں دیتے' یعنی گویا تم لوگوں کے پاس عقل ہی نہیں ہے' تم فہم و شعور سے عاری ہو' تم تو بس ایک آلہ' کار ہو' حکم صرف میں دوں گا تمہارا کام عمل کرنا ہے۔ اس روش کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ کل کو جو بھی رہبر بنے وہ اسی طرح عمل کرے اور کہے کہ: رہبریت کا لازمہ یہ ہے کہ رہبر اپنی سوچ اور رائے کا اظہار کرے اور رہبر کے علاوہ جو کوئی بھی ہے وہ صرف بے ارادہ آلہ' کار بن جائے اور صرف عمل کرے۔

لیکن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مقامِ نبوت میں {بھی} یہ نہیں کیا۔ شوریٰ تشکیل دیتے ہیں {مشاورتی اجلاس بلاتے ہیں} ساتھیو بتاؤ ہم کیا کریں؟ {جنگ} ''بدر'' پیش آتی ہے' تو اجلاس بلاتے ہیں' {جنگ} ''اُحد'' پیش آتی ہے' تو اجلاس تشکیل دیتے ہیں۔ دشمن مدینہ کے نزدیک پہنچ چکا ہے' تمہاری نظر میں مصلحت کس بات میں ہے؟ مدینہ سے باہر نکل جائیں اور مدینہ کے باہر ان کے ساتھ جنگ کریں' یا مدینہ ہی میں رہیں اور اندرونی طور پر اپنی پوزیشن مضبوط بنائیں' دشمن کچھ عرصے ہمارا محاصرہ کرے گا' اگر کامیاب نہ ہوا تو شکست کھا کر لوٹ جائے گا۔ بہت سے عمر رسیدہ اور تجربہ کار لوگوں کی رائے یہ تھی کہ مدینہ کے اندر ہی رہنے میں مصلحت ہے۔ جوان جو زیادہ غیور ہوتے ہیں' اس بات سے ان کی جوانی پر ٹھیس لگی' کہنے لگے: ہم مدینہ میں بیٹھے رہیں اور وہ آ کر ہمارا محاصرہ کر لیں؟! ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے' ہم باہر نکلیں گے اور جس طرح بھی ہوا ان سے جنگ کریں گے۔ تاریخ لکھتی ہے کہ خود اللہ کے رسول بھی مدینہ سے باہر نکلنے کو خلافِ مصلحت سمجھتے تھے۔ فرماتے تھے: اگر ہم مدینہ میں رہیں' تو ہماری کامیابی کے امکانات زیادہ ہیں' یعنی آپ کی رائے ان عمر رسیدہ اور تجربہ کار افراد کی رائے کے موافق تھی' لیکن آپ نے دیکھا کہ اصحاب کی اکثریت' جو انہی جوانوں پر مشتمل تھی' یہ کہہ رہی ہے کہ نہیں اے اللہ کے رسولؐ! ہم مدینہ سے باہر نکلیں گے' اُحد کے دامن میں جائیں گے اور وہاں اُن سے لڑیں گے۔ اجلاس ختم ہوا۔ یکا یک دیکھا کہ حضورؐ اسلحہ سے لیس باہر تشریف لائے اور فرمایا: چلو باہر چلو۔ جن

لوگوں نے باہر نکلنے کی رائے دی تھی وہ آئے اور کہنے لگے: یا رسول اللہؐ! کیونکہ آپ نے ہم سے رائے طلب کی تھی اس لئے ہم نے یہ رائے دی تھی' لیکن اسکے باوجود ہم آپ کے تابع ہیں' اگر آپ مصلحت نہیں سمجھتے' تو ہم اپنی رائے کے برخلاف مدینہ ہی میں رہیں گے۔ آپ نے فرمایا: جب نبی اسلحہ پہن کر باہر آجائے' تو پھر اس کا اسلحہ اتارنا درست نہیں ہے۔ اب جب کہ باہر نکلنا طے پاگیا ہے' تو باہر ہی چلیں گے۔

غرض اس پہلو سے' مختلف میدانوں میں ان گوناگوں اسالیب' روشوں اور طریقوں کا جائزہ لینا اچھی بات ہے۔ یہ وہ مختصر فہرستیں تھیں جنہیں ہم نے آپ کی خدمت میں عرض کیا۔ شاید ہر رات ہمیں یہ توفیق حاصل ہو کہ ان میں سے کسی ایک میدان میں نبی اکرمؐ کی روش اور طریقہ کار کو آپ کے سامنے بیان کرسکیں۔

ذکرِ مصائب کا مقصد

یہ ایام ایک اعتبار سے جناب زہرا سلام اللہ علیہا سے منسوب ہیں۔ ایک نکتہ جس کے متعلق کل رات ایک جوان نے مجھ سے سوال کیا اسے میں آپ کے لئے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ شاید اچھا رہے۔ البتہ میں کبھی بھی اس بات پر اصرار نہیں کرتا کہ اپنی ہر تقریر میں ذکرِ مصائب بھی کروں۔ اگر بات ایسی جگہ پہنچ جائے جہاں مجھے محسوس ہو کہ ذکرِ مصائب کرنا اپنے اوپر جبر کرنا ہے اور مجھے ایک نکتے سے دوسرے نکتے پر جانا ہو' تو میں نہیں کرتا۔ لیکن اکثر اوقات' خصوصاً ایامِ غم میں' اشارتاً ہی سہی' ذکرِ مصائب کرتا ہوں۔ ایک جوان نے مجھ سے سوال کیا ہے کہ: کیا یہ کوئی ضروری عمل ہے' کیا اس میں کوئی خوبی پائی جاتی ہے؟ کیا امام حسین علیہ السلام کے مکتب کو زندہ رکھنے کے لئے امام حسینؑ کے مصائب کا ذکر بھی ضروری ہے؟ میں نے اس سے کہا: ہاں! اس بات کا حکم ہمیں ائمۂ اطہار علیہم السلام نے دیا ہے۔ اور اس حکم کا فلسفہ ہے' اور وہ یہ ہے کہ جس مکتب میں جذبات کی چاشنی نہ ہو اور صرف ایک مکتب' فلسفہ اور فکر ہو' تو دلوں میں زیادہ رسوخ پیدا نہیں کرتا اور اس کی بقا کا امکان نہیں رہتا۔ لیکن اگر کسی مکتب میں جذبات کی چاشنی پائی جائے' تو یہ جذبات اسے حرارت

دیتے ہیں۔ کسی مکتب کی گہرائی اوراس کا فلسفہ اس مکتب کو واضح کرتے ہیں اس مکتب کو منطق دیتے ہیں اس مکتب کو منطقی بناتے ہیں۔

بے شک امام حسین علیہ السلام کے مکتب کا فلسفہ اور منطق ہے یہ ایک درس ہے اور اسے سیکھنا چاہیے۔ لیکن اگر ہم ہمیشہ اس مکتب کا صرف ایک فکری مکتب کی صورت میں ذکر کریں گے تو اس کی حرارت اور جوش ختم ہو جائے گا اور یہ فرسودہ ہو جائے گا۔

یہ ایک بہت عظیم اور گہری نظر تھی ایک غیر معمولی، عجیب اور معصومانہ دور اندیشی تھی کہ کہا گیا ہے کہ کبھی تم اس چاشنی کو دور نہ کرنا جذبات کی چاشنی، حسین ابن علی علیہ السلام امیر المومنینؑ امام حسنؑ دوسرے ائمہؑ یا حضرت زہرا سلام اللہ علیہا کے ذکر مصیبت کو۔ ہمیں جذبات کی اس چاشنی کی حفاظت کرنی چاہیے۔

کیونکہ یہ ایام رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور جناب زہرا سلام اللہ علیہا کی وفات کے درمیانی ایام ہیں لہٰذا ان ایام کا زیادہ تعلق ان ہی کی ذواتِ مقدسہ سے ہے۔ ذکرِ مصائب کے دو تین جملے عرض کریں گے۔

لکھا ہے: مَا زَالَتْ بَعْدَ اَبِیهَا مُعْصَبَةَ الرَّأْسِ، نَاحِلَةَ الْجِسْمِ، بَاکِیَةَ الْعَیْنِ، مُنْهَدَّةَ الرُّکْنِ. اپنے بابا کے بعد زہراؑ کو کسی نے اس کپڑے کو کھولے نہیں دیکھا جو آپ اپنے سر پر لپیٹتی تھیں۔ زہراؑ دن بدن کمزور اور لاغر ہوتی جا رہی تھیں۔ اپنے بابا کے بعد زہراؑ کو ہمیشہ روتے ہوئے ہی دیکھا گیا۔ "مُنْهَدَّةَ الرُّکْنِ." اس جملے کے انتہائی عجیب معنی ہیں۔ "رکن" یعنی ستون، ایک عمارت کی مانند جس کے ستون ہوتے ہیں اور وہ ان ستونوں پر کھڑی ہوتی ہے۔ جسمانی اعتبار سے پاؤں اور ریڑھ کی ہڈی انسان کا ستون ہیں۔ یعنی انسان جب کھڑا ہوتا ہے تو ان ہڈیوں کے ڈھانچے پر کھڑا ہوتا ہے۔ کبھی جسمانی اعتبار سے یہ ستون ٹوٹ جاتا ہے مثلاً فرض کیجیے کہ کسی کے پاؤں کٹ جائیں یا اس کی ریڑھ کی ہڈی چکنا چور ہو جائے۔ لیکن کبھی انسان روحانی طور پر اس طرح سے ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے کہ گویا وہ روحانی ستون جس پر انسان کھڑا ہوا ہے وہ ٹوٹ گئے ہوں۔ اپنے بابا کے بعد زہراؑ کا حال اسی طرح سے بیان کیا گیا ہے۔ زہراؑ اور پیغمبرؐ دونوں کو ایک

دوسرے سے عشق کی حد تک محبت تھی۔ جب آپ اپنے بچوں امام حسنؑ اور امام حسینؑ کو دیکھتیں تو بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ فرماتیں: میرے بچو! تمہارے وہ مہربان بابا کہاں گئے جو تمہیں اپنے دوش پر سوار کرایا کرتے تھے۔ تمہیں اپنی گود میں بٹھاتے تھے اور تمہارے سروں پر دستِ شفقت پھیرا کرتے تھے۔

ولا حول ولا قوۃ الا باللّٰہ العلی العظیم و صلی اللّٰہ علیٰ محمّد و آلہ الطاہرین.

دوسری نشست

مستقلِ منطقِ عملی

مستقل منطقِ عملی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ ربّ العالمین باریٔ الخلائق اجمعین و الصلوٰۃ و السّلام علیٰ عبد اللّٰہ ورسولہ و حبیبہ و صفیّہ و حافظ سرّہ و مُبلّغ رسالاتہ سیّدنا و نبیّنا و مولانا ابی القاسم محمد و آلہ الطیّبین الطاہرین المعصومین. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم:

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ لِّمَنْ کَانَ یَرْجُوا اللّٰہَ وَ الْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَکَرَ اللّٰہَ کَثِیْرًا. (۱)

اگرچہ ابتدا میں ہمارا خیال تھا کہ آج رات سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کے مختلف پہلوؤں میں سے ایک ایک پہلو لے کر اس پر گفتگو کا آغاز کریں گے، لیکن ایک بات ہمارے ذہن میں آئی جس کے متعلق ہم نے ضروری سمجھا کہ اسے کل کی گفتگو کے تسلسل میں

۱۔ سورۂ احزاب ۳۳۔ آیت ۲۱ (تم میں اس کے لیے رسول اللہ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے جو بھی اللہ اور آخرت سے امیدوار ہے اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتا ہے۔)

عرض کریں۔

کل ہم نے عرض کیا تھا کہ ''سیر'' اور ''سیرت'' میں فرق ہے۔ ''سیر'' یعنی عمل۔ دنیا میں ہر انسان جس طرح گفتگو کرتا ہے' اسی طرح عمل بھی انجام دیتا ہے۔ لیکن سیرت' وہ خاص انداز' اسلوب' سلیقہ اور طرزِ عمل ہے' جس سے صاحبِ اسلوب' صاحبِ طرز اور صاحبِ منطق افراد اپنی ''سیر'' میں کام لیتے ہیں۔ ہر انسان کی ''سیر'' ہوتی ہے لیکن ہر انسان کی ''سیرت'' نہیں ہوتی۔ یعنی ایسا نہیں ہوتا کہ ہر انسان اپنے عمل میں ایک خاص منطق کی پیروی کرتا ہو اور اپنے کردار میں کچھ اصولوں کا پابند ہو' جو اُس کے عمل کا معیار ہوں۔

جو افراد کسی حد تک منطق سے واقف ہیں' اُن کے لئے یہ دو جملے عرض کرتے ہوئے آگے بڑھ جاؤں گا: منطقِ فکری میں سب لوگ سوچ بچار کرتے ہیں' لیکن سب لوگ منطقی {انداز سے} سوچ بچار نہیں کرتے۔ منطقی {انداز سے} سوچنے سے مراد یہ ہے کہ انسان کے پاس منطق کے عنوان سے کچھ معیار موجود ہوں' جو علمِ منطق میں ثابت شدہ ہوں اور اس کا سوچ بچار انہی معیارات کی بنیاد پر ہو۔ گنتی کے لوگ ایسے ہوتے ہیں' جو سوچ بچار کے موقع پر اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ اُن کا اندازِ فکر ان معیارات کے مطابق ہو۔ اسی طرح بہت کم لوگ ایسے ملتے ہیں جن کا عمل منطقی ہوتا ہے' یعنی کچھ معین معیارات کی بنیاد پر ہوتا ہے' اور وہ ان معیارات' اصولوں اور موقفوں سے ہرگز جدا نہیں ہوتے۔ وگرنہ اکثر لوگوں کے عمل کی کوئی منطق نہیں ہوتی اور جس طرح اُن کی فکر کسی منطق کی حامل نہیں ہوتی' کبھی کچھ تو کبھی کچھ ہوتی ہے' اُسی طرح اُن کے عمل کا بھی یہی حال ہوتا ہے۔

ایک اور بات (عرض کرتے ہیں) تاکہ ہماری گفتگو ادھوری نہ رہ جائے۔ اگر ہم کبھی علمی اصطلاحات کا ذکر کرتے ہیں' تو ہماری کوشش ہوتی ہے کہ بہت مختصر عرض کریں' تاکہ ہمارے سننے والوں کی اکثریت کے لئے غیر موزوں نہ ہو جائے' لیکن کیونکہ ذکر نہ کرنے سے بات ادھوری رہ جاتی ہے اس لئے ذکر کر دیتے ہیں۔

منطق کی تقسیم

حکمت اور فلسفے میں یہ بات کہی گئی ہے کہ حکمت کی دو قسمیں ہیں: نظری اور عملی۔ الہیات، ریاضیات (حساب، جیومیٹری، ہیئت، موسیقی) اور طبعیات (فزکس، زولوجی، باٹنی) کو حکمتِ نظری یا فلسفۂ نظری کہتے ہیں، اور اس کے مقابلے پر اخلاق، سیاست اور تدبیر منزل کو حکمت عملی کہتے ہیں۔ منطق میں ایسی کوئی بات نہیں کہی گئی ہے، لیکن بات درست ہے، یعنی جس طرح فلسفے کی دو قسمیں ہیں: نظر اور عملی، اسی طرح منطق، یعنی انسان کے معیارات کی بھی دو قسمیں ہیں: نظری معیارات (وہی عام منطق) اور عملی معیارات۔ عملی معیارات وہی ہیں جنہیں ہم ''سیرت'' یا روش کہتے ہیں۔

کیا عمل میں ایک مستقل منطق رکھی جا سکتی ہے؟

ہم نے پہلے عرض کیا ہے کہ بعض لوگ صاحبِ منطق ہوتے ہیں اور بعض نہیں ہوتے۔ یہاں یہ مسئلہ پیش آتا ہے (خصوصاً ممکن ہے جوانوں کی توجہ اس طرف مبذول ہو جائے) کہ کیا ایک انسان ہر قسم کے زمانی اور مکانی حالات میں اپنے عمل کے اندر ایک منطق کا حامل ہو سکتا ہے، ایک مستقل اور ٹھوس منطق کہ وہ کبھی اپنی اس منطق سے تجاوز نہ کرے؟

ہم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں یہی بات کہتے ہیں کہ آپ ایک ایسے شخص تھے جو اپنے عمل میں {ایک مخصوص} سیرت کے مالک تھے، ایک روش اور اسلوب رکھتے تھے، ایک منطق کے حامل تھے، اور ہم مسلمانوں پر فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم اُن کی سیرت سے آشنا ہوں، اُن کی عملی منطق کو کشف کریں، اسلئے تاکہ اپنے عمل میں اس منطق سے استفادہ کریں۔

اب، کیا یہ ممکن ہے کہ ایک انسان اپنی عمر کی ابتدا سے آخر تک ایک ہی منطق رکھتا ہو اور وہی منطق اسکے لئے اصل اور بنیاد کی حیثیت رکھتی ہو؟ یا انسان ایک مستقل منطق رکھ ہی نہیں سکتا، یعنی انسان زمانی و مکانی حالات کا تابع ہے، زندگی کی شرائط (circumstances) اور خصوصاً طبقاتی صف بندی کے تابع ہے اور اپنے سماجی اور اقتصادی حالات کے مطابق ہر موقع پر جبراً ایک

خاص منطق کی پیروی کرتا ہے؟

یہ ایک اہم مسئلہ ہے جو آج کی دنیا میں زیر بحث ہے۔ مارکسزم اسی بنیاد پر ہے۔ مارکسزم جو اجتماعی اور اقتصادی حالات اور خصوصاً طبقاتی حالات کے مقابلے میں فکر عقیدے اور ایمان کی کسی حیثیت کا قائل نہیں وہ کہتا ہے کہ: بنیادی طور پر ایک انسان مختلف حالات میں ایک ہی انداز سے نہیں سوچ سکتا اور ایک ہی منطق پر کاربند نہیں رہ سکتا۔ انسان محل میں اور جھونپڑی میں دو علیحدہ علیحدہ منطقیں رکھتا ہے محل میں رہتے ہوئے ایک انداز سے سوچتا ہے اور جھونپڑی میں رہتے ہوئے دوسرے انداز سے۔ محل انسان کو ایک قسم کی منطق دیتا ہے اور جھونپڑی دوسری قسم کی۔ ایک محروم انسان ایک ایسا انسان جو ہمیشہ ظلم و ستم اور گھٹن زدہ ماحول میں رہا ہو اور انواع و اقسام کی محرومیتوں کا شکار رہا ہو اور شکار ہو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک خاص انداز سے سوچتا ہے۔ یعنی اسکے حالات زندگی اسکے لئے ایک خاص قسم کی سوچ پیدا کر دیتے ہیں۔ وہی ہے جو عدالت کی بات کرتا ہے وہی ہے جو مساوات اور برابری کی بات کرتا ہے وہی ہے جو آزادی کی بات کرتا ہے۔ حقیقتاً بھی اس کی سوچ یہی ہوتی ہے کیونکہ اس کے حالات اسی بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ وہ اس انداز سے سوچے۔

{لیکن} اگر اسی انسان کے حالات تبدیل ہو جائیں یہ جھگی نشین اگر محل نشین ہو جائے جھگی محل بن جائے اس کے خارجی حالات تبدیل ہو جائیں تو اس صورت میں اس کی سوچ بھی بدل جاتی ہے اور وہ کہنے لگتا ہے کہ نہیں یہ جو باتیں کی جارہی ہیں یہ درست نہیں ہیں۔ مصلحت کے تقاضے کچھ اور ہیں مساوات فضول بات ہے آزادی کو بھی کچھ محدود ہونا چاہئے اور وہ عدالت کی بھی کسی اور انداز سے تفسیر کرتا ہے۔

یعنی اس کے حالات زندگی تبدیل ہونے سے اس کے مفادات اور مصلحتیں بھی بدل گئیں۔ کیونکہ انسان اپنے مفادات اور مصلحتوں سے دستبردار نہیں ہو سکتا (لہٰذا اس کی سوچ بھی تبدیل ہو جاتی ہے)۔ اس مکتب (school of thought) کے مطابق انسانی سوچ کی سوئی اس انداز سے بنائی گئی ہے کہ وہ اپنے مفادات ہی کی سمت مڑتی ہے۔ جب اس کے مفادات

محروم طبقے کی سمت ہوتے ہیں' تو یہ سوئی محروم طبقے کے مفادات کے گرد گھومتی ہے' جب اس کے مفادات تبدیل ہوتے ہیں اور وہ مالدار طبقے میں شامل ہوجاتا ہے' تو اس کی سوچ کی سوئی نہ چاہتے ہوئے بھی اور جبراً مالدار طبقے کی طرف گھوم جاتی ہے۔

دینی طالب علم اور نماز میں اقتدا کی داستان

پرانے زمانے میں ہم کچھ باتوں کو مذاق اور طنز سمجھا کرتے تھے' اب ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگوں نے ان باتوں کے لئے بھی فلسفہ بنایا ہوا ہے' کہتے ہیں کہ یہ باتیں مذاق نہیں ہیں بلکہ حقیقت ہیں۔

ایک مذاق مشہد کے دینی طلاب کیا کرتے تھے' کہتے تھے: ایک طالب علم کہا کرتا تھا کہ میں ہمیشہ اُس پیش نماز کی اقتدا کرتا ہوں جو مجھے پیسہ دیتا ہے اور میری نماز درست ہے۔ جو کوئی مجھے پیسے دے گا' میں اسی کی اقتدا کروں گا اور میری نماز بالکل صحیح ہوگی۔ لوگ اُس سے کہتے تھے کہ جو بھی تمہیں پیسہ دے' تم اُس کے پیچھے نماز پڑھو گے' اس کا مطلب تو یہ ہے کہ تم پیسے کی اقتدا کرتے ہو۔ وہ کہتا تھا: جو کوئی مجھے پیسے نہیں دیتا ہے' تو کیونکہ وہ مجھے پیسے نہیں دیتا' اس لئے میری رائے یہ ہوجاتی ہے کہ وہ فاسق ہے اور اب اگر میں اس کی اقتدا میں نماز پڑھوں' تو میری نماز باطل ہوجائے گی۔ لیکن جوں ہی وہ مجھے پیسے دیتا ہے' تو رقم میرے ہاتھ میں آتے ہی' میں دیکھتا ہوں کہ میری رائے تبدیل ہوگئی ہے' اسی لمحے میرا عقیدہ یہ ہوجاتا ہے کہ وہ عادل ہے' اور اس وقت میں اسکے پیچھے جو نماز پڑھتا ہوں وہ نماز بھی درست ہے۔ کیونکہ میری رائے پیسے کے تابع ہے۔ اگر وہ مجھے پیسہ دے دیتا ہے' تو واقعاً میرا عقیدہ یہ ہوجاتا ہے کہ وہ عادل ہے' اور اگر نہ دے' تو واقعاً میرا عقیدہ یہ ہوجاتا ہے کہ وہ فاسق ہے۔ لہٰذا مجھے کبھی ایسے شخص کے پیچھے نماز نہیں پڑھنی چاہئے جو مجھے پیسے نہیں دیتا۔ کیونکہ {اسکے پیچھے} میری نماز باطل ہے۔ اور جو شخص مجھے پیسے دے گا' میں اس کے پیچھے نماز پڑھوں گا اور میری یہ نماز درست ہوگی۔

ہم اسے ہمیشہ ایک مذاق سمجھا کرتے تھے' لیکن اب دیکھتے ہیں کہ نہیں' یہ خود دنیا میں کم و

بیش ایک فلسفہ ہے کہ انسان کی فکر کی سوئی کو اس طرح سے بنایا گیا ہے کہ وہ اپنے مفادات اور مصلحتوں سے ہٹ کر سوچ ہی نہیں سکتا۔ تاریخ کا جبر ہے' اقتصاد کا جبر ہے' اس کے سوا اس کے لئے کوئی امکان ہی نہیں ہے۔

اس نظریئے کو توڑنے والے تاریخی نمونے

یہ بھی ایک بات ہے' لیکن دعویٰ ہے' اور اس قسم کے دعووں کے درست یا غلط ہونے کو ہم کس طرح جان سکتے ہیں؟ ہمیں میدانِ عمل میں جا کر سمجھنا چاہئے۔ واقعاً جائیں' تجربہ کریں اور دیکھیں کہ کیا ایسا ہی ہے؟

ہمیں انسانوں پر تجربہ کرنا چاہئے' دیکھنا چاہئے کہ کیا واقعاً افرادِ بشر کا ضمیر ان کے مفادات کے سامنے ایسا ہی کھلونا ہے؟ کیا واقعاً انسان کی ساخت اسی طرح کی ہے؟ کیا انسانی ضمیر اس حد تک اسکے مفادات کا کھلونا ہے؟ کیا یہ انسان کی توہین کی انتہا نہیں ہے؟ کیا یہ نظریہ ایک سو فیصد انسان مخالف نظریہ نہیں ہے؟

آیئے چلتے ہیں' دیکھتے ہیں۔ سچی بات ہے' خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتے ہیں کہ بات اس طرح نہیں ہے۔ وہ لوگ جن کی کوئی منطق نہیں ہوتی' جن کا کوئی ایمان نہیں ہوتا' اُن کا معاملہ بے شک یہی ہے۔ لیکن ان متعدد دلائل کی بنیاد پر جو ہمیں اس کی مخالفت میں ملتے ہیں' یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انسان لازماً اور جبراً ایسا ہی ہے۔

حضرت علیؑ

علی الوردی نامی ایک عرب مصنف ہے' جو عراقی الاصل ہے' یونیورسٹی کا استاد تھا اور تقریباً بیس سال پہلے اس کی کچھ کتابیں شائع ہوئی تھیں' جن میں سے بعض کا ترجمہ فارسی زبان میں بھی ہوا ہے۔ وہ شیعہ ہے لیکن اسکے ساتھ ساتھ مارکسزم کی طرف بھی مائل ہے۔ اپنی کتاب میں بھی' شیعہ مذہبی رجحان کا حامل بھی ہے اور مارکسی رجحان کا حامل بھی' اور کیونکہ وہ تھوڑا بہت مذہبی

رجحان بھی رکھتا ہے اس لئے بعض اوقات مارکسزم کے خلاف بھی کچھ بول دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:
بچی بات یہ ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے اپنی زندگی میں مارکس کے اس اصول کو توڑ دیا کہ ایک انسان محل اور جھونپڑی میں رہتے ہوئے ایک ہی انداز سے نہیں سوچ سکتا' وہ چاہے یا نہ چاہے اُس کی سوچ تبدیل ہو جائے گی اور اس کی سوچ کی سوئی اس کی سماجی حالت کی سمت مڑ جائے گی۔
حضرت علی علیہ السلام کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ایسا نہیں ہے' اس لئے کہ ہم حضرت علی علیہ السلام کو دو مختلف معاشرتی طبقاتی حالات میں دیکھتے ہیں' اُس صفر (zero) سے نزدیک حد میں بھی' اور اُس انتہائی نقطۂ اوج پر بھی جس سے بلند تر کوئی نقطہ نہیں۔ یعنی ایک دن ہم علیؑ کو ایک عام مزدور کی صورت دیکھتے ہیں' ایک عام اور غریب سپاہی کی صورت' ایک ایسے شخص کی صورت جو صبح سویرے اپنے گھر سے نکلتا ہے اور مثلاً کھیتوں کو پانی دینے کے لئے' درخت کاشت کرنے کے لئے' زراعت کرنے کے لئے اور کبھی مزدوری کرنے کے لئے' محنت کرنے اور ایک مزدور کی طرح مزدوری لینے کے لئے۔

ہم علیؑ کو ایک مزدور کی شکل میں دیکھتے ہیں' ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ایک انداز سے سوچتے ہیں۔
یہی علیؑ بعد میں جب اسلام پھیل چکا ہے (اور مسلمانوں کے پاس بہت مال و دولت آ گیا ہے' اور حتیٰ اپنی خلافت کے دور میں بھی اسی طرح سوچتے ہیں)۔ البتہ جب اسلام پھیل گیا' اسلامی دنیا مالدار ہو گئی اور ان کے سامنے غنائم کے ڈھیر لگنے لگے' تو اس بات کو بھی ہم قبول کرتے ہیں کہ جب اسلامی دنیا میں دولت کا سیلاب آیا تو وہ اپنے ساتھ سیکڑوں مسلمانوں کا ایمان بھی بہا کر لے گیا۔ ہم متعدد افراد کے بارے میں اس اثر کا انکار نہیں کرتے' لیکن ہمارا کہنا یہ ہے کہ ہم اسے ایک کلی اصول کے طور پر قبول نہیں کرتے۔ زبیر ایک باایمان مسلمان تھے۔ کیا چیز اُن کے لئے وبال بنی؟ وہ بے پناہ مال و دولت اور بے حساب غنائم جو ان کے دامن میں آ کر گرے اور وہ ہزاروں گھوڑوں' ہزاروں غلاموں اور متعدد مکانات کے مالک بن گئے۔ ایک گھر مصر میں' ایک کوفہ میں اور ایک مدینہ میں۔ طلحہ کے لئے کیا چیز باعثِ وبال ہوئی؟ وہی چیزیں۔ اسی طرح دوسرے بہت سے اصحابِ پیغمبر کو بے شک یا تو مقامِ خلافت نے آفت میں مبتلا کیا' عہدے

ومنصب کی آرزو اور لالچ نے آفت میں مبتلا کیا' یا مال و دولت نے۔ لیکن اگر یہ اصول کلی طور پر درست ہوتا' تو تمام اصحاب رسول کو نعوذ و باللہ ایک ہی راستے پر چلنا چاہئے تھا اور جتنا مال و مقام آیا تھا' وہ مال اور مقام کا سیلاب سب کو ایک ہی طرح سے بہا کر لے جاتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انہی لوگوں میں ایسے مضبوط ستون بھی ہیں' جنہیں یہ عظیم سیلاب ہلا بھی نہ سکے۔

حضرت سلمان فارسیؓ

یہ جاہ و مقام اور یہ غیر معمولی مال و دولت نہ صرف حضرت علیؑ کو نہ ہلا سکا' بلکہ اُن کے شاگردوں کے قدم بھی نہ ڈگمگا سکا۔ کیا سلمانؓ کو ذرہ برابر بھی تبدیل کر سکا؟ مدائن کے حاکم سلمانؓ وہی پیغمبر اکرمؐ کے دور والے سلمانؓ رہے۔ سلمانؓ جنہیں خلیفۂ وقت نے مدائن میں حاکم کے طور پر معین کیا' کیونکہ وہ ایرانی تھے اور مدائن بھی قدیم ایران کا دارالخلافہ تھا اور خلیفہ کی پالیسی کا تقاضا تھا کہ ایک ایسے مسلمان کو وہاں بھیجا جائے جو خود ایرانی ہو' تا کہ اہلِ ایران نسلی اعتبار سے اجنبیت محسوس نہ کریں اور یہ نہ کہیں کہ ہماری نسل کے علاوہ کوئی اور یہاں کیوں آیا ہے' اور دیکھ لیں کہ خود ان ہی کی نسل سے ایک سو فیصد مومن شخص آیا ہے۔ ایک ایسے مقام پر جہاں نوشیرواں حکومت کیا کرتا تھا' ایک ایسی جگہ پر جہاں اپنے ہزاروں غلاموں اور ہزاروں کنیزوں کے ساتھ خسرو پرویز حکومت کیا کرتا تھا' اس جگہ جہاں یزدگرد حاکم رہا تھا' جس کے کئی ہزار خدمتگار تھے اور دس بارہ ہزار عورتیں تو صرف اس کے حرم میں محبوس اور قید تھیں۔ ہاں یہی سلمانِ فارسیؓ جو اسلامی تربیت سے آراستہ ہیں' ان کی حکومت کی ابتدا سے اختتام تک' اُن کی زندگی کا کل اثاثہ صرف ایک پوٹلی تھی۔ یعنی جب وہ اپنا اثاثہ جمع کرنا چاہیں' تو اسے اپنی پیٹھ پر اٹھا کر روانہ ہو سکتے تھے۔ {یہ سب} ان فتوحات کے بعد تھا جن میں بہت زیادہ غنائم ہاتھ آئے تھے۔

حضرت ابوذرؓ

علی الوردی کہتا ہے: علیؑ کی زندگی نے مارکس کے نظریئے کو جھٹلا دیا۔ ہم کہتے ہیں سلمانؓ کی

زندگی نے بھی مارکس کے نظریے کو جھٹلا دیا' ابوذرؓ کی زندگی نے بھی نظریۂ مارکس کو جھٹلا دیا۔ کیا ابوذرؓ خلیفۂ ثالث کے دور کے وسط تک زندہ نہ تھے؟ اُسی زمانے میں' جس میں دوسرے لوگ لاکھوں دینار اور ایک ایک لاکھ درہم خلیفہ سے انعام لیا کرتے تھے' اپنی جیبیں بھرا کرتے تھے اور اپنے لئے بھیڑ بکریوں کے ریوڑ اور گھوڑوں کے گلے اور غلاموں اور کنیزوں کے دستے جمع کیا کرتے تھے' ابوذرؓ تھے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تھا۔ ان کے پاس امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ خلیفۂ ثالث نے ہر کوشش کر ڈالی کہ اس زبان کو بند کر دیں جو ان کے لئے سیکڑوں تلواروں سے زیادہ نقصاندہ تھی' لیکن ایسا نہ کر سکے۔ انہیں شام میں جلاوطن کر دیا' زبان بند نہ ہوئی۔ بلا کر مارا پیٹا' پھر بھی زبان بند نہ ہوئی۔ خلیفہ کا ایک غلام تھا' اُسے رقم کا تھیلا دے کر کہا کہ رقم کا یہ تھیلا ابوذر کو دے دو' اگر تم انہیں ہم سے یہ رقم لینے پر راضی کر لو تو ہم تمہیں آزاد کر دیں گے۔ چرب زبان غلام ابوذرؓ کے پاس آیا' ہر جتن کر ڈالا' ہر منطق استعمال کر لی۔ ابوذرؓ نے کہا: پہلے یہ بات واضح ہونی چاہئے کہ تم مجھے کس بات کے پیسے دے رہے ہو؟ اگر مجھے میرا حصہ دینا چاہتے ہو' تو دوسروں کا حصہ کیا ہوا؟ کیا تم دوسروں کا حصہ دے رہے ہو' جواب میرا حصہ مجھے دینا چاہتے ہو؟ اور اگر یہ دوسروں کا حصہ ہے' تو یہ چوری ہے' اور اگر میرا حصہ ہے' تو پھر دوسروں کا حصہ کہاں ہے؟ اگر دوسروں کا حق دے رہے ہو' تو میرا حق بھی دے دو' میں لے لوں گا۔ لیکن صرف مجھے کیوں دینا چاہتے ہو؟ اس نے ہر کوشش کر دیکھی لیکن ابوذرؓ راضی نہ ہوئے۔ آخر میں اس غلام نے ایک دینی اور مذہبی راستہ اختیار کیا اور بولا: اے ابوذرؓ! کیا آپ کا دل نہیں چاہتا کہ ایک غلام آزاد ہو جائے؟ بولے: کیوں نہیں' میرا دل بہت چاہتا ہے۔ کہنے لگا: میں خلیفہ کا غلام ہوں' خلیفہ نے مجھ سے طے کیا ہے کہ اگر آپ یہ رقم لے لیں گے' تو وہ مجھے آزاد کر دے گا۔ صرف میری آزادی کی خاطر یہ رقم لے لیجئے۔ یہ پیسے لے لیجئے' اپنے لئے نہیں' بلکہ اس لئے کہ میں آزاد ہو جاؤں۔ بولے: میرا بہت دل چاہتا ہے کہ تم آزاد ہو جاؤ لیکن مجھے انتہائی افسوس ہے کہ اگر میں نے یہ پیسے لے لئے' تو تم تو آزاد ہو جاؤ گے لیکن میں خلیفہ کا غلام بن جاؤں گا۔

پیغمبر اکرمؐ

علی الوردی کا کہنا ہے کہ: حضرت علی علیہ السلام کی عملی زندگی نے اس نظریئے کو جھوٹا ثابت کیا ہے۔ ہم عرض کرتے ہیں کہ: نہ صرف حضرت علی علیہ السلام کی زندگی نے اس نظریئے کو جھٹلایا ہے' بلکہ حضرت علیؑ سے پہلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی نے اسے کھوکھلا ثابت کیا ہے۔ شعب ابی طالب کے پیغمبر کو دیکھئے اور روز وفات والے پیغمبر کو دیکھئے۔ شعب ابی طالب کے پیغمبرؐ آپ ہیں اور آپ کے اصحاب کی ایک قلیل تعداد جو ایک درّے میں محبوس ہیں' پانی' خوراک اور دوسری ضروریات ان تک نہیں پہنچتیں۔ یہ ایام ان کے لئے اتنے سخت ہیں کہ مکہ میں اپنے اسلام کو مخفی رکھنے والے کچھ مسلمانوں نے شعب میں موجود بعض مسلمانوں' بالخصوص حضرت علیؑ کے ساتھ (رابطہ قائم کیا ہوا تھا اور وہ) رات کی تاریکی میں خفیہ طور پر جاتے اور کچھ خوراک لے کر آیا کرتے تھے اور ہر مسلمان بس صرف بھوک مٹانے کے لئے تھوڑی تھوڑی غذا کھایا کرتا تھا۔ یہی پیغمبرؐ بعد میں سن دس ہجری میں پہنچتے ہیں۔ سن دس ہجری میں دنیا کی حکومتیں ان کو اہمیت دینے لگتی ہیں' اور اُن سے خطرہ محسوس کرتی ہیں' نہ صرف پورا جزیرۃ العرب ان کے زیر اثر ہوتا ہے اور وہ ایک طاقت بن جاتے ہیں' بلکہ دنیا کے سیاستدان یہ پیش گوئی کرتے ہیں کہ یہ قدرت عنقریب جزیرۃ العرب سے باہر نکل کر اُن کی طرف رُخ کرے گی۔ اس حال میں بھی' سن دس ہجری کے پیغمبرؐ بعثت کے دسویں سال کے پیغمبرؐ سے جب وہ شعب ابی طالب سے باہر آئے تھے' نفسیاتی لحاظ سے ذرہ برابر مختلف نہ تھے۔

تقریباً سن دس ہجری میں جبکہ بہت زیادہ آمدورفت تھی' اور پیغمبر اکرمؐ کی شہرت ہر جگہ پھیل چکی تھی' ایک عرب بدو آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ اور جب وہ آپ سے بات کرنا چاہتا ہے' تو اُن چیزوں کی بنا پر جو اُس نے سن رکھی تھیں' اُس پر پیغمبر اسلام کا رعب طاری ہو جاتا ہے' اسکی زبان میں لکنت آ جاتی ہے۔ آنحضرت کو یہ صورتحال ناگوار گزرتی ہے۔ مجھے دیکھ کر اسکی زبان میں لکنت آ گئی؟! آپ فوراً اسے اپنی بانہوں میں لے لیتے ہیں اور اسے اسقدر بھینچتے ہیں کہ اُن کا بدن

اس کے بدن سے مس ہو جائے۔ {اور فرماتے ہیں} بھائی اَھْوِنْ عَلَیْکَ. اطمینان سے بات کرو۔ کس بات کا ڈر ہے؟ جیسا تم سمجھ رہے ہو میں اُن جابروں میں سے نہیں ہوں۔ لَسْتُ بِمَلَکٍ. میں اس عورت کا بیٹا ہوں جو اپنے ہاتھوں سے بکری کا دودھ دوہتی تھی۔ میں تمہارے بھائی کی طرح ہوں۔ جو تمہارا دل چاہے بولو۔

کیا یہ حالت' یہ قدرت' یہ اثر و نفوذ' یہ وسعت اور یہ وسائل پیغمبر کی روح میں ذرہ برابر تبدیلی لا سکے؟ ہرگز نہیں! ہم نے عرض کیا کہ صرف پیغمبرؐ ہی ایسے نہ تھے' پیغمبرؐ اور علیؑ کا مقام تو ان باتوں سے کہیں بڑھ کر ہے' ہمیں سلمان' ابوذر' عمار' اویس قرنی جیسے افراد اور ان جیسے سیکڑوں لوگوں کو دیکھنا چاہیے۔

شیخ انصاریؒ

اور آگے بڑھتے ہیں' چلتے ہیں شیخ انصاریؒ جیسے لوگوں کی طرف۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ایسا شخص جو تمام شیعوں کا مرجع کل بن جاتا ہے۔ جس وقت اُن کا انتقال ہوتا ہے' اُس وقت اُن کی حالت اُس حالت سے بالکل مختلف نہ تھی جب وہ دزفول کے ایک غریب طالبِ علم کی حیثیت سے نجف اشرف گئے تھے۔ جب اُن کے گھر جا کر دیکھتے ہیں' تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ غریب ترین انسان کی طرح زندگی گزارتے ہیں۔ ایک شخص اُن سے کہتا ہے کہ جناب بہت بڑی بات ہے' اتنی شرعی رقوم آپ کے پاس آتی ہیں اور آپ اُنہیں ہاتھ تک نہیں لگاتے۔ آپ اُس سے کہتے ہیں: اس میں کیا بڑی بات ہے؟ لوگوں نے کہا: اس سے بڑھ کر اور کیا بڑی بات ہوگی! وہ کہتے ہیں: میں زیادہ سے زیادہ جو کام کرتا ہوں وہ کاشان کے گدھا گاڑی والوں کا سا ہے جو اصفہان آتے جاتے ہیں۔ کاشان کے ان گدھا گاڑی والوں کو رقم دی جاتی ہے کہ جاؤ اصفہان اور وہاں سے فلاں چیز خرید کر کاشان لے آؤ' کیا تم نے کبھی انہیں لوگوں کے مال میں خیانت کرتے دیکھا ہے؟ میری حیثیت ایک امین کی سی ہے' مجھے (لوگوں کے مال کو ہاتھ لگانے کا) حق حاصل نہیں ہے۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے' جو تمہیں بڑی محسوس ہو رہی ہے۔ مرجعیت کا اتنا بڑا مقام اُس عظیم انسان کی

روح پر ذرہ برابر اثر انداز نہیں ہو سکا۔

پس ہم اس مسئلے کو کہاں سے پتا کر سکتے ہیں کہ انسان عملی منطق میں ایک مستقل اور یکساں منطق کا مالک ہو سکتا ہے اور اس میں تبدیلی واقع نہیں ہو سکتی۔ ہمیں چاہیے کہ ہم لوگوں کا مطالعہ کریں۔ مارکس غلطی کا مرتکب ہوا ہے' اس کے مطالعات ناقص تھے۔ اس نے مروان بن حکم' طلحہ و زبیر (جن کا تعلق تاریخ اسلام سے ہے) اور دنیا میں رہنے والے ان جیسے ہزاروں لوگوں کا مطالعہ کیا تھا۔ اس نے بااصول لوگوں کا مطالعہ کئے بغیر اس قسم کی باتیں کی ہیں۔ اگر اس نے بااصول لوگوں کا مطالعہ کیا ہوتا' تو ہرگز ایسی باتیں نہ کرتا۔

پس یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا میں {ہر حال میں} ایک ہی سیرت اور عملی منطق رکھنے والے افراد موجود ہیں اور ایسے افراد کے درمیان پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سرفہرست مقام حاصل ہے۔ ان افراد کے پاس کچھ معیارات اور پیمانے ہوتے ہیں' جن کی وہ کسی صورت خلاف ورزی نہیں کرتے۔ یعنی معاشرتی حالت' اقتصادی صورتحال اور طبقاتی مقام ان اصولوں کو ان سے چھیننے پر قادر نہیں ہوتے۔

برہان اور شعر

منطقِ نظری میں ہمارے پاس برہان بھی ہیں اور شعر بھی۔ برہان اُن دلائل کی مانند ہوتے ہیں جنہیں ریاضیات میں کسی نکتے کے لئے قائم کیا جاتا ہے۔ ایک طالب علم جو ریاضی پڑھ رہا ہے' اور مثلاً اسکے لئے مثلث کے احکام بیان کئے جا رہے ہیں' تو جب کہتے ہیں کہ ایک مثلث کے زاویوں کا مجموعہ ۱۸۰ درجے کے برابر ہے اور اس کا ۱۸۱ یا ۱۷۹ درجے کے مساوی ہونا محال ہے' تو اس کے لئے برہان کا ذکر کرتے ہیں۔ جب برہان پیش کرتے ہیں' تو وہ دیکھتا ہے کہ یہ بالکل درست ہے۔

کیا ریاضی کے استاد کے پاس یہ طاقت ہے کہ اسے اختیار حاصل ہو کہ اگر ایک مرتبہ اس کا دل چاہے کہ اس بات پر برہان قائم کرے کہ مثلث کے زاویوں کا مجموعہ دو زاویہ قائمہ یعنی ۱۸۰

درجے کے برابر ہے' تو وہ اس پر برہان قائم کر دے اور ایک مرتبہ ایک اور برہان قائم کرے کہ مثلث کے زاویوں کا مجموعہ مثلاً ۱۲۰ درجے کے برابر ہوتا ہے۔

یہ اس کے اختیار میں نہیں ہے۔

عقلی نظری مبادی انسان کے اختیار میں نہیں ہیں۔ انسان کو ان کا تابع ہونا چاہئے۔ اگر آئن اسٹائن کو بھی دنیا میں لے آئیں اور وہ اس قسم کا برہان قائم کرنا چاہے' تو ایک عام طالبِ علم بھی اسے شکست دے سکتا ہے۔ کیوں؟ کیونکہ وہ غلط بات کر رہا ہے' اور غلط بات کو عقل قبول نہیں کرتی۔ جس چیز کو عقل قبول نہیں کرتی' دنیا کے طاقتور ترین افراد بھی اس کے برخلاف بات نہیں کر سکتے' کیونکہ برہان کا معاملہ ہے۔

اب چلتے ہیں شاعری کی طرف۔ شعر' یعنی ایک ایسی چیز جو موم کی طرح انسان کے اختیار میں ہے۔ انسان تشبیہ' استعارے اور تخیل کے ذریعے اپنی مرضی کے مطابق ہر چیز کے لئے ایک چیز بنا سکتا ہے۔ یہ شعر ہے' کوئی منطق و برہان تو نہیں ہے۔ مثلاً کسی شاعر سے کہیں کہ فلاں چیز کی تعریف کرو' وہ تعریف کرتا ہے۔ اسی سے کہیں کہ مذمت کرو' تو مذمت کرتا ہے۔ فردوسی ایک دن سلطان محمود سے خوش ہوتا ہے' تو اس کی تعریف کرتا ہے' اور تعریف بھی کیسی:

جہاندار محمود شاہ بزرگ

بہ آبشخور آرد ہمی میش و گرگ (۱)

ایک دن اس سے ناخوش اور رنجیدہ ہوتا ہے' تو کہتا ہے:

اگر مادر شاہ بانو بدی مرا سیم و زر تا بہ زانو بدی

ہمانا کہ شہ نانوا زادہ است بہای نانِ بہ من دادہ است (۲)

۱۔ عظیم بادشاہ محمود (غزنوی) ایسا (عادل) ہے جو بھیڑ اور بھیڑیے کو ایک گھاٹ پر پانی پلاتا ہے۔

۲۔ اگر بادشاہ کی ماں کوئی عظیم عورت ہوتی' تو آج میں گھٹنوں تک سونے چاندی میں ڈوبا ہوا ہوتا۔ لیکن چونکہ وہ نانبائی کی اولاد ہے اس لئے بچی ہوئی روٹی کی قیمت مجھے دے دی ہے۔

ایک شاعر سے کہیں کہ سفر کی تعریف کرو' تو کہے گا ہاں سفر اچھی چیز ہے' ایک جگہ رہنا کیا معنی رکھتا ہے؟!

درخت اگر متحرک بُدی زجای بہ جای
نہ جور ارہ کشیدی و نہ جفای تبر(۱)

یہ درخت جسے آپ دیکھتے ہیں کہ لوگ آ کر اس پر آری اور کلہاڑی چلاتے ہیں' یہ اسلئے ہے کہ یہ ایک جگہ پڑا ہوا ہے۔ اگر مسافر ہوتا تو ایسا نہ ہوتا۔ آپ اسی سے کہیں کہ اس کے برعکس کہو' اس بات کی تعریف میں شعر کہو کہ بہتر ہے کہ انسان اپنی جگہ پر رہے' متانت کے ساتھ جما رہے' ادھر اُدھر نہ دوڑے' تو وہ کہے گا ہاں' اس پہاڑ میں جو ایسی عظمت دکھائی دیتی ہے' اسکی وجہ یہ ہے کہ یہ اپنی جگہ پر ہے' لیکن یہ ہوا جس کی تم دیکھتے ہو کہ کوئی بھی پروا نہیں کرتا' اسکی وجہ یہ ہے کہ یہ ہمیشہ حرکت میں رہتی ہے۔ اس قسم کے شعر کہنا' یعنی تخیل کے ذریعے ایک چیز کو دوسری چیز سے تشبیہ دینا۔ غلط فہمی نہ ہو جائے: ہم اس شعر کی بات کر رہے ہیں' جو تخیل کے معنی میں ہے۔ ہم ہر نظم کو شعر نہیں کہتے' ہم منظوم کلام کی بات نہیں کر رہے' اس کی بات کر رہے ہیں جو منطق کی اصطلاح میں شعر ہے۔ یعنی مسائل کا تخیل سے موازنہ کرنا۔ تخیل کا کوئی میزان اور معیار نہیں ہوتا۔

ایک شخص ایک بادشاہ کا دشمن تھا' اور مدتوں سے روپوشی کی زندگی بسر کر رہا تھا' یہاں تک کہ ایک دن وہ پکڑا گیا۔ بادشاہ نے اسے سولی پر چڑھا دیا اور اس کا بدن کافی عرصے تک سولی پر لٹکا رہا۔ ایک شاعر جو اس پھانسی پانے والے شخص کا مرید ہو گیا تھا' اُس نے اس کی مدح میں ایک قصیدہ کہا اور لوگوں کے درمیان منتشر کر دیا۔ کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ یہ قصیدہ کس نے کہا ہے۔ البتہ بعد میں معلوم ہو گیا۔ وہ ایک شعر میں کہتا ہے:

عُلُوٌّ فِی الْحَیاۃِ وَ فِی الْمَماتِ
لَعَمْرِی ذاکَ اِحْدَی الْمُحْکَماتِ

۱۔ اگر درخت ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کر سکتا' تو آری اور کلہاڑی کی تکلیف سے بچ جاتا۔

اس نے کہا: واہ واہ! وہ زندگی میں بھی بلند مقام پر رہا اور مر کر بھی بلند ہے۔

جس نے اسے سولی پر چڑھایا تھا اُس نے کہا: میرا دل چاہتا ہے کہ کوئی مجھے سولی پر چڑھا دیتا اور پھر میری تعریف میں یہ شعر کہتا۔

بالآخر شعر ہے' ہر طرح سے کہا جا سکتا ہے۔

لوگوں کی منطقِ عملی کا بھی یہی حال ہے۔ بعض اپنی منطقِ عملی میں برہان کی طرح ہیں۔ یعنی مضبوط اور مستحکم۔ وہ جن اصول و مبانی کی پیروی کرتے ہیں' کوئی طاقت انہیں اُن سے نہیں ہٹا سکتی۔ محال ہے کہ قوت' لالچ' اجتماعی حالات' اقتصادی صورتحال' طبقاتی وابستگی (انہیں اُن کے اصولوں سے پیچھے ہٹا سکے۔)

برہانی اصولوں کی مانند محکم و مضبوط اصول' ریاضی کے اصولوں کی مانند جنہیں تبدیل کرنا انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔ من مانے اصول نہیں ہیں' ان کا تعلق جذبات و احساسات سے نہیں ہوتا۔ (یہ لوگ) ایسے مضبوط اصولوں کے مالک ہوتے ہیں۔ پیغمبرؐ یعنی وہ ہستی جو ایسے اصولوں کی مالک ہے' علیؑ یعنی وہ شخص جو ایسے اصولوں سے وابستہ ہے' حسینؑ یعنی وہ جو ایسے اصولوں کا مالک ہے۔ بلکہ ان کے پیروکار: سلمان یعنی وہ شخص جو ایسے اصول رکھتا ہے' ابوذر' عمار اور مقداد یعنی وہ لوگ جو ایسے اصولوں کے مالک ہیں' مرتضیٰ انصاری یعنی جو ایسے اصولوں کا مالک ہے۔

لیکن بعض لوگوں کی زندگی کا اصول ایک شاعر کے فکری اصولوں کی طرح ہوتا ہے۔ اس کی مٹھی گرم کر دیجئے' اسکے اصول تبدیل ہو جائیں گے۔ اس سے کوئی وعدہ کر لیجئے' اسکی سوچ تبدیل ہو جائے گی۔ کیونکہ اس کی فکر کی کوئی بنیاد اور اصول نہیں ہوتا۔

پس ایک اہم بات جسے ہمیں سیرتِ پیغمبرؐ کے مقدمے میں زیرِ بحث لانا چاہئے' یہ ہے کہ کیا مکتبِ اسلام ایک ایسا مکتب ہے' بھی یا نہیں کہ (جس کے مطابق) انسان ایسی فطرت' سرشت اور ساخت کا مالک ہے کہ جس طرح منطقِ نظری میں وہ آہنی اور ناقابلِ تغیر منطق کی پیروی کر سکتا ہے اسی طرح منطقِ عملی میں بھی اس درجے تک پہنچ سکتا ہے کہ اسے کوئی قدرت متزلزل نہیں کر سکتی:

"كَالْجَبَلِ الرَّاسِخِ لَا تُحَرِّكُهُ الْعَوَاصِفُ." (۱)

یہ جو ایمان کے باب میں کہا گیا ہے کہ مومن پہاڑ کی مانند ہوتا' جسے کوئی آندھی اپنی جگہ سے ہلانے کی طاقت نہیں رکھتی (یہ اسی معنی میں ہے)۔ یہ آندھیاں کیا ہیں؟ ایک یہی ہے۔ ایک شخص کو غربت اور محرومیت' تو دوسرے کو رفاہ و آسائش اپنی جگہ سے ہلا دیتی ہے۔

" وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللهَ عَلٰى حَرْفٍ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ وَ اِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ۨ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ خَسِرَ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةَ." (۲)

قرآنِ کریم کہتا ہے کہ بعض لوگ ایمان اور حق کے راستے پر اُس وقت تک چلتے ہیں جب تک اس راستے سے اُن کے مفادات بھی پورے ہو رہے ہوں' جوں ہی انہیں نقصان پہنچتا ہے' تو دین سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ یہ ایمان نہیں ہے۔

زہد کی تعریف

زہد کی تعریف میں نہج البلاغہ میں مولائے متقیان حضرت علی علیہ السلام کا ایک جملہ ہے اُس سے بہتر بات کہنا ممکن نہیں ہے۔ زہد کی تعریف ہمیں حضرت علی علیہ السلام سے سُننی چاہئے۔ فرماتے ہیں:

"اَلزُّهْدُ كُلُّهٗ بَيْنَ كَلِمَتَيْنِ مِنَ الْقُرْاٰنِ." (۳)

زہد کو قرآن کے دو جملوں میں بیان کیا گیا ہے (یعنی زہد سے مراد تقدس کے اظہار کے یہ خشک مظاہرے نہیں ہیں' زہد کا تعلق انسان کی روح سے ہے) جہاں سورۂ حدید میں ارشاد ہوتا ہے:

۱۔ {پہاڑ کی طرح راسخ کہ جسے آندھیاں ہلا بھی نہیں سکتیں۔}

۲۔ سورۂ حج ۲۲۔ آیت ۱۱ {اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کی عبادت ایک ہی رخ پر اور مشروط طریقے سے کرتے ہیں کہ اگر ان تک خیر پہنچتا ہے تو مطمئن ہو جاتے ہیں اور اگر کوئی مصیبت پڑ گئی تو دین سے پلٹ جاتے ہیں' یہ لوگ دنیا اور آخرت دونوں میں خسارے میں ہیں۔}

۳۔ نہج البلاغہ۔ کلمات قصار ۴۳۹

لِكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَ لَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰكُمْ. یہ کہ اگر ایک ایسے مرحلے پر پہنچ جاؤ جہاں تمہیں حاصل دنیا تم سے چھین لی جائے' تو تم غمگین نہ ہو' دنیا کا غم تمہیں اپنی گرفت میں نہ لے لے۔ اور اگر تمہارے پاس کچھ بھی نہ ہو اور اچانک تمہیں دنیا مل جائے' تو تمہارا حال یہ نہ ہو کہ تم خوشی سے پھولے نہ سماؤ۔ بالفاظِ دیگر اگر پوری دنیا تمہارے ہاتھ میں ہو اور وہ تم سے لے لی جائے' تب بھی تم ایسے ہی رہو جیسے تمہارے پاس کچھ تھا ہی نہیں' اور اگر تمہیں پوری دنیا دے دی جائے' تب بھی تم میں کوئی تبدیلی نہ آئے۔

حضرت علی علیہ السلام نے زہد کی وہ تعریف بیان کی ہے جسے مارکس جیسے لوگ انسان کے بارے میں تصور بھی نہیں کر سکتے۔ وہ لوگ کہتے ہیں کہ علیؑ نے زہد کی جو تعریف بیان کی ہے' محال ہے کہ انسان ایسا زاہد بن سکے۔ یعنی انسان ایسی اعلیٰ شخصیت کا مالک ہو جائے کہ طبقات اور مفادات سے بالاتر ہو جائے۔ لیکن مکتبِ اسلام اس بنیاد پر ہے۔ مکتبِ اسلام یا آج کی اصطلاح میں اسلامی ہیومنزم' اسلامی اصالۃ الانسان' سچا اسلامی انسان اسی بنیاد پر ہے کہ انسان زاہد بن سکتا ہے' البتہ وہ زاہد نہیں جسے ہم زاہد کہتے ہیں' بلکہ ایسا زاہد جس کی علیؑ نے تعریف کی ہے کہ: لِكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَ لَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰكُمْ.

پس نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ سیرت یعنی منطقِ عملی' منطقِ نظری سے مختلف ہے' اور ممکن ہے کہ انسان اجتماعی' اقتصادی اور مختلف طبقاتی حالات کے باوجود ایک مستقل منطق کا مالک ہو۔ یعنی یہ اسلام کا نظریہ ہے اور اسلام کے سچے تربیت شدہ افراد نے بھی یہ دکھایا ہے کہ انسان ایسا ہو سکتا ہے۔

روش شناسی (methodology)

ہم عرض کر چکے ہیں کہ منطقِ عملی میں بھی منطقِ نظری کی طرح مختلف اسالیب اور مختلف انداز پائے جاتے ہیں۔ یعنی حل کی جو راہیں لوگ تلاش کرتے ہیں وہ مختلف ہوتی ہیں۔ بطورِ مثال ہم نے کہا تھا کہ ایک انسان کی منطق' طاقت کی منطق ہے' دوسرا محبت' اخلاق اور مہربانی کی منطق کا حامل ہے۔ تیسرے کی منطق دور اندیشی اور تدبیر ہے' چوتھے کی منطق سرعت' فوری فیصلہ اور

وقت ضائع نہ کرنا ہے۔ ایک اور انسان ہے جس کی منطق دھوکا اور فریب ہے۔ ایک کی منطق اپنے آپ کو مردہ ظاہر کرنا اور تغافل ہے‘ (ہم ان کی) مثالیں بھی بیان کر چکے ہیں۔ اب گفتگو کے اختتام پر صرف اس قدر عرض کریں گے کہ منطقِ نظری میں کچھ لوگ منطق قیاسی کے تابع ہیں‘ کچھ لوگ تجربی اور حسی منطق کے تابع ہو گئے اور کچھ لوگ اعداد و شمار (statistics) کی منطق کے۔

قیاسی‘ تجربیوں کا انکار کرتے تھے‘ تجربی حضرات قیاسیوں کی مخالفت کرتے تھے‘ اور صورتحال اسی طرح تھی۔ ابھی حالیہ دور میں ایک بہت اچھا کام یہ ہوا ہے کہ methodo logy) یعنی روش شناسی کا علم وجود میں آیا ہے۔ یہ علم کہتا ہے کہ جو لوگ قیاسی اسلوب کے قائل ہیں اور دوسرے اسالیب کی نفی کرتے ہیں‘ وہ غلطی پر ہیں۔ اور جو لوگ تجربی اسلوب کے قائل ہیں اور قیاسی اسلوب کا انکار کرتے ہیں‘ وہ بھی غلطی پر ہیں۔ اور جو لوگ ڈائلکٹک طریقے کے قائل ہیں اور اسٹیٹکس طریقے کے مخالف‘ وہ بھی غلطی پر ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ انسان مقام کو پہچانے‘ کہاں قیاسی اسلوب کا مقام ہے‘ کہاں تجربی اسلوب کا مقام ہے‘ اور کہاں کسی اور طریقے کا۔

یہ مقدمہ ہم نے اس لئے عرض کیا ہے کہ منطقِ عملی میں بھی ہو بہو یہی بات ہے۔ منطق نظری میں بعض اسالیب مکمل طور پر مسترد ہو چکے ہیں‘ کیونکہ وہ علمی اسلوب نہیں تھے‘ جیسے کہ انسان علمی مسائل میں دوسروں کی باتوں حتیٰ بزرگوں کی باتوں پر اعتماد کرنا چاہے اور مثلاً کہے کہ فلاں بات کیونکہ ارسطو نے کہی ہے اس لئے اس کے علاوہ کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ کسی بھی عالم کا کہا حجت نہیں ہے۔

سعد و نحس ایام

منطقِ عملی میں بھی بہت سے اسالیب سرے سے منسوخ ہیں‘ اسلام بھی انہیں منسوخ سمجھتا ہے۔ مثلاً کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے کاموں میں اور اپنے اسلوب اور روش میں سعد و نحس ایام سے استفادہ کیا کرتے تھے؟ یہ خود ایک مسئلہ ہے۔ ہم جائیں اور پیغمبر کی سیرت کا ابتدا سے انتہا تک جائزہ لیں‘ تمام کتابیں جو شیعوں اور سنیوں نے تاریخِ پیغمبرؐ پر لکھی ہیں‘ اُن کا مطالعہ

کریں اور دیکھیں کہ نبی اکرمؐ اپنی روش میں جن چیزوں سے استفادہ کیا کرتے تھے' کیا اُن میں سے ایک سعد و نحس ایام بھی تھے یا نہیں؟

مثلاً کیا وہ یہ کہا کرتے تھے کہ آج پیر کا دن ہے جو سفر کے لئے اچھا نہیں ہے' یا آج عیدِ نوروز کی تیرہ تاریخ ہے' جو آج کے دن گھر سے نہیں نکلے گا اس کی گردن ٹوٹ جائے گی' وہ بھی ایک نہیں تیرہ جگہوں سے؟! کیا ایسی باتیں {سیرتِ نبیؐ میں ملتی} ہیں؟ کیا حضرت علی علیہ السلام کی سیرت میں ہیں؟ کیا ائمہ علیہم السلام کی سیرت میں ہیں؟ ہمیں کہیں نظر نہیں آتا کہ پیغمبر اکرمؐ یا ائمہ اطہارؑ نے اپنے عمل میں ان باتوں سے ذرہ برابر استفادہ کیا ہو' بلکہ ہم اس کے برعکس دیکھتے ہیں۔ نہج البلاغہ میں ہے کہ جب حضرت علی علیہ السلام نے خوارج کے خلاف جنگ پر جانے کا فیصلہ کیا' تو اشعث بن قیس' جو اُس وقت حضرتؑ کے اصحاب میں شامل تھا' بھاگم بھاگ مولاؑ کے پاس آیا (اور بولا): اے امیر المومنینؑ! میری درخواست ہے کہ آپ کچھ دیر صبر کیجئے' ابھی روانہ نہ ہوئیے' کیونکہ میرا ایک رشتے دار' جو منجّم ہے' آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ فرمایا: اس سے کہو آجائے۔ وہ آیا اور بولا: یا امیر المومنینؑ! میں منجم اور سعد و نحس ایام کی شناخت کا ماہر ہوں' میں اپنے حساب سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر آپ ابھی جنگ کے لئے روانہ ہوئے' تو یقینی طور پر شکست سے دوچار ہوں گے اور آپ اور آپ کے اصحاب کی اکثریت ماری جائے گی۔ {امامؑ نے} فرمایا: جس کسی نے تیری تصدیق کی' اس نے پیغمبر کی تکذیب کی' یہ تم کیا بیہودہ باتیں کر رہے ہو؟! اے میرے اصحاب! سیروا علی اسم اللّٰہِ۔ (۱) اللہ کا نام لو' خدا پر اعتماد اور بھروسہ کرو اور روانہ ہو جاؤ۔ اس شخص کی رائے کے باوجود ہم ابھی اور اسی وقت روانہ ہوں گے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ علیؑ کو اس جنگ سے زیادہ کسی اور جنگ میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

یہ حدیث وسائل میں موجود ہے: عبد الملک بن اعین امام صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں' عبد الملک زُرارہ کے بھائی ہیں اور خود بھی ایک بڑے راوی اور عالم انسان

۱۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۷۷

ہیں انہوں نے علمِ نجوم پڑھا تھا اور اسی لئے وہ اس پر عمل کیا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ انہیں احساس ہونے لگا کہ انہوں نے اپنے لئے ایک مصیبت کھڑی کر لی ہے۔ مثلاً وہ گھر سے باہر نکلتے تو دیکھتے کہ آج قمر در عقرب ہے' اگر کہیں گیا تو یوں ہو جائے گا' ووں ہو جائے گا۔ ایک روز دیکھتے ہیں کہ فلاں ستارہ اُن کے آگے آ گیا ہے۔ رفتہ رفتہ اُن بیچارے کو احساس ہونے لگا کہ کلی طور پر اُن کے ہاتھ پاؤں بندھ گئے ہیں۔ ایک دن امام صادقؑ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا: یا بن رسول اللہ! میں نجومِ احکامی میں پھنس کے رہ گیا ہوں۔ (۱) میرے پاس اس موضوع پر کچھ کتابیں ہیں اور رفتہ رفتہ میں محسوس کر رہا ہوں کہ میں اس کا شکار ہو گیا ہوں' اصلاً پھنس کر رہ گیا ہوں۔ جب تک میں ان کتابوں میں دیکھ نہ لوں' کسی کام کے بارے میں فیصلہ نہیں کر سکتا۔ میں کیا کروں؟ امام صادقؑ نے تعجب کے ساتھ فرمایا: تم ہمارے اصحاب میں شامل ہو' تم ہماری روایات کے راوی ہو' تم ان چیزوں پر عمل کرتے ہو؟! {وہ بولے}: جی ہاں یا بن رسول اللہ۔ فرمایا: ابھی اسی وقت اٹھو' گھر جاؤ اور گھر پہنچتے ہی ان تمام کتابوں کو آگ لگا دو۔ پھر کبھی میں تمہیں ان میں سے ایک لفظ پر بھی عمل کرتے نہ دیکھوں۔

اس بارے میں موجود بعض روایات کے ساتھ ساتھ ہمارے پاس ان کے برعکس کچھ روایات ہیں جو تفسیر المیزان میں سورۂ فصلت کی ایک آیت: فِيٓ أَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ (۲) کے ذیل میں بیان ہوئی ہیں۔ اہلِ بیتِ اطہارؑ سے پہنچنے والی روایات سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ امور یا تو یکسر غیر مؤثر ہیں یا اگر ان کا کوئی اثر ہے بھی' تو خدا پر توکل اور رسولِ اکرمؐ اور اہلِ بیتِ رسولؑ پر بھروسہ ان کے اثر کو زائل کر دیتا ہے۔ لہٰذا' ایک مسلمان' ایک سچا شیعہ' دورانِ عمل ان امور کی پروا نہیں کرتا۔ اگر سفر پر جانا چاہتا ہے' تو صدقہ دیتا ہے' خدا پر توکل کرتا ہے' اولیاء اللہ سے توسل

۱۔ نجومِ ریاضی نجومِ احکامی سے مختلف ہے۔ غلط فہمی نہ ہو جائے' ہمارے پاس علمِ نجوم کی دو قسمیں ہیں۔ نجومِ ریاضی یعنی چاند اور سورج گرہن وغیرہ کا حساب' یہ ریاضیات کا حصہ ہے۔ نجومِ احکامی غیر معتبر ہے۔

۲۔ سورۂ فصلت ۴۱۔ آیت ۱۶

کرتا ہے اور ان میں سے کسی چیز کی پروا نہیں کرتا۔ سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ آپ دیکھئے کہ کیا پیغمبرؐ اور ائمۂ اطہارؑ کی تاریخ میں ایک مرتبہ بھی ایسا اتفاق ہوا ہے کہ خود انہوں نے ان مسائل پر عمل کیا ہو؟!

''سیرت''، یعنی اس قسم کی چیزیں۔ کیا انہوں نے اپنی منطق عملی میں اس قسم کے امور سے استفادہ کیا ہے یا نہیں؟

خراسان میں ایک چیز معروف ہے جسے میں نے ایران کے بعض شہروں میں دیکھا ہے اور بعض میں نہیں۔ ہمارے استاد بزرگوار مرحوم حاج میرزا علی آقا شیرازی نے اس کی بنیاد سے ہمیں آگاہ کیا ہے کہ یہ کیا تھی اور کہاں سے پیدا ہوئی ہے؟ ہمارے گاؤں فریمان میں بہت زیادہ مشہور تھا اور شاید اب بھی ہے کہ کہتے تھے: اگر کوئی شخص کسی سفر پر نکل رہا ہے تو اگر اس موقع پر سب سے پہلے کوئی سیّد اس کے سامنے آ گیا تو یہ منحوسیت ہے اور وہ شخص یقیناً اس سفر سے واپس نہ لوٹے گا۔ لیکن اگر اس موقع پر اس کا سامنا کسی اجنبی شخص سے ہو گیا تو یہ سفر ایک مبارک سفر ہو گا۔ واقعاً لوگ اسی کے معتقد تھے۔ مرحوم حاج میرزا علی آقا شیرازی نے کہا: اس بات کی ایک بنیاد ہے: بنی عباس کے دور میں سادات (جو بیچارے روپوش اولادِ نبیؐ تھے) جس گھر میں نظر آتے تھے نہ صرف انہیں بلکہ اس پورے خاندان کو تباہ کر دیا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ لوگوں میں یہ سوچ پیدا ہو گئی کہ اس اعتبار سے سیّد منحوس ہوتے ہیں۔ یہ نحوستِ سیاسی ہے نہ کہ نحوستِ فلکی۔ یعنی جس گھر کے دروازے پر کوئی سیّد آیا وہ گھر تباہ ہو گیا۔ یہ سیاسی نحوست رفتہ رفتہ لوگوں کے ذہنوں میں نحوستِ تکوینی اور نحوستِ فلکی میں بدل گئی۔ بعد میں بنی عباس کے خاتمے کے بعد بھی عورتیں، بچے اور سادہ لوح لوگ یہی کہتے تھے کہ سیّد ہوتا ہی منحوس ہے، خاص طور پر سفر میں۔

خود میرے ساتھ بھی پیش آ چکا ہے۔ میں دوسری یا تیسری بار قم جا رہا تھا۔ جب ہم گھر سے نکل کر گھوڑے پر سوار ہوئے، کیونکہ دو فرسخ کے فاصلے پر ایک جگہ ہم دعوت پر مدعو تھے اور وہاں سے ہمیں گاڑی پر سوار ہو کے جانا تھا۔ کچھ دوست وداع کرنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ ہم نے بھی گھر میں والدہ مرحومہ اور دوسروں کو خدا حافظ کہا اور باہر آ گئے۔ دل چاہ رہا تھا کہ جلد از جلد

جائیں۔ گھوڑے پر سوار ہوا تو دیکھا کہ ایک سید آگے سے چلا آ رہا ہے۔ میں نے دل میں کہا کہ خدا کرے عورتوں کو یہ بات معلوم نہ ہو جائے' اگر انہیں معلوم ہو گیا تو مجھے جانے نہیں دیں گی۔ خدا سے یہ دعا کرتے ہوئے' میں ٹھہر گیا۔ وہ سید قریب پہنچ کر میرے گھوڑے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ وہ مجھ سے معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آپ جو اس گاؤں (جس کا نام رامان تھا) جائیں گے' تو کیا وہیں سے قم چلے جائیں گے یا واپس آئیں گے اور یہاں سے گاڑی میں سوار ہو کر جائیں گے؟ کہنے لگا: جناب انشاء اللہ اب تو آپ واپس نہیں آئیں گے۔ میں نے کہا: نہیں' انشاء اللہ واپس نہیں آؤں گا۔ میں نے دل میں کہا کہ اگر یہ بات عورتوں کے کانوں تک پہنچ گئی کہ سید سامنے آ گیا ہے اور اس نے یہ بھی کہا ہے کہ انشاء اللہ اب واپس نہیں آؤ گے' تو محال ہے کہ وہ مجھے جانے دیں۔ لیکن میں گیا اور واپس آیا اور آج آپ کے ساتھ گفتگو کر رہا ہوں۔ اس بات کو تیس سال کا عرصہ بھی گزر چکا ہے۔

ایک مسلمان کو اس قسم کی باتوں سے اپنے ذہن کو نہیں الجھانا چاہئے۔ توکل آخر کس لئے ہے؟ ہم توکل اور توسل کا دم بھی بھرتے ہیں اور کالی بلی سے بھی ڈرتے ہیں۔ جو انسان توکل کی بات کرتا ہے اور خاص طور پر توسل اور ولایت کی بات کرتا ہے' اسے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ جو شخص ولایت کی بات کرتا ہے' اُس سے کہئے کہ اگر توسل کے قائل ہو' تو ان بے معنی باتوں پر اعتماد نہ کرو۔ پس ان میں سے ہر ایک خود ایک اصول ہے۔ دھوکا و فریب' اور توہمات سے کام لینا سیرتِ پیغمبرؐ میں جائز نہیں ہے۔ باسمک العظیم الاعظم الاجلّ الاکرم یا اللّٰہ...

پروردگار! ہمیں اسلام اور قرآن کا قدردان قرار دے۔ اپنی معرفت اور محبت کے نور سے ہمارے قلوب کو منور کر دے۔ ہمارے دلوں میں اپنے پیغمبرؐ اور اُن کی آل کی محبت اور معرفت جاگزیں فرما۔ ہماری جائز حاجات کو بر لا۔ ہمارے مرحومین کو اپنی رحمت اور عنایت میں شامل فرما۔

و عجّلْ فی فرج مولانا صاحب الزمان.

☆☆☆

تیسری نشست

سیرت اور اخلاق کی نسبیت

سیرت اور اخلاق کی نسبت

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ رب العٰلمین باریٔ الخلائق اجمعین. و الصلوٰۃ و السلام علیٰ عبد اللّٰہ ورسولہ و حبیبہ و صفیہ و حافظ سرّہ و مبلّغ رسالاتہ سیّدنا و نبیّنا و مولانا ابی القاسم محمد و آلہ الطیبین الطاہرین المعصومین. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم:

"لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ لِّمَنْ کَانَ یَرْجُوا اللّٰہَ وَ الْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَکَرَ اللّٰہَ کَثِیْرًا" (۱)

وہ گفتگو جسے ہم نے اس سے پہلے اس بارے میں پیش کیا تھا کہ کیا ایک انسان کے لئے ممکن ہے کہ وہ مختلف زمانی' مکانی اور اجتماعی حالات میں اور مختلف طبقات سے تعلق رکھنے کے باوجود مستقل معیارات اور مستقل عملی منطقوں کا مالک ہو سکے' یہ (گفتگو) اس لئے ضروری تھی کہ جو

۱۔ سورۂ احزاب ۳۳۔ آیت ۲۱

کچھ ہم نے کہا ہے' اگر اسکے علاوہ کچھ اور ہو' تو بنیادی طور پر (قرآن کی اصطلاح میں) اسوے کی بحث' یعنی یہ بحث کہ ہم ایک انسانِ کامل کو اپنا امام اور پیشوا قرار دیں اور اس کی زندگی سے شناسائی حاصل کریں لامحالہ ایک بے معنی بحث ہو جائے گی۔

ایک انسان نے چودہ سو سال پہلے ایک خاص منطق کے تحت عمل کیا ہے' میرے وہ حالات نہیں ہیں' وہ بھی میرے جیسے حالات میں نہیں تھا' اور ہر حالت اپنے لئے ایک مخصوص منطق کا تقاضا کرتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ کوئی شخص نمونہ عمل نہیں ہو سکے گا۔

ہم نے اس بات کا جواب دینے ہی کے لئے پچھلی گفتگو چھیڑی تھی' اور اگر خداوند متعال نے توفیق دی' تو انشاء اللہ آئندہ کی جانے والی گفتگوؤں میں بھی ہمارا دل چاہتا ہے کہ اس بات پر مزید زور دیں۔ کیونکہ ہمارے دور میں ایک مسئلہ بیان کیا جا رہا ہے' اور کیونکہ اسے درست طور پر سمجھا نہیں گیا ہے' اس لئے بعض غلط چیزوں کے رواج پا جانے کا سبب بن گیا ہے۔ یہ مسئلہ نسبیت اخلاق کا مسئلہ ہے۔ یعنی یہ کہ کیا انسانی معیارات' {یعنی} یہ کہ کیا چیز اچھی ہے اور کیا چیز بری' اچھا ہے کہ انسان ایسا ہو اور اچھا ہے کہ انسان ایسا نہ ہو' ایک نسبی (comparative) امر ہے یا مطلق (absolute) امر؟ اگر یہ مسئلہ کثرت کے ساتھ آج کی تحریروں میں' کتابوں میں' مقالوں میں' اخباروں میں' مجلوں میں زیرِ بحث نہ ہوتا' تو ہم اس کا ذکر نہ کرتے' لیکن کیونکہ بہت زیادہ زیرِ بحث ہے' اسلئے ضروری ہے کہ ہم بھی اس پر بات کریں۔

کیا اخلاق نسبی ہے؟

بعض لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اخلاق کلی طور پر نسبی (comparative) ہے۔ یعنی اچھے اور برے اخلاق کے معیار نسبی ہیں' بالفاظِ دیگر انسان ہونا ایک نسبی امر ہے۔ کسی چیز کی نسبیت کے معنی یہ ہیں کہ وہ چیز مختلف زمان و مکان میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ ایک چیز ایک زمانے اور ایک خاص حالت میں اخلاقی اعتبار سے اچھی ہوتی ہے' اور وہی چیز کسی اور زمانے اور کسی اور حالت میں خلافِ اخلاق ہوتی ہے۔ ایک چیز خاص احوال و ظروف (circumstances) میں انسانی

ہوتی ہے اور وہی چیز دوسرے حالات وشرائط میں خلافِ انسانیت بن جاتی ہے۔ یہ ہیں نسبیتِ اخلاق کے معنی جس کا ذکر آج بہت سی زبانوں پر ہے۔

ایک نکتہ ہے جس کے بارے میں وضاحت ہم ابھی اصل مدعا بیان کرنے کے بعد کریں گے' اور وہ (نکتہ) یہ ہے کہ اخلاق کے بنیادی اصول' انسانیت کے بنیادی معیار کسی صورت نسبی نہیں ہیں' مطلق (absolute) ہیں' لیکن ثانوی معیارات نسبی ہیں' اور اسلام میں بھی ہم اس مسئلے کا سامنا کرتے ہیں اور سیرتِ نبویؐ کے بارے میں ہم جو یہ بحث کررہے ہیں' وہ تدریجاً اس نکتے کی وضاحت کرے گی۔

ہم سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں (۱) کچھ ایسے اصولوں کا مشاہدہ کرتے ہیں جو باطل اور بیکار اصول ہیں۔ یعنی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی سیرت' اپنی روش اور اپنی عملی منطق میں کبھی اور کسی بھی صورت میں ان اصولوں سے استفادہ نہیں کیا ہے' اسی طرح دوسرے ائمہؑ نے بھی ان اصولوں اور معیارات سے استفادہ نہیں کیا ہے۔ اسلام انہیں ہر حالت' ہر زمان اور ہر مکان میں بُرا سمجھتا ہے۔

شیعوں کا سرمایہ

ہم شیعوں کے پاس ایک سرمایہ ہے' جس سے اہلِ تسنن محروم ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ اُن کے پاس معصوم کا دور' یعنی ایک ایسا دور جس میں ایک معصوم ہستی موجود ہو' جس کی سیرت سے بے کھٹک استفادہ کیا جاسکے ۲۳ سال سے زیادہ نہیں ہے۔ کیونکہ وہ صرف پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معصوم سمجھتے ہیں۔ یہ بات صحیح ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے ان ۲۳ برسوں میں مختلف حالات کے ساتھ زندگی بسر کی اور سیرتِ نبیؐ میں مختلف حالات کے لئے بہت سے اسباق موجود ہیں۔ لیکن ہم

۱۔ واضح رہے کہ جب ہم سیرتِ رسولؐ کہتے ہیں' تو یہ نہ کہیں کہ سیرتِ امام حسینؑ بھی ایسی ہی ہے' سیرتِ علیؑ بھی ایسی ہی ہے۔ ہاں ایسی ہی ہے' لیکن ہم فی الحال ذاتِ رسولِ اکرمؐ کے حوالے سے بات کررہے ہیں' وگرنہ ان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

شیعوں کے پاس یہ ۲۳ برس بھی ہیں اور ان کے علاوہ مزید تقریباً دو سو پچاس سال اور بھی ہیں۔ یعنی ہمارے پاس مجموعی طور پر تقریباً دو سو تہتر سال پر مشتمل دورِ عصمت موجود ہے اور ہم سیرتِ معصومؑ سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ بعثتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے سے لے کر امام حسن عسکری علیہ السلام کی وفات کے زمانے تک' یعنی سن دو سو ساٹھ ہجری تک۔ ہجرت کے دو سو ساٹھ سال بعد غیبتِ صغریٰ کی ابتدا ہوتی ہے' جس میں عام لوگ امامِ معصوم تک دسترس نہیں رکھتے تھے۔ یہ دو سو ساٹھ سال اور بعثت سے ہجرت تک کے مزید تیرہ سال' شیعوں کے لئے عصمت کا دور ہے۔ ان دو سو تہتر برسوں میں حالات کئی طرح سے تبدیل ہوئے اور ان تمام ادوار میں (کوئی نہ کوئی) معصوم ہستی موجود تھی' اس لئے ہم مختلف حالات میں درست روش تلاش کر سکتے ہیں۔ مثلاً امام جعفر صادق علیہ السلام' بنی عباس کے دور میں بھی تھے' جبکہ بنی عباس کے دور جیسے کسی دور سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سامنا نہیں ہوا تھا۔ اس وجہ سے ہمارے پاس زیادہ اور جامع سرمایہ موجود ہے۔

مسترد شدہ اصول

الف: دھوکا دھی کا اصول:

بعض اصولوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لے کر امام حسن عسکری علیہ السلام تک' سب نے انہیں مسترد کیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ وہ قطعی اور حتمی معیارات ہیں جن کی ہر صورت میں نفی کی جانی چاہئے۔

وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ اخلاق مطلقاً نسبی ہے' ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ: مثلاً ایک معیار جس پر ممکن ہے لوگ اپنی سیرت میں کاربند ہوں' وہ دھوکا دہی اور فریب کاری کا اصول ہے۔ دنیا کے قریب قریب تمام ہی سیاستدان اپنے مقاصد کے حصول کے لئے دھوکے اور خیانت سے کام لیتے ہیں۔ بعض کی پوری سیاست دھوکے اور فریب پر مبنی ہوتی ہے اور بعض کم از کم کچھ جگہوں پر اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ یعنی کہتے ہیں کہ سیاست میں اخلاق بے معنی ہے' اسے ایک طرف رکھنا

چاہئے۔ ایک سیاستدان وعدہ کرتا ہے' عہد کرتا ہے' قسم کھاتا ہے۔ لیکن صرف اُس وقت تک اپنے عہد و پیمان اور قسم کا پابند رہتا ہے جب تک اس کا مفاد تقاضا کرتا ہے۔ جیسے ہی اس کے مفادات ایک جانب ہوتے ہیں اور عہد و پیمان دوسری طرف' فوراً اپنے عہد کو توڑ دیتا ہے۔ چرچل نے اُس کتاب میں جو اُس نے دوسری عالمی جنگ کے بارے میں لکھی ہے' اور جسے ایک زمانے میں ایران کے اخبارات شائع کرتے تھے اور میں نے اس کے کچھ حصے کا مطالعہ کیا ہے' اس میں جب وہ ایران پر اتحادیوں کے حملے کا ذکر کرتا ہے' تو کہتا ہے: ''اگرچہ ہم نے ایرانیوں کے ساتھ وعدہ کیا تھا' معاہدہ کیا تھا اور اس معاہدے کے مطابق ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔'' پھر خود ہی اپنے آپ کو جواب دیتا ہے' کہتا ہے: ''لیکن یہ معیارات' عہد اور ایفائے عہد' چھوٹے پیمانے پر تو ٹھیک ہے' جب دو افراد ایک دوسرے سے قول و قرار کرتے ہیں تو درست ہے' لیکن سیاست میں' جب ایک قوم کے مفادات کا معاملہ آتا ہے' تو اس موقع پر یہ باتیں بیکار ہیں۔ میں اس اعتبار سے کہ یہ کام خلافِ اخلاق ہے' اور کیونکہ ہم نے ایک دوسرے ملک کے ساتھ معاہدہ کیا ہے اور عہد شکنی انسانی اصولوں کے منافی ہے' برطانیائے عظمیٰ کے مفادات سے چشم پوشی نہیں کرسکتا تھا۔ یہ باتیں دراصل بڑے پیمانے پر اور وسیع دائرے میں درست نہیں ہوتیں۔'' یہ وہی دھوکے اور فریب کا اصول ہے' یہ وہی اصول ہے جو معاویہ اپنی سیاست میں روا رکھا کرتے تھے۔ جو چیز علیؑ کو دنیا کے دوسرے سیاستدانوں سے ممتاز کرتی ہے (البتہ پیغمبر اکرمؐ جیسے افراد کو چھوڑ کر) وہ یہ ہے کہ وہ اپنی روش میں دھوکا دہی اور فریب کاری کے اصول کی پیروی نہیں کرتے تھے' خواہ ان کا سب کچھ' حتیٰ اُن کی خلافت بھی اُن کے ہاتھ سے چلی جائے۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ کہتے تھے کہ میں اِن اصولوں کا محافظ ہوں' میری خلافت کا مقصد ان انسانی اصول کی حفاظت ہے' سچائی کی حفاظت ہے' امانت کی حفاظت ہے' ایفائے عہد کی حفاظت ہے' درست کاری کی حفاظت ہے۔ اور میں ان کے لئے خلیفہ ہوں۔ لہٰذا میں کس طرح انہیں اپنی خلافت پر قربان کردوں؟! میری خلافت انہی کے لئے ہے' کیسے ممکن ہے کہ میں انہیں اپنی خلافت پر فدا کردوں؟!

نہ صرف حضرت علیؑ نے خود اس پر عمل کیا' بلکہ جو فرمان انہوں نے مالک اشترؒ کے نام تحریر کیا

اُس میں بھی اسی فلسفے کو بیان کیا ہے۔ مالک اشترؒ سے فرماتے ہیں: اے مالک! جس کسی کے ساتھ معاہدہ کرنا' خواہ وہ کافر حربی ہی کیوں نہ ہو' اپنے معاہدے کو نہ توڑنا۔ جب تک وہ اپنے معاہدے پر قائم ہیں تم بھی قائم رہو۔ البتہ جب وہ توڑ دیں' تو پھر معاہدہ ہی باقی نہیں رہا۔ (قرآنِ مجید بھی کہتا ہے: فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ. (۱) یہ اُن مشرکین اور بت پرستوں کے بارے میں ہے' جنہوں نے معاہدہ کیا تھا: جب تک وہ اپنے عہد پر قائم ہیں تم بھی قائم رہو اور اسے نہ توڑو۔ لیکن اگر وہ توڑ دیں' تو تم بھی توڑ دو)۔ فرماتے ہیں: اے مالک! جو بھی عہد و پیمان کرو' جس کسی کے ساتھ بھی کرو' اپنے جانی دشمن کے ساتھ' کفار کے ساتھ' مشرکین کے ساتھ' دشمنانِ اسلام کے ساتھ' اسے نہ توڑو۔ اسکے بعد وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اس لئے کہ انسان کی زندگی کی بنیاد انہی پر ہے۔ اگر یہ ٹوٹ جائیں اور ان کا احترام ختم ہو جائے' تو پھر کچھ بھی باقی نہیں بچے گا۔ (۲) بدقسمتی سے مجھے ہو بہو عبارت یاد نہیں ہے' وگرنہ حضرت علیؑ نے اس بات کو اس قدر خوب صورت انداز میں بیان کیا ہے' کہ اس سے بہتر بیان کیا ہی نہیں جا سکتا۔

اب وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ اخلاق بطورِ مطلق نسبی ہے' ہم اُن سے پوچھتے ہیں کہ کیا آپ ایک قائد کے لئے بھی دھوکے اور فریب کو ایک نسبی اصول سمجھتے ہیں؟ یعنی کیا آپ یہ کہتے ہیں کہ اسے ایک مقام پر خیانت کرنی چاہئے اور دوسرے مقام پر نہیں' بعض حالات میں دھوکا دہی اور خیانت کا اصول درست ہے اور بعض حالات میں نہیں؟ یا نہیں' دھوکا دہی اور خیانت کا اصول مطلقاً غلط ہے۔

ب: زیادتی:

زیادتی کے اصول کے بارے میں کیا خیال ہے؟ یعنی حد سے ایک قدم آگے بڑھ جانا' حتیٰ دشمن کے ساتھ بھی۔ دشمن کے مقابلے میں خواہ وہ مشرک ہی کیوں نہ ہو' اب جب کہ وہ دشمن ہے'

۱۔ سورۂ توبہ ۹۔ آیت ۷

۲۔ نہج البلاغہ۔ مکتوب ۵۳

مشرک ہے' ہمارے مسلک اور عقیدے کا مخالف ہے' تو اب کیا کوئی حد نہیں (جس کی پابندی کی جائے)؟ قرآن کہتا ہے کہ حد ہے' حتیٰ مشرک کے معاملے میں بھی حد ہے۔ کہتا ہے:

"وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا" (۱)

اے مسلمانو! ان کافروں کے ساتھ جنگ کرو' جو تمہارے ساتھ جنگ کرتے ہیں۔ لیکن وَلَا تَعْتَدُوْا (حد سے تجاوز نہ کرنا) یہاں تو بات ہی کافروں کی ہے۔ جب کفار اور مشرکین کے ساتھ بھی لڑو' تو حد سے باہر نہ نکلو۔ یعنی کس حد سے باہر نہ نکلو؟ اس بات کا ذکر تفسیروں میں کیا گیا ہے' فقہ بھی بیان کرتی ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی نصیحتوں میں (بیان کیا ہے) 'آپ جنگوں کے مواقع پر ہمیشہ نصیحت کیا کرتے تھے' حضرت علی علیہ السلام بھی جنگوں میں نصیحت کیا کرتے تھے (اور نہج البلاغہ میں بھی ہے) کہ جب دشمن گرا ہوا اور زخمی ہو اور مثلاً اس کا ہاتھ ہی نہ ہو کہ تمہارے ساتھ لڑ سکے' تو اب اس سے مطلب نہ رکھو۔ فلاں بوڑھے شخص نے جنگ میں شرکت نہیں کی ہے' اس سے مطلب نہ رکھو۔ ان کے بچوں سے مطلب نہ رکھو۔ ان پر پانی بند نہ کرو۔ وہ اعمال جو آج کل بہت عام ہیں (مثلاً زہریلی گیسوں کا استعمال) انہیں انجام نہ دو۔ اس زمانے میں زہریلی گیسیں نہیں تھیں' لیکن ان کا استعمال ان غیر انسانی اور خلافِ انسانیت کاموں کی طرح ہے' اور ایسے ہی ہے جیسے پانی بند کر دیا جائے۔ یہ باتیں حد سے تجاوز کرنا ہیں۔

حتیٰ دیکھئے کہ کفارِ قریش کے بارے میں قرآن کیا حکم دیتا ہے؟ یہ لوگ پیغمبرؐ کے جانی دشمن تھے' اور ایسے لوگ تھے جو نہ صرف مشرک' بت پرست اور دشمن تھے' بلکہ تقریباً بیس سال تک پیغمبرؐ سے لڑتے رہے تھے اور ان سے جو کچھ ہو سکتا تھا' انہوں نے اُس سے دریغ نہ کیا تھا۔ انہی لوگوں نے پیغمبرؐ کے چچا کو قتل کیا تھا' انہی نے پیغمبرؐ کے عزیزوں کو قتل کیا تھا' مکہ کے دور میں پیغمبرؐ کو' ان کے اصحاب کو اور اُن کے عزیزوں کو کس قدر تکلیفیں پہنچائی تھیں! انہی نے پیغمبرؐ کے دندانِ مبارک شہید کئے تھے' رسول کی پیشانی کو انہی نے زخمی کیا تھا۔ الغرض کوئی ایسا کام نہ تھا جو نہ کیا ہو۔ لیکن آخرکار

۱۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۱۹۰

فتح مکہ کا دور آتا ہے۔ سورۂ مائدہ پیغمبر اکرمؐ پر نازل ہونے والی آخری سورت ہے۔ کچھ دشمن باقی بچے ہیں لیکن اب طاقت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس سورے میں ارشاد ہوتا ہے:

"یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا .... وَ لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی"(۱)

مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ: اے صاحبانِ ایمان! ہم جانتے ہیں کہ تمہارے دل ان سے ناراضگی اور کدورت سے بھرے ہوئے ہیں' ان کی طرف سے تمہیں انتہائی دکھوں اور تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا تھا' لیکن کہیں یہ ناراضگیاں اس بات کا سبب نہ بن جائیں کہ تم حتیٰ ان دشمنوں کے بارے میں بھی عدالت کی حدود سے تجاوز کر جاؤ۔

یہ کیسا اصول ہے؟ (مطلق ہے یا نسبی؟) کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ بعض موقعوں پر حد سے تجاوز کرنا جائز ہے؟ نہیں' کسی بھی موقع پر حد سے تجاوز کرنا جائز نہیں۔ ہر چیز کا ایک پیمانہ اور حد ہوتی ہے' اس حد سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔

دورانِ جنگ حد سے تجاوز کرنا کیا ہے؟

ہم پوچھتے ہیں کہ آپ دشمن سے کیوں لڑتے ہیں؟ ایک مرتبہ آپ کہیں گے کہ اسلئے تاکہ اپنے دل کی بھڑاس نکال لیں۔ نہیں' یہ اسلامی طریقہ نہیں ہے۔ لیکن ایک مرتبہ آپ کہتے ہیں کہ میں دشمن سے اس لئے لڑ رہا ہوں تاکہ بشریت کے راستے سے ایک کانٹا دور کر دوں۔ ٹھیک ہے' اب جبکہ آپ نے کانٹا دور کر دیا' کافی ہے۔ وہ شاخ تو کانٹا نہیں ہے' اُس شاخ کو کیوں کاٹنا چاہتے ہیں؟! یہ ہیں حد کے معنی۔

ج: ظلم قبول کرنے اور رحم طلب کرنے کا اصول:

ظلم کے سامنے سر جھکا دینے اور رحم طلب کرنے کا اصول ان اصولوں میں سے ہے جن کی پیروی نہ پیغمبرؐ نے کی اور نہ وصی پیغمبرؐ نے۔ یعنی کیا ایسا ہوا ہے کہ کسی موقع پر جب دشمن کو طاقتور

۱۔ سورۂ مائدہ ۵۔ آیت ۸

دیکھا تو انہوں نے اِن دو میں سے کسی ایک طریقے کو استعمال کیا ہو؟ ایک یہ کہ رحم کی بھیک مانگی ہو، یعنی اپنی گردن جھکا دی ہو اور رحم کی درخواست کی ہو، رو ئے پیٹے ہوں کہ ہم پر رحم کرو؟

ہرگز نہیں۔

ظلم پذیری، یعنی ظلم کے سامنے سر جھکا دینا، اس بارے میں کیا رویہ تھا؟ یہ بھی کبھی نہیں کیا۔ یہ ان اصولوں میں سے ہیں جن پر نہ تو پیغمبر اکرمؐ نے، نہ اُن کے اوصیا نے، بلکہ اسی طرح اُن کے مکتب کے تربیت شدہ شاگردوں نے بھی کبھی عمل نہیں کیا۔

لیکن کچھ اصول ایسے ہیں جن سے ہمیشہ استفادہ کیا ہے، اگرچہ نسبی طور پر ہی سہی۔ یہ وہ مقام ہے جہاں بعض موقعوں پر نسبیت کا مسئلہ پیش آتا ہے۔

طاقت کا اصول اور طاقت کے استعمال کا اصول

ہمارے پاس ایک اصول ہے جس کا نام طاقت ہے، اور ایک دوسرا اصول بھی ہے جس کا نام طاقت کا استعمال ہے۔ طاقت کا اصول، یعنی طاقتور ہونے کا اصول۔ اس لئے طاقتور ہونا تاکہ دشمن ترنوالہ نہ سمجھے، دشمن پر حملے کے لئے طاقتور ہونا نہیں۔ قرآنِ مجید صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ:

"وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ" (۱)

طاقت کا اصول، مضبوط ہونے کا اصول، اس حد تک طاقتور ہونے کا اصول کہ دشمن حملہ کرنے سے ڈرے۔ تمام مفسرین نے کہا ہے کہ تُرْهِبُوْنَ سے مراد یہ ہے کہ دشمن حملہ کرنے کی ہمت نہ کرے۔

اب یہ کہ یہ اصول ایک مطلق اصول ہے یا نسبی اصول ہے؟ کیا اسلام اس اصول کو ایک خاص زمانے میں معتبر سمجھتا ہے یا تمام زمانوں میں؟ تمام زمانوں میں۔ جب تک دشمن ہے، طاقتور

۱۔ سورۂ انفال ۸۔ آیت ۶۰ {اور تم سب ان سے مقابلے کے لئے امکانی قوت اور گھوڑوں کی صف بندی کا انتظام کرو جس سے اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کو خوفزدہ کردو۔}

ہونے کا اصول بھی ہے۔

لیکن ایک اور اصول بھی ہے' جسے طاقت کے استعمال کا اصول کہتے ہیں۔ طاقت کا استعمال' طاقتور اور توانا ہونے سے ہٹ کر ایک الگ چیز ہے اور طاقت کے استعمال کے معنی میں ہے۔

کیا اسلام طاقت کے استعمال کو جائز اور روا سمجھتا ہے' یا نہیں؟

پیغمبر اکرمؐ اپنی سیرت میں طاقت کا استعمال کیا کرتے تھے' یا نہیں؟

{آپ طاقت کا} استعمال کیا کرتے تھے' لیکن نسبی طور پر۔ یعنی بعض موقعوں پر طاقت کے استعمال کی اجازت دیا کرتے تھے' اُن مواقع پر جہاں کوئی دوسرا راستہ باقی نہ بچا ہو۔ جیسے کہ کہا جاتا ہے: آخِرُ الدَّواءِ الکَیُّ. آخری دوا کے طور پر اجازت دیا کرتے تھے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی ایک تعبیر ہے۔

نہج البلاغہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام کا ایک جملہ ہے' یہ جملہ پیغمبر اکرمؐ کی سیرت کے ایک گوشے کو بیان کرتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں: طَبِیبٌ. پیغمبر لوگوں کے لئے ایک طبیب تھے۔ البتہ یہ بات واضح ہے کہ یہاں جسم کے طبیب مراد نہیں ہیں' {ایسا نہیں ہے کہ پیغمبر} لوگوں کو مثلاً گل گاؤزبان کا نسخہ دیا کرتے تھے' بلکہ مراد ہے روح کے طبیب' سماج کے طبیب۔ طَبِیبٌ دَوّارٌ بِطِبِّہِ. پہلی تشبیہ میں کہ جب پیغمبر کو طبیب سے تشبیہ دیتے ہیں' کہنا چاہتے ہیں کہ پیغمبر کی روش اپنے مریضوں کے ساتھ ایک معالج کی سی روش تھی۔

ایک معالج بیمار کے ساتھ کیا طرزِ عمل رکھتا ہے؟

اپنے مریض کے حوالے سے طبیب کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اس کے حال پر رحم کھاتا ہے۔ جیسا کہ خود حضرت علی علیہ السلام نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں:

"وَاِنَّمَا یَنبَغِی لِاَهلِ العِصمَةِ وَالمَصنُوعِ اِلَیهِم فِی السَّلَامَةِ اَن یَّرحَمُوا اَهلَ الذُّنُوبِ وَالمَعصِیَةِ." (۱)

۱۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۳۸

''جن لوگوں کو خدا نے پاک رہنے کی توفیق دی ہے' اُنہیں چاہئے کہ وہ بیمارانِ معصیت پر رحم کھائیں۔''

گناہ گار لوگ قابلِ رحم ہیں۔ {اس سے} کیا مراد ہے؟ کیا مراد یہ ہے کہ کیونکہ وہ لوگ قابلِ رحم ہیں اس لئے اُن سے کچھ نہ کہا جائے؟ یا نہیں {مراد یہ ہے کہ} مریض قابلِ رحم ہے' یعنی اس کو برا بھلا نہ کہو اور اس سے لاپروائی بھی نہ برتو' اس کا علاج کرو۔ پیغمبر اکرم کی روش علاج کرنے والے ایک طبیب کی سی روش تھی۔ البتہ آپ فرماتے ہیں: طبیب بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ ہمارے یہاں ساکن طبیب بھی ہوتا ہے اور متحرک (mobile) طبیب بھی۔ ایک طبیب نے اپنا مطب کھولا ہوا ہے' بورڈ بھی لگایا ہوا ہے' اور اپنے مطب میں بیٹھا ہوا ہے۔ جو کوئی وہاں اپنے علاج کی غرض سے اُسکے پاس آتا ہے' یہ اُس کو نسخہ دے دیتا ہے' اور جو کوئی اس کے پاس نہیں آتا' تو اسے بھی اس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ لیکن ایک طبیب' متحرک طبیب ہوتا ہے۔ وہ بس اسی بات پر اکتفا نہیں کرتا کہ مریض اس کے پاس آئیں {تو وہ اُن کا علاج کرے}' بلکہ وہ خود مریضوں کے پاس جاتا ہے' اور اُنہیں تلاش کرتا ہے۔ پیغمبرؐ خود اخلاقی اور روحانی مریضوں کو تلاش کرتے تھے۔ اپنی پوری زندگی آپ کا یہی کام رہا۔

آپ طائف کیوں گئے تھے؟

مسجد الحرام میں جو آپ کبھی اس کے پاس اور کبھی اُس کے پاس جایا کرتے تھے' قرآن کی جو تلاوت کیا کرتے تھے' کبھی اسے قریب لاتے تھے' کبھی اُسے دعوت دیتے تھے' بنیادی طور پر یہ سب کچھ کس لئے تھا؟

جب حرام مہینوں میں آپ کو تحفظ حاصل ہوتا تھا اور عرب قبیلے اپنے اُسی بت پرستانہ طریقے سے حج کرنے آیا کرتے تھے' جب وہ عرفات اور منیٰ میں اور خاص طور پر عرفات میں جمع ہوا کرتے تھے' تو پیغمبرؐ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے تھے اور اُن کے درمیان چلے جاتے تھے۔ ابولہب بھی آپ کے پیچھے پیچھے آجاتا تھا اور چیختا چلاتا تھا' کہتا تھا: اس کی باتیں نہ سنو' یہ میرے بھائی کا بیٹا ہے' میں جانتا ہوں کہ یہ (نعوذ باللہ) جھوٹا ہے' یہ دیوانہ ہے' یہ ایسا ہے' یہ ویسا ہے۔

لیکن آپ اپنا کام جاری رکھتے تھے۔ یہ کس لئے تھا؟ فرماتے ہیں: پیغمبر کی روش ایک طبیب کی سی روش تھی' لیکن متحرک طبیب کی سی' ایک ساکن طبیب کی سی نہیں جو صرف اپنی جگہ پر بیٹھ جاتا ہے کہ جو کوئی آ کر ہم سے سوال کرے گا' تو ہم اسے جواب دیں گے' اگر کسی نے نہیں پوچھا تو اسے بتانا ہماری ذمے داری نہیں ہے۔ نہیں' آپ ان باتوں سے بڑھ کر اپنی ذمے داری کے قائل تھے۔ ہماری روایات میں ہے کہ لوگوں نے دیکھا کہ حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام ایک بدکار عورت کے گھر سے نکل رہے ہیں۔ {یہ دیکھ کر} اُن کے مرید حیران رہ گئے: اے روح اللہ! آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ فرمایا: ''طبیب بیمار کے گھر جاتا ہے۔'' یہ بہت بڑی بات ہے۔

"طَبِیبٌ دَوّارٌ بِطِبِّہٖ' قَدْ اَحْکَمَ مَرَاھِمَہٗ وَاَحْمیٰ مَوَاسِمَہٗ." (۱)

حضرت علی علیہ السلام اسالیب اور سیرتوں کی نسبیت (comparative) کو یوں بیان کرتے ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کے ساتھ نرمی سے پیش آتے تھے یا سختی سے؟ لطف و مہربانی سے کام لیتے تھے یا درشتی اور طاقت سے؟

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: آنحضرتؐ دونوں طریقوں سے کام لیتے تھے' لیکن ہر طریقے کے موقع محل سے واقف تھے۔ آپ کے پاس مرہم بھی تھا اور میسم بھی (میسم' یعنی جراحی کا آلہ' داغنے کا آلہ)۔ یہ خود امیر المومنینؑ کے الفاظ ہیں: آنحضرتؐ کے ایک ہاتھ میں مرہم ہوتا تھا اور دوسرے ہاتھ میں میسم۔ جب آپ کسی زخم کا ایک نرم دوا سے علاج کرنا چاہتے تھے' تو اس پر مرہم رکھتے تھے۔ جہاں مرہم سے علاج ممکن ہوتا تھا' وہاں مرہم سے علاج کرتے تھے' لیکن جہاں مرہم کارگر نہیں ہوتا تھا' تو وہاں پھر خاموش ہو کر نہیں بیٹھ جاتے تھے' {یہ نہیں کہا کرتے تھے کہ} ٹھیک ہے' اب جبکہ میرا مرہم کارگر ثابت نہیں ہو رہا' تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دیتا ہوں۔ اگر

۱۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۰۶ {وہ ایک ایسے طبیب تھے جو اپنی حکمت اور طب کو لئے ہوئے چکر لگا رہا ہو' جس نے اپنے مرہم ٹھیک ٹھاک کر لئے ہوں اور داغنے کے آلات تپا لئے ہوں۔}

ایک خراب عضو کا مرہم سے علاج ممکن نہ ہو تو اسے داغنا چاہئے اور اس طرح سے اس کا علاج کرنا چاہئے۔ جراحی کے ذریعے اسے کاٹ ڈالنا چاہئے' جدا کر کے دور پھینک دینا چاہئے۔ پس کہیں طاقت کا استعمال' تو کہیں نرمی و مہربانی۔ دونوں کو اُن کی مناسب جگہ پر استعمال کیا کرتے تھے۔

پس طاقت کا اصول ایک الگ چیز ہے اور طاقت کا استعمال ایک دوسری چیز۔ اسلام کا یہ اصول ہے کہ اسلامی معاشرے کو دنیا کا طاقتورترین معاشرہ ہونا چاہئے' تاکہ دشمن اس کے سرمائے' اس کے منابع (resources)' اس کی سرزمینوں' اس کے لوگوں اور اس کی ثقافت پر میلی نگاہ نہ ڈال سکے۔ یہ کوئی نسبی اصول نہیں ہے' ایک مطلق اصول ہے۔ لیکن طاقت کا استعمال ایک نسبی اصول ہے' کہیں اس سے استفادہ کرنا چاہئے اور کہیں نہیں۔

زندگی میں سادگی اپنانے اور جاہ وحشم کے اظہار سے پرہیز کا اصول

ایک اور اصول جو ایک اعتبار سے مطلق ہے' اگرچہ اسے ایک اعتبار سے نسبی کہنا چاہئے' زندگی میں سادگی کا اصول ہے۔ زندگی میں سادگی کا انتخاب پیغمبر اکرمؐ کا ایک اصول تھا۔ پیغمبر اکرمؐ کی سیرت اور ان کے احوال کے بارے میں ہمارے پاس بہت سے ماخذ (sources) ہیں۔ ہم نے سیرت نبی کو حضرت علیؑ کی زبان سے سنا ہے' امام جعفر صادقؑ کی زبان سے سنا ہے' دوسرے ائمہؑ کی زبان سے سنا ہے' بہت سے صحابہؓ کی زبان سے سنا ہے' اس باب میں بالخصوص دو روایتیں ہیں' اور وہ روایت جو سب سے زیادہ مفصل ہے' وہ ہے جسے امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے اپنے سوتیلے ماموں سے روایت کیا ہے۔ شاید آپ نے کم ہی سنا ہوگا کہ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے ایک سوتیلے ماموں بھی تھے۔ آپ کے ان سوتیلے ماموں کا نام "ہند ابن ابی ہالہ" ہے۔ وہ پیغمبر اکرمؐ کے منہ بولے بیٹے تھے اور درحقیقت حضرت فاطمہؑ کے سوتیلے بھائی شمار ہوتے تھے' یعنی وہ رسولِ اکرمؐ سے قبل حضرت خدیجہؓ کے پہلے شوہر کے فرزند تھے۔ ہند' اسامہ بن زید کی طرح' جن کی ماں کا نام زینب بن جحش تھا' رسولِ اکرمؐ کے منہ بولے فرزند تھے۔ لیکن اسامہ ان سے چھوٹے تھے' اور انہوں نے پیغمبرؐ کے صرف مدینہ کے دور کو دیکھا تھا' لیکن ہند کیونکہ بڑے تھے اس لئے وہ

مکہ کے اُن تیرہ برسوں میں بھی پیغمبرؐ کے ہمراہ تھے اور مدینہ کے دس سال بھی آپ کے ساتھ تھے۔
حتیٰ پیغمبر اکرمؐ کے گھر میں رہتے اور حضورؐ کی اولاد کی طرح تھے۔ پیغمبر اکرمؐ کے حالات کی جزیات انہوں نے بیان کی ہیں اور امام حسنؑ نے (انہیں نقل کیا ہے)۔

ہماری روایات میں ہے کہ امام حسن علیہ السلام ابھی چھوٹے سے تھے' انہوں نے ہند سے فرمایا: ہند! تم نے میرے نانا نبی اکرم کو جس طرح دیکھا ہے اس طرح میرے لئے بیان کرو۔ ہند نے ننھے امام حسنؑ کے سامنے بیان کیا اور جو کچھ ہند نے بتایا تھا بالکل وہی امام حسنؑ نے دوسروں سے نقل کیا اور ہماری روایات میں موجود ہے۔ آپ لوگ اگر مطالعہ کرنا چاہیں تو تفسیر المیزان کی چھٹی جلد میں یہ جملے موجود ہیں' جو شاید تقریباً دو ورق یعنی چار صفحات پر مشتمل ہوں گے۔ انہوں نے اور ان کے علاوہ دوسروں نے بھی پیغمبر کی زندگی کی جزیات کو نقل کیا ہے۔ جن لوگوں نے پیغمبر اسلام کی حیات کا کچھ حصہ نقل کیا ہے' اُن افراد میں سے ایک آپ کے ایک مشہور صحابی ہیں' جو میرے خیال میں ابو سعید خُدریؓ ہوں گے۔ ایک جملہ جو تقریباً سب ہی نے کہا ہے' یہ ہے (لیکن یہ الفاظ اُن میں سے کسی ایک کے ہیں):

"كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّىٰ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ خَفِيفَ الْمَؤُونَة."

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زندگی کی ہر چیز میں سادگی کی روش اپنائی تھی۔ خوراک میں' پوشاک میں' مسکن میں' معاشرت میں اور لوگوں کے ساتھ میل جول میں آپ کی روش سادگی پر مبنی تھی۔ تمام خصوصیات میں سادگی اور کم مصرفی پر عمل کرتے تھے۔ اور یہ آپ کی زندگی کا ایک اصول تھا۔ پیغمبر اکرمؐ رعب ڈالنے کی روش (جو کہ بذاتِ خود ایک روش ہے) سے اجتناب کیا کرتے تھے۔ دنیا کے اکثر صاحبانِ اقتدار رعب ڈالنے کی روش سے استفادہ کرتے ہیں' اور بعض نے اس روش کو اس حد تک پہنچا دیا ہے کہ کہتے ہیں کہ کوئی تصور میں بھی نہ لائے۔

ایک کتاب جو چند برس پہلے "میلوان۔۔۔" نے لکھی تھی' اس میں' میں نے پڑھا (میں نے کسی اور تاریخ میں نہیں پڑھا ہے) کہ محمد خان قاچار جب کرمان میں تھا' اور اُس نے وہاں وہ قتلِ عام کئے' اتنے لوگوں کو اندھا کیا' اتنے کنویں پاٹ دیئے' اس قدر خرابکاری کی جس پر واقعاً

تعجب ہوتا ہے۔ ایک دن ایک سپاہی اسکے پاس آیا اور اس نے اُسے بتایا کہ فلاں سپاہی یا افسر آپ کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ اُس نے اس خبر کی تحقیق کا حکم دیا۔ تحقیق کے بعد پتا چلا کہ یہ خبر جھوٹ ہے۔ اس سپاہی اور اُس سپاہی یا افسر کے درمیان ایک لڑکی کی وجہ سے رقابت تھی۔ اُس سپاہی یا افسر نے اس لڑکی کو حاصل کر لیا تھا' اور اس نے انتقام لینے کے لئے یہ غلط رپورٹ دی تھی۔

فتح علی شاہ' جس کی عرفیت باباخان ہے' اُس زمانے میں اُس کا ولی عہد تھا (اس کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی' یہ اُس کا بھتیجا تھا) اُس نے فتح علی شاہ یعنی اُس وقت کے باباخان سے کہا: باباخان! جاؤ اس معاملے کی تحقیق کرو۔ وہ گیا اور تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ مسئلہ یوں ہے اور جھوٹا ہے۔ محمد خان نے پوچھا: تمہارے خیال میں اب ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ اس نے کہا: ظاہر ہے اس سپاہی نے جھوٹی اطلاع دی ہے' اس لئے اس کو سزا ملنی چاہئے۔ وہ بولا: جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ عدالت کی منطق میں تو درست ہے' لیکن سیاست کی منطق میں درست نہیں ہے۔ منطق عدالت کے لحاظ سے یہی بات درست ہے' اس نے غلطی کی ہے اور اسے سزا ملنی چاہئے۔ لیکن کیا تم نے یہ سوچا ہے کہ ان چند دنوں کے دوران' جن میں تم اس معاملے کی تحقیق کر رہے تھے' ہر طرف محمد خان قاچار کے قتل کی باتیں ہو رہی تھیں' ہر جگہ میرے قتل کی باتیں ہو رہی ہیں' یہ کہتا ہے تو قتل کرنا چاہتا تھا' وہ کہتا ہے میں قتل نہیں کرنا چاہتا تھا' گواہ آئے اور انہوں نے گواہی دی کہ نہیں قتل کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ان چند دنوں میں ان کے ذہنوں میں میرے قتل ہی کا تصور ہے' گواہوں کے ذہن میں ہے' ملزم کے ذہن میں ہے' الزام لگانے والے کے ذہن میں ہے۔ جن لوگوں نے چند دن اپنے ذہنوں میں مجھے قتل کرنے کا تصور رکھا ہو' وہ ایک دن مجھے قتل کرنے کا ارادہ بھی کر سکتے ہیں۔ اس لئے جن لوگوں نے چند دنوں تک مجھے قتل کرنے کا تصور اپنے ذہنوں میں رکھا ہے' ان کا زندہ رہنا قرین مصلحت نہیں ہے۔ میں نے حکم دے دیا ہے کہ ان سب کو' الزام لگانے والے کو' ملزم کو اور حتیٰ گواہوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا جائے' کیونکہ چند دنوں تک یہ تصور اُن کے ذہن میں رہا ہے۔

چنگیز کیا کرتا تھا؟ تیمور کیا کرتا تھا؟ کم سے کم درجہ یہی ہے کہ وہ لوگوں کے اوہام سے فائدہ اٹھاتے تھے' یعنی رعب و دبدبہ پیدا کرتے تھے' تا کہ لوگ ان سے متاثر ہو جائیں۔

حضرت علیؑ کا بیان

نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام کا ایک جملہ ہے' جو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کی تفسیر کرتا ہے' اور {یہ جملہ} بہت عجیب بھی ہے۔ جب اس نکتے سے میرا سامنا ہوا' تو میں اس سے اتنا متاثر ہوا کہ کوئی حد ہی نہیں۔ فرعون کو دعوت دینے کی غرض سے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کے اُس کے پاس جانے کا واقعہ نقل کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ جب انہیں حکم دیا گیا' تو وہ دونوں چرواہے کے لباس میں' دو چرواہوں کی مانند (چرواہے کا لفظ میں نے استعمال کیا ہے) فرعون کے پاس پہنچے۔ وَ عَلَيْهِمَا مَدَارِعُ الصُّوفِ. دونوں نے اون کا لباس پہنا ہوا تھا' جو سادہ ترین لباس تھا۔ وَ بِأَيْدِيهِمَا الْعِصِيُّ. اور دونوں کے ہاتھ میں ایک ایک عصا تھا اور ان دونوں کا کل سرمایہ یہی تھا۔ اب فرعون اپنے اُس جاہ وجلال کے ساتھ {بیٹھا ہے' اور} دو افراد اس کے پاس بوسیدہ اونی لباس پہنے' لاٹھیاں ہاتھ میں لئے آتے ہیں (۱) اور پوری روحانی طاقت وتوانائی کے ساتھ اس سے مخاطب ہوتے ہیں' کہتے ہیں کہ ہمارے پاس ایک پیغام ہے' ایک پیام ہے' ہم یہ پیغام پہنچانے آئے ہیں۔ اس اصل نکتے پر وہ قطعی یقین رکھتے ہیں کہ ہم اپنی دعوت میں کامیاب ہیں' ہم تم پر اتمامِ حجت کے لئے آئے ہیں۔ کہتے ہیں: ہم سب سے پہلے تیرے پاس آئے ہیں کہ اگر تو اپنی فرعونیت کو چھوڑ دے اور سچے دل سے اسلام (۲) قبول کرلے' تو ہم تیرے اقتدار اور سلطنت کی ضمانت دیتے ہیں' لیکن اسلام کی حدود میں۔ فرعون نے اپنے اردگرد دیکھا اور کہا: اَلَا تَرَوْنَ هٰذَيْنِ؟ انہیں دیکھ رہے ہو؟! جو پرانا بوسیدہ لباس پہنے اور خشک لکڑی کی دو لاٹھیاں ہاتھ میں لئے ہوئے ہیں؟! اصل مسئلے کے بارے میں انہیں کامل یقین ہے کہ کامیابی

۱۔ یہاں اس بات کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے کہ انہیں فرعون تک پہنچنے کے لئے کیسی کیسی رکاوٹوں کو عبور کرنا پڑا تھا۔

۲۔ اسلام یعنی وہی دینِ حق جو ہر زمانے میں رہا ہے اور پیغمبر اکرمؐ کے ہاتھوں اپنے کمال تک پہنچا ہے۔ قرآن سب کو اسلام قرار دیتا ہے اور انہیں اسلام سے تعبیر کرتا ہے۔

ان کا مقدر ہے' میرے پاس یہ شرط لے کر آئے ہیں کہ اگر آئندہ بھی تم عزت چاہتے ہو اور خاک مذلت میں گرنے سے بچنا چاہتے ہو تو آؤ اور اسلام قبول کر لو۔

اب فرعون کی منطق کیا ہے؟

فَلَوْلَا اُلْقِیَ عَلَیْهِمَا اَسَاوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اگر واقعی ان کا مستقبل اتنا ہی تابناک ہے' تو پھر ان کی یہ وضع قطع اور حلیہ کیوں ہے؟ ان کا سونا چاندی اور جواہرات کہاں ہیں؟ ان کا لشکر اور جاہ وحشم کہاں ہیں؟

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اِعْظَاماً لِلذَّهَبِ وَ جَمْعِهِ وَاحْتِقَارًا لِلصُّوْفِ وَ لُبْسِهِ."

اس کی نظر میں پیسے کو بڑی حیثیت حاصل تھی اور سادہ لباس کو وہ حقیر سمجھتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ اگر یہ سچا ہے اور ایک خدائی سرچشمے سے منسلک ہے' تو وہ خدا آئے اور اسے ہمارے مقابلے میں دس گنا زیادہ خزانہ اور جواہرات اور دبدبہ عطا کر دے۔ پس اس کے پاس یہ کیوں نہیں ہے؟

حضرت علی علیہ السلام بعد میں اس فلسفے کی جانب (اشارہ کرتے ہیں) کہ کیوں خدا اپنے پیغمبروں کو اس طرح مبعوث کرتا ہے' اور ان کو یہ ظاہری شان وشوکت' ہو بچو' پیسہ اور جواہرات نہیں دیتا ہے؟ فرماتے ہیں: اگر یہ چیزیں انہیں خدا دیدے تو پھر درحقیقت اختیار ختم ہو جاتا ہے۔

اگر جبری ایمان کا معاملہ ہو تو سب ہی لوگ ایمان لے آئیں گے لیکن وہ ایمان نہیں ہے۔ ایمان یہ ہے کہ لوگ اسے حقیقت کی بنیاد پر اور اختیار کے ساتھ (قبول کریں) وگرنہ (خود امیر المومنینؑ کی تعبیر ہے) خدا ان کے لئے حیوانات کو مسخر کر سکتا ہے (جیسے کہ اُس نے اپنے پیغمبر سلیمانؑ کے لئے یہ کیا) پرندوں کو ان کے لئے مسخر کر سکتا ہے اور جب یہ لوگ فرعون کے پاس آتے تو پرندے ان کے سروں پر اڑ رہے ہوتے' جانور ان کی تعظیم کر رہے ہوتے' تا کہ پھر لوگوں کے لئے کوئی شک باقی نہ رہتا اور اختیار مکمل طور پر ختم ہو جاتا۔ فرماتے ہیں' اس صورت میں لَا لَزِمَتِ الْاَسْمَآءُ مَعَانِیَهَا. پھر یہ ایمان' ایمان نہ ہوتا۔ اُن کا ایمان' ایسا ایمان ہونا چاہئے جس میں کسی قسم کا جبر نہ ہو۔ معجزہ اور کرامت بھی صرف دلیل کی حد تک (استعمال ہوتے ہیں)۔ جب

تک دلیل کی حد تک ہے' تو قرآن کہتا ہے آیت' معجزہ' لیکن اگر دلیل کی حد سے زیادہ چاہیں' تو کہتا ہے پیغمبر معجزہ سازی کا کارخانہ لے کر نہیں آیا ہے۔ وہ اس لئے آیا ہے تاکہ لوگوں کے سامنے اپنا دین پیش کرے۔ اس کی نبوت و رسالت کی صداقت کی گواہی کے لئے خدا اس کے ہاتھ سے معجزہ بھی ظاہر کرتا ہے۔

جیسے ہی اتمام حجت ہو جاتا ہے' معجزہ سازی کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ کبھی ایک معجزہ یہاں' کبھی ایک معجزہ وہاں {دکھایا جا رہا ہو}۔ ایک کہے: ذرا فلاں معجزہ تو دکھاؤ' اور وہ کہے' بہت خوب {دکھاتا ہوں}۔ کوئی دوسرا ایک اور مطالبہ کرے' اور وہ کہے: بہت اچھے {ابھی دکھاتا ہوں}۔ ان شعبدہ بازوں کی طرح۔ ایک کہے کہ میں کہتا ہوں کہ اس آدمی کو لال بیگ بنا دیں' دوسرا کہے کہ میں چاہتا ہوں کہ اس گدھے کو گھوڑے میں تبدیل کر دیں۔ ظاہر ہے کہ مسئلہ یہ نہیں ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: اگر ایسا ہوتا' تو ایمان' ایمان نہ ہوتا۔ امامؑ کا اگلا جملہ جس سے ہم استدلال کرنا چاہتے ہیں' وہ یہ ہے کہ فرماتے ہیں: خدا اس قسم کے تکلفات' شان و شوکت اور دبدبے ہرگز اپنے نبی کو نہیں دیتا' اس قسم کی طاقتیں جو لوگوں کے واہمے کو متاثر کر دیں' خدا اپنے پیغمبروں کو نہیں دیتا اور پیغمبر بھی اس روش کی پیروی نہیں کرتے: وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سُبْحَانَهُ جَعَلَ رُسُلَهُ اُولِى قُوَّةٍ فِىْ عَزَائِمِهِمْ. خدا نے اپنے پیغمبروں کو جو طاقت بھی دی ہے' وہ ان کی ہمت میں دی ہے' ان کے ارادے میں دی ہے' ان کے عزم میں دی ہے' ان کی روح میں دی ہے' کہ وہ دہی اونی لباس پہن کر' لکڑی کا عصا ہاتھ میں لے کر آتے ہیں اور ایک فرعون کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ایک قوت کے ساتھ بات کرتے ہیں: وَ ضَعَفَةً فِيْمَا تَرَى الْاَعْيُنُ مِنْ حَالَاتِهِمْ. (۱) اسکے بعد فرماتے ہیں:

"مَعَ قَنَاعَةٍ تَمْلَأُ الْقُلُوْبَ وَالْعُيُوْنَ غِنًى' وَخَصَاصَةٍ تَمْلَأُ الْاَبْصَارَ

۱۔ دوسروں کو ان کے جو حالات نظر آتے ہیں ان میں انہیں کمزور و ناتواں قرار دیتا ہے۔

وَالْاَسْمَاعَ اَذًی.''(۱)

(شاید میں آپ کے لئے اس عبارت کا ترجمہ اور تفسیر نہ کرسکوں لیکن میرا دل چاہتا ہے کہ کرسکوں اور آپ بھی اسے اچھی طرح سمجھ لیں)

خدا نے انہیں ایسی قناعت کے ہمراہ جو {دیکھنے والوں کے} دلوں اور آنکھوں کو بے نیازی سے بھر دیتی ہے' خود اُن کے اندر ے عزم وارادے کی قوت دی ہے۔

آپ ایک شخص کو دیکھتے ہیں جس کے پاس بہت کچھ ہوتا ہے' اور جو میرے پاس یہ ہے' وہ ہے کہہ کر آپ کو حیرت میں ڈالنا چاہتا ہے' جبکہ ایک اور شخص کو دیکھتے ہیں جو {یہ کہہ کر کہ} ''میرے پاس کچھ نہیں ہے' لیکن میں بے نیاز ہوں اور مجھے پروا نہیں۔'' لوگوں کی آنکھوں کو بے نیازی سے بھر دیتا ہے۔

حضرت علی فرماتے ہیں انبیا بھی آنکھوں کو بے نیازی سے بھر دیا کرتے تھے لیکن یہ کہہ کر کہ ''میرے پاس نہیں ہے اور میں بے نیاز ہوں۔'' یہ کہہ کر نہیں کہ یہ میرا باغ ہے' یہ میرا گھر ہے' میرے پیچھے اتنے گھوڑے چلتے ہیں' اتنے ملازم میرے ساتھ ہوتے ہیں' اتنا جاہ وجلال اور شان و شوکت ہے۔ انبیا میں سے کسی نے بھی اس شان وشوکت کو اپنے آپ سے وابستہ نہیں کیا۔ انتہائی سادگی میں {رہا کرتے تھے}' لیکن ان کی یہی سادگی اُس جاہ وحشم اور اُس شان وشوکت کو برباد کر دیتی تھی۔

سکندر اور دیوژن

حکمائے کلبی میں ایک مشہور حکیم (فلسفی) ہے' البتہ یہ لوگ ان کاموں میں افراط سے کام لیتے تھے' یعنی عجیب وغریب وضع قطع کے اصطلاحاً زاہد پیشہ لوگ تھے' جن کو دنیا کے مال اور ساز وسامان کی کوئی پروا نہیں تھی۔ نہ ان کا گھر ہوتا تھا نہ گھریلو زندگی۔ دیوژن نامی ایک شخص تھا' جسے مسلمان دیو جانس کہتے ہیں' اور دیوانِ شمس میں مولانا {روم} کے مشہور شعر میں اسی کی جانب

۱۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۹۰

اشارہ ہے:

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر
کز دیو و دد ملولم و انسانم آرزوست
گفتند یافت می نشود گشتہ ایم ما
گفت آنچہ یافت می نشود آنم آرزوست

یہ داستان اسی دیوژن سے متعلق ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ دن کے وقت چراغ ہاتھ میں لئے چلا جا رہا تھا۔ کسی نے پوچھا: تم نے (اس وقت) چراغ ہاتھ میں کیوں لیا ہوا ہے؟ اُس نے کہا: میں ایک چیز کی تلاش میں گھوم رہا ہوں۔ پوچھا: کس چیز کی تلاش میں گھوم رہے ہو؟ اُس نے کہا: انسان کی تلاش میں۔

جب سکندر نے ایران کو فتح کر لیا اور اسے بہت سی کامیابیاں نصیب ہوئیں تو سب آ آ کر اسکے سامنے کورنش بجالاتے اور اسکے سامنے گھٹنے ٹیکتے۔ لیکن دیوژن نہیں آیا اور سکندر سے بے اعتنا رہا۔ آخر سکندر کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا' کہنے لگا ہم خود دیوژن کے پاس جائیں گے۔ وہ دیوژن کو تلاش کرتا ہوا بیابان میں جا پہنچا۔ اُس وقت دیوژن آج کی اصطلاح میں غسلِ آفتاب لے رہا تھا۔ سکندر وہاں پہنچا' جب دیوژن نے اپنے قریب گھوڑوں وغیرہ کی آوازیں سنیں تو سر اٹھا کے دیکھا اور پھر بے پروائی سے لیٹ گیا۔ یہاں تک کہ سکندر اپنے گھوڑے کے ساتھ اس کے سر پر پہنچ گیا' وہاں کھڑا ہوا اور کہا: اٹھو۔ سکندر نے اُس سے دو چار باتیں کیں جن کے اُس نے جواب دیئے۔ آخر میں سکندر نے اُس سے کہا: آپ کی کوئی فرمائش ہے تو کیجئے۔ اُس نے کہا: میں تم سے صرف ایک چیز طلب کرتا ہوں۔ بولا: کیا؟ اُس نے کہا: اپنا سایہ مجھ پر سے ہٹا لو' میں یہاں غسل آفتاب لے رہا تھا' تم آ گئے اور اپنا سایہ ڈال کر میرے اور سورج کے درمیان حائل ہو گئے۔

جب سکندر اپنی فوج کے افسروں کے ساتھ واپس آ گیا' تو اس کے افسر کہنے لگے: عجیب پست آدمی تھا' عجیب حقیر انسان تھا! کیا انسان ایسا پست ہو سکتا ہے! دنیا کی دولت نے اس کا رُخ کیا تھا' وہ ہر چیز مانگ سکتا تھا۔

لیکن سکندر دیوژن کی روح کے مقابلے میں ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ اس نے ایک جملہ کہا جو تاریخ میں باقی رہ گیا۔ بولا: ''اگر میں سکندر نہ ہوتا' تو دیوژن بننا پسند کرتا''۔ وہ سکندر ہونے کے باوجود بھی دیوژن بننا پسند کرتا تھا۔ اس کا یہ کہنا کہ ''اگر میں سکندر نہ ہوتا'' بھی اس لئے تھا تاکہ تقابل کی جگہ خالی نہ رہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: انبیا قناعت اور سادگی کا پیکر تھے اور یہی اُن کی سیاست تھی' الٰہی سیاست۔ وہ بھی دلوں کو بے نیاز کرتے تھے لیکن ظاہری جاہ و جلال اور شان و شوکت سے نہیں' بلکہ روحانی جلال سے جس کے ساتھ سادگیاں بھی شامل ہوتی تھیں۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس جلال و حشمت سے اس قدر متنفر تھے کہ اس تنفر کی جھلک آپ کی پوری زندگی میں نظر آتی ہے۔ اگر کہیں جانا چاہتے تھے تو اگر کچھ لوگ اُن کے پیچھے چلنا چاہتے تو آپ اس بات کی اجازت نہیں دیا کرتے تھے۔ اگر آپ سواری پر ہوتے اور کوئی پیدل چلنے والا آپ کے ساتھ آنا چاہتا' تو آپ اُس سے فرماتے: بھائی! ان دو میں سے کوئی ایک بات کرو' یا تو تم آگے چلو' میں تمہارے پیچھے آتا ہوں' یا میں جاتا ہوں' تم بعد میں آ جانا۔ یا اگر کبھی ممکن ہوتا کہ دو افراد سوار ہو جائیں' تو فرماتے تھے کہ آؤ دونوں ایک ساتھ سوار ہو جاتے ہیں۔ میں سوار رہوں اور تم پیدل چلو' یہ مناسب نہیں ہے۔ محال تھا کہ آپ اس بات کی اجازت دے دیں کہ آپ تو سواری پر چل رہے ہوں اور کوئی دوسرا پیدل آپ کے ساتھ چلے۔ کسی مجلس میں تشریف فرما ہوتے' تو فرماتے: گول دائرے (کی صورت) میں بیٹھتے ہیں' تاکہ ہماری محفل میں کوئی اونچ نیچ نہ ہو۔ اگر میں صدرِ مجلس میں بیٹھ جاؤں اور تم لوگ میرے اردگرد بیٹھے ہو' تو تم میرے جلال اور دبدبے کا حصہ بن جاؤ گے' اور میں یہ نہیں چاہتا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب تک زندہ رہے' آپ نے اپنا یہ اصول نہ توڑا۔ آپ اس اصول کی پابندی کو ایک اعتبار سے خصوصیت کے ساتھ رہبر و رہنما کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام اپنی خلافت کے زمانے میں' انتہائی حد تک اس اصول کا لحاظ رکھتے تھے۔ اسلام ایک قائد و رہبر کو (بالخصوص اگر وہ معنوی اور روحانی پہلو کا حامل بھی

ہو) ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنے لئے جاہ وجلال اور شان وشوکت کا قائل ہو جائے۔ اس کا جاہ وجلال اور شان وشوکت دراصل اس میں پائی جانے والی معنویت اور روحانیت ہی میں ہے' اس کی قناعت ہی میں ہے' اس کی روح میں ہے' نہ کہ اس کے جسم میں اور نہ اسکے ظاہری تکلفات میں۔

امیر المومنین علیہ السلام جب اپنی خلافت کے دور میں مدائن تشریف لائے' جو کہ بغداد کے نزدیک واقع ہے' اور جہاں نوشیرواں کا قدیم محل' یعنی قصرِ مدائن تھا' آپ اس محل میں آئے اور اس کا نظارہ کرنے لگے۔ اس موقع پر ایک شخص نے دنیا کی بے وفائی کے بارے میں ایک عربی شعر پڑھنا شروع کیا کہ: "چلے گئے وغیرہ۔۔۔" آپ نے فرمایا: یہ کیا ہے؟ آیت قرآن پڑھو:

"كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ وَّ زُرُوْعٍ وَّ مَقَامٍ كَرِيْمٍ وَّ نَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ." (۱)

جب آپ ایران پہنچے اور ایرانیوں کو معلوم ہوا کہ حضرت علی علیہ السلام تشریف لا رہے ہیں' تو گاؤں کے کچھ بڑے' کسانوں کے کچھ سردار آپ کے استقبال کے لئے آئے' اور آپ کے آگے آگے دوڑنے لگے۔ حضرت نے انہیں آواز دی اور پوچھا: یہ کیا کر رہے ہو؟ ان لوگوں نے کہا: ہم اپنے بزرگوں کا اسی طرح سے احترام کیا کرتے ہیں' ان کی سواری کے آگے آگے دوڑا کرتے ہیں۔ ہم یہی کام آپ کے احترام میں بھی کر رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا: تم لوگ اس عمل کے ذریعے اپنے آپ کو حقیر اور پست کر رہے ہو' اور اس سے اس بزرگ کو بھی ذرہ برابر فائدہ نہیں پہنچتا۔ یہ کیا حرکت ہے؟! مجھے یہ تکلفات پسند نہیں ہیں۔ تم لوگ انسان ہو اور آزاد۔ میں بھی ایک انسان ہوں اور تم بھی ایک انسان ہو۔

یہ ہے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کا ایک اصول اور پیغمبر اکرمؐ جن اسالیب پر

۱۔ سورۂ دخان ۴۴ آیت ۲۵ تا ۲۷ (یہ لوگ کتنے ہی باغات اور چشمے چھوڑ گئے' اور کتنی ہی کھیتیاں اور عمدہ مکانات چھوڑ گئے' اور وہ نعمتیں (بھی) جن میں مزے اڑا رہے تھے۔)

گامزن ہوا کرتے تھے' ان کے اصول میں سے ایک اصول سادگی تھا کہ: کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ خَفِیْفَ الْمَؤُوْنَۃِ. اور آپ نے ساری عمر اس اصول کو ملحوظ رکھا۔

ایک حدیث میں نقل کیا گیا ہے (اہلِ سنت نے بھی نقل کیا ہے) کہ عمر ابن خطاب' رسول اللہ کے کمرے میں داخل ہوئے' اس ماجرے کے دوران جس میں آنحضرتؐ نے اپنی بیویوں سے دوری اختیار کر لی تھی اور اُنہیں اختیار دیا تھا کہ یا تو طلاق لے لیں یا سادہ زندگی پر صبر کریں۔

آنحضرت کی بعض ازواج کہتی تھیں کہ ہماری زندگی بہت ہی زیادہ سادہ ہے' ہمیں بھی زر و زیور چاہئے' مالِ غنیمت میں سے ہمیں بھی دیجئے۔ آپ نے اُن سے فرمایا: میری زندگی تو سادگی کے ساتھ بسر ہوگی۔ میں تمہیں طلاق دینے کے لئے تیار ہوں اور معمول کے مطابق ایک طلاق یافتہ عورت کو (قرآن کے الفاظ میں) تسریح کرنا چاہئے' یعنی اُنہیں کچھ حوالے کرنا اور کچھ دینا چاہئے' میں تمہیں کچھ دینے کے لئے بھی تیار ہوں۔ اگر میری سادہ زندگی کے ساتھ گزارا کر سکتی ہو' تو ٹھیک ہے' لیکن اگر چاہتی ہو کہ میں تمہیں چھوڑ دوں' تو میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں۔ البتہ {اسکے جواب میں} تمام ازواج نے کہا کہ نہیں' ہم سادہ زندگی کے ساتھ گزارا کر لیں گے۔ یہ کافی طویل قصہ ہے۔

لکھا ہے کہ جب حضرت عمر بن خطاب کو یہ معلوم ہوا کہ آنحضرتؐ اپنی بیویوں سے ناراض ہیں' تو وہ آپ سے بات کرنے آئے۔ کہتے ہیں کہ وہاں ایک سیاہ فام شخص تقریباً دربان کی حیثیت سے موجود تھا' جسے حضورؐ نے کہہ رکھا تھا کہ کسی کو آنے نہ دے۔ {حضرت عمر کہتے ہیں} جب میں وہاں پہنچا تو میں نے اُس سے کہا کہ حضرتؐ سے کہو کہ عمر آئے ہیں۔ وہ گیا اور واپس آکر کہا کہ حضورؐ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں چلا گیا اور دوبارہ آیا اور اجازت طلب کی' دوسری بار بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ تیسری مرتبہ گیا تو فرمایا: آجاؤ۔ جب میں گیا تو میں نے دیکھا کہ پیغمبرؐ ایک کمرے میں لیٹے ہوئے آرام فرما رہے ہیں' اس کمرے کا فرش صرف کھجور کے درخت کی چھال تھی۔ جب میں گیا تو حضورؐ نے شاید اپنی جگہ سے کچھ حرکت کی' میں نے دیکھا کہ فرش کی سختی کے اثرات آپ کے بدنِ مبارک پر نظر آرہے تھے۔ مجھے بہت افسوس ہوا۔ پھر کہتے ہیں (شاید روتے

ہوئے): یارسول اللہ! ایسا کیوں ہے؟ قیصر و کسریٰ تو نعمتوں میں غرق ہوں اور آپ جو اللہ کے نبی ہیں' آپ کا یہ حال ہو؟ حضورؐ گویا ناراض ہو کر اپنی جگہ سے اُٹھتے ہیں اور فرماتے ہیں: یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ یہ کیسی فضول بات کر رہے ہو؟ تمہاری نظر میں وہ بڑی چیزیں ہیں' اور تم یہ سمجھتے ہو کہ میرے پاس وہ چیزیں نہیں ہیں تو یہ میرے لئے کوئی محرومی ہے؟ اور یہ سمجھ رہے ہو کہ وہ چیزیں اُن کے لئے نعمت ہیں؟ خدا کی قسم یہ تمام چیزیں مسلمانوں کو نصیب ہوں گی' لیکن یہ کسی کے لئے وجہ افتخار نہیں ہیں۔

دیکھئے پیغمبرؐ کی زندگی کیسی تھی۔ جب آپ نے وفات پائی تو کیا چھوڑ کر گئے؟ جب علیؑ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو کیا چھوڑ گئے؟ جب پیغمبرؐ اس دنیا سے گئے تو آپ کی ایک ہی بیٹی تھی' معمول کے مطابق' ہر انسان انسانی جذبات کے تحت اور اگر ان معیارات کی پیروی کرے' آخر کار اُن کی بیٹی ہیں' اُن کا دل چاہتا ہوگا کہ اُن کے لئے کچھ سرمایہ مثلاً مکان اور سامانِ زندگی فراہم کریں۔ لیکن اس کے برعکس (ہوتا کیا ہے کہ) ایک دن آپ فاطمہؑ کے گھر میں آتے ہیں' دیکھتے ہیں کہ فاطمہؑ کے ہاتھ میں چاندی کا ایک کڑا ہے اور ایک رنگین پردہ بھی لٹکا ہوا ہے۔ حضرت فاطمہؑ سے غیر معمولی محبت کے باوجود آنحضرتؐ آپ سے کوئی بات کئے بغیر چلے جاتے ہیں۔ حضرت فاطمہؑ نے محسوس کر لیا کہ بابا اس حد تک چیزوں کو بھی ان کے لئے پسند نہیں کرتے۔ کیوں؟ اس لئے کہ یہ وہ دور ہے جس میں اہلِ صُفّہ موجود ہیں۔ زہراؑ جو ہمیشہ ایثار کی عادی رہی ہیں' اور اپنے پاس موجود تمام مالِ دنیا دوسروں کو بخش دیا کرتی ہیں' پیغمبرؐ کے واپس گھر پہنچنے سے پہلے ہی فوری طور پر ہاتھ سے چاندی کا وہ کڑا اور وہ رنگین پردہ اتار کر کسی کے ہاتھ رسولِ اکرم کی خدمت میں بھیج دیتی ہیں۔ اے اللہ کے رسولؐ! یہ چیزیں آپ کی بیٹی نے بھیجی ہیں اور عرض کیا ہے کہ جس کام کو بھی آپ خیر سمجھتے ہوں ان چیزوں کو اُس میں استعمال کر لیجئے۔ اس موقع پر نبی اکرم کا چہرہ کھل اٹھتا ہے اور اس طرح کا جملہ ارشاد فرماتے ہیں کہ: اس کا بابا اس پر قربان ہو۔

حضرت فاطمہؑ کی شادی کی رات ہے۔ فاطمہؑ کے لئے شب زفاف کے پیراہن کے طور پر صرف ایک نیا لباس خریدا گیا ہے' ایک لباس اُن کے پاس پہلے سے موجود تھا۔ شب زفاف ایک

سائل آپ کے دروازے پر آتا ہے اور صدا لگاتا ہے: میں بے لباس ہوں، کوئی ہے جو میرے لئے لباس کا انتظام کرے؟ وہاں موجود دوسرے لوگ اس سائل کو کچھ دینے کے لئے اس کی جانب متوجہ نہیں ہوتے۔ فاطمہؑ جو اس گھر کی دلہن ہیں اور جو دلہن بنی بیٹھی ہیں وہ دیکھتی ہیں کہ کسی نے سائل کو جواب نہیں دیا، فوراً اکیلے ہی اٹھ کر تنہائی میں جاتی ہیں اور وہ نیا لباس اتار کر اپنا پرانا لباس پہن لیتی ہیں اور وہ نیا لباس سائل کو دے دیتی ہیں۔ جب آپ واپس آتی ہیں تو لوگ پوچھتے ہیں کہ آپ کا نیا لباس کہاں گیا؟ (فرماتی ہیں) میں نے اسے راہِ خدا میں دے دیا۔

یہ چیزیں فاطمہؑ کے لئے کوئی عظمت اور اہمیت نہیں رکھتیں؟! لباس کیا ہوتا ہے؟! تکلفات اور دبدبہ کیا چیز ہے؟!

فاطمہؑ اگر فدک کے حصول کی کوشش کرتی ہیں، تو وہ اس لئے کہ اسلام حق کے مطالبے کو واجب سمجھتا ہے، ورنہ فدک کی کیا اہمیت ہے؟! کیونکہ اگر آپ فدک کے لئے نہ گئی ہوتیں، تو یہ ظلم قبول کرنا ہوتا، ظلم کے آگے جھکنا ہوتا، ورنہ فدک جیسے سیکڑوں انہوں نے راہِ خدا میں دے دیئے تھے۔ کیونکہ ظلم قبول نہیں کرنا چاہئے، اس لئے فاطمہؑ اپنے حق کا مطالبہ کرتی ہیں، یعنی فاطمہؑ کے لئے فدک کی اہمیت اس اعتبار سے تھی کہ وہ ان کا حق تھا، نہ کہ اقتصادی اور مادّی اعتبار سے۔ اقتصادی اور مادّی اعتبار سے اس کی اہمیت صرف اتنی تھی کہ اگر فدک ہمارے پاس ہو تو ہم دوسروں کی مدد کر سکتے ہیں۔

جی ہاں، یہ تھی فاطمہؑ کی شبِ عروسی۔ لیکن فاطمہؑ نے اپنی وفات سے پہلے خصوصی طور پر صاف ستھرا لباس زیبِ تن کیا، تاکہ ان کا احتضار اس حالت میں ہو۔ اسماء بنت عمیس کہتی ہیں: ایک دِن (اب یا وفاتِ رسول کے پچھتر دن بعد یا پچانوے دِن بعد ہو) میں نے دیکھا کہ گویا آج بی بی کی حالت کچھ بہتر ہے، آپ اپنی جگہ سے اٹھیں اور بیٹھ گئیں، پھر اٹھیں اور غسل کیا اور اسکے بعد فرمایا: اسماء! میرا وہ صاف ستھرا لباس لے آؤ۔ (۱) اسماء کہتی ہیں کہ میں بہت خوش ہوئی کہ الحمدللہ

۱۔ اسماء خادمہ وغیرہ نہیں تھیں۔ وہ پہلے آپ کی چچی تھیں یعنی پہلے حضرت جعفر {طیار} کی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

گویا بی بی کا حال کچھ بہتر ہے۔ لیکن بی بی نے ایک جملہ فرمایا جس سے اسماء کی تمام امیدیں ٹوٹ گئیں۔ فرمایا: اسماء! میں ابھی رو بہ قبلہ لیٹ جاؤں گی' تم کچھ دیر' کچھ لمحے' کچھ لحظے میرے ساتھ بات نہ کرنا' جب کچھ دیر گزر جائے تو مجھے آواز دینا' اگر تم دیکھو کہ میں نے جواب نہیں دیا' تو سمجھ لینا کہ وہ میری موت کا لمحہ ہے۔ یہ وہ مقام تھا جہاں اسماء کی تمام امیدیں ٹوٹ گئیں۔ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ اسماء نے چیخ بلند کی اور حضرت علیؑ کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئیں' آواز دے کر علیؑ کو مسجد سے بلایا اور حسنینؑ بھی آ گئے۔

ولا حول و لا قوۃ الا باللّٰہ العلی العظیم و صلی اللّٰہ علی محمد و آلہ الطاھرین.

باسمک العظیم الاعظم الاجلّ الاکرم یا اللّٰہ ...

بارِ الٰہا! ہمیں اسلام اور قرآن کا قدردان بنا۔ ہم سب کو عمل کی توفیق اور خلوصِ نیت عطا فرما' اپنی محبت اور معرفت کا نور ہمارے دلوں میں روشن فرما۔ ہمارے دلوں کو اپنے نبی اور آلِ نبی کی محبت اور معرفت سے منور فرما۔ ہمارے مرحومین کو اپنی عنایت اور رحمت میں شامل فرما۔

و عجل فی فرج مولانا صاحب الزمان.

☆☆☆

(بقیہ پچھلے صفحے کا حاشیہ) زوجہ تھیں' اور اس وقت حضرت زہرا کی بچی ہوتی ہیں۔ حضرت جعفر کے بعد وہ حضرت ابوبکر کی زوجہ ہوئیں۔ محمد بن ابی بکر جو انتہائی جلیل القدر انسان ہیں' انہی اسماء کے بیٹے ہیں۔ حضرت ابوبکر کے بعد حضرت علی نے اسماء سے شادی کر لی' اور اس طرح محمد بن ابی بکر امیر المومنین کے منہ بولے بیٹے بن گئے اور ان کی تربیت امیر المومنین نے کی۔ وہ ولائے امیر المومنین رکھتے تھے۔ غرض یہ کہ اسماء ایک عظیم خاتون ہیں۔ جب وہ حضرت ابوبکر کی بیوی تھیں' اس وقت بھی وہ ولائے علی رکھتی تھیں' محبِ علی تھیں اور خاندانِ علی کی عقیدت مند تھیں نہ کہ اپنے شوہر کے خاندان کی۔

چوتھی نشست

ذریعے کے استعمال کی کیفیت

ذریعے کے استعمال کی کیفیت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ رب العٰلمین باریٔ الخلائق اجمعین. و الصلوٰۃ و السلام علیٰ عبد اللّٰہ ورسولہ و حبیبہ و صفیہ و حافظ سرّہ و مبلّغ رسالاتہ سیّدنا و نبیّنا و مولانا ابی القاسم محمد و آلہ الطیبین الطاہرین المعصومین. اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم:

"لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ لِّمَنْ کَانَ یَرْجُوا اللّٰہَ وَ الْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَکَرَ اللّٰہَ کَثِیْرًا" (۱)

ایک اور مسئلہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت سے سیکھنا چاہیے، وہ ہے "ذریعے سے استفادے کی کیفیت"۔ سب سے پہلے تو انسان کو اپنے اہداف میں مسلمان ہونا چاہیے۔ یعنی اس کا مقصد مقدس، بلند اور الٰہی ہو۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ انسان کو ان اہداف کے حصول کے

۱۔ سورۂ احزاب ۳۳۔ آیت ۲۱

لئے ذریعے کے استعمال میں بھی سچا مسلمان ہونا چاہئے۔ بعض لوگ ہدف و مقصد کے اعتبار سے مسلمان نہیں ہوتے' یعنی زندگی میں ان کا مقصد صرف کھانا' پینا' پہننا اور لذت اٹھانا ہوتا ہے' واحد مقصد جس کے بارے میں وہ سوچتے ہیں وہ یہ ہوتا ہے کہ کس طرح سے زندگی گزاریں تاکہ زیادہ سے زیادہ تن آسانیاں حاصل ہوں۔ درحقیقت ان کے مقاصد ایک حیوان کے مقاصد سے آگے نہیں بڑھتے۔

ایسے لوگوں کو نہ صرف مسلمان نہیں کہا جاسکتا' بلکہ انہیں انسان بھی نہیں کہا جاسکتا۔ ایک انسان کو انسان ہونے کے ناطے حیوانی شہوات کی حدوں سے بالاتر ایک مقصد کا حامل ہونا چاہئے۔ اور اگر انسان سچا مسلمان ہو' تو اس کے تمام اہداف و مقاصد کا خلاصہ ایک کلمے میں ہو جاتا ہے اور وہ ہے خدا اور خوشنودی خدا۔

اگلے مرحلے میں انسان مجبور ہے کہ اپنے پاک' مقدس اور بلند مقاصد کے حصول کے لئے کچھ ذرائع سے استفادہ کرے۔ جو مسئلہ یہاں درپیش ہے' وہ یہ ہے کہ کیا مقصد و ہدف کا محض انسانی یا اس سے بڑھ کر اس کا الٰہی ہونا کافی ہے؟ اگر مقصد الٰہی ہو' تو پھر {اسکے حصول کے لئے} جو بھی ذریعہ اختیار کیا جائے' کوئی فرق نہیں پڑتا اور اس مقدس مقصد {کے حصول} کی خاطر ہر ذریعے سے کام لیا جاسکتا ہے؟

بالفرض ہمارا مقصد ایک مقدس مقصد ہے۔ کیا مقدس مقصد کے لئے ہر ذریعے سے استفادہ کیا جاسکتا ہے؟ خواہ وہ ذریعہ غیر مقدس اور ناپاک ہی کیوں نہ ہو' یا نہیں' مقدس مقصد کے لئے مقدس ذریعہ ہی استعمال کرنا چاہئے' غیر مقدس اور ناپاک ذریعہ نہیں۔

اب ہم کچھ مثالیں ذکر کرتے ہیں' تاکہ بات واضح ہو جائے۔

تبلیغِ دین کے لئے ناجائز ذریعے کا استعمال

ہمارا مقصد دین کی تبلیغ ہے۔ اب اس سے بہتر {مقصد} تو کوئی ہو نہیں سکتا۔ ایک مرتبہ ہمارا کوئی ذاتی کام ہوتا ہے' ہم ایک کام خود اپنے لئے انجام دینا چاہتے ہیں' اپنی رفاہ اور اپنے

فائدے کے لئے کرنا چاہتے ہیں۔اس صورت میں تو بالکل واضح ہے۔لیکن اگر ہم چاہیں کہ کوئی کام اپنے لئے نہیں' بلکہ دین کے لئے انجام دیں' تو کیا اس صورت میں اس کام کی انجام دہی کے لئے ہمارا کسی بھی ذریعے سے استفادہ کرنا جائز ہوگا؟

اگر ہم اپنے ذاتی فائدے کے لئے کوئی کام کرنا چاہیں۔مثلاً جب میرا کام روپے پیسے کی وجہ سے یا کسی دفتر میں پھنس جائے' تو میں آپ کے پاس پہنچ جاؤں (کیونکہ آپ میری مشکل کو حل کر سکتے ہیں) اور اپنی مشکل کو حل کرنے کے لئے دو چار جھوٹ گھڑ لوں' تو اس موقعے پر ہر کوئی مجھے ملامت کرے گا' کہیں گے اسے دیکھو' اپنا مسئلہ حل کرنے کے لئے چاپلوسی کر رہا ہے' خوش آمد کر رہا ہے' جھوٹ بول رہا ہے' تہمت لگا رہا ہے۔

لیکن ایک مرتبہ مقصد کچھ اور ہوتا ہے۔میں ایک مسجد بنانا چاہتا ہوں۔اپنے لئے تو نہیں بنانا چاہتا۔واقعاً مسجد بنانے میں میرا کوئی برا مقصد بھی نہیں ہے۔میں ان لوگوں میں شامل ہوں جنہوں نے فلاں علاقے میں' جہاں مسجد نہیں ہے' مسجد بنانے کا فیصلہ کیا ہے' تاکہ لوگ وہاں آکر نماز پڑھیں' وعظ کی مجالس کا اہتمام ہو' بچے وہاں آکر دینی احکام سیکھیں اور نشستیں منعقد ہوں۔ اس مسجد کے لئے ساز و سامان درکار ہے' دوسری مشکلات ہیں' ممکن ہے دفتری کارروائیوں میں کوئی رکاوٹ پیش آجائے' اس کے لئے لوگوں سے پیسے بھی جمع کرنے ہوں گے۔اب کوئی مخیّر شخص مسجد کے معاملات کے حل کے لئے کمر کستا ہے' کسی کے پاس جاتا ہے' اُس سے بات چیت کرتا ہے تاکہ کسی بھی طرح اُس سے رقم حاصل کرے' چار جھوٹ بولتا ہے' اور آخر کار مسجد کے لئے پانچ ہزار تومان (۱) نکلوا لیتا ہے' ایک اور آدمی سے دو جھوٹ بولتا ہے' کسی اور کی تھوڑی سی خوش آمد کرتا ہے کہ آپ کے کیا کہنے آپ تو ایسے ہیں' ویسے ہیں' ہم تو عرصہ دراز سے آپ کے عقیدتمند ہیں' میں نے خواب دیکھا ہے کہ مثلاً آپ جنت میں گھر بنا رہے ہیں' یقیناً ایسا ہی ہے' اور اس طرح اس شخص سے بھی دس ہزار تومان حاصل کر لیتا ہے' پچاس ہزار تومان کسی اور سے لے

۱۔{ایرانی کرنسی}

لیتا ہے۔

اب اسے ہم کیا کہتے ہیں؟

شاید بہت سے لوگ اس کام کو مقدس سمجھتے ہوں اور اسے ایک قسم کی قربانی قرار دیتے ہوں' کہتے ہوں کہ دیکھئے یہ بیچارہ اپنے لئے تو یہ سب کچھ نہیں کر رہا' صبح سے شام تک مسجد کے لئے دوڑ دھوپ کرتا ہے۔ دیکھئے یہ شخص اس کام کے لئے کیا کچھ نہیں کرتا؟! جس کسی کے بھی پاس جاتا ہے' جس طرح سے بھی ہوتا ہے بالآخر اس مسجد ہی کے لئے پیسے لاتا ہے۔ واقعاً یہ ایک ایثار و قربانی کرنے والا انسان ہے۔

یہ عمل درست ہے' یا نہیں؟ یہ ایک مسئلہ ہے۔

حدیث گھڑنا

ایک اور شخص (ایسا تاریخ میں ہوا ہے) لوگوں کی ہدایت اور اُن کی رہنمائی کے لئے پیغمبرؐ یا امامؑ سے کوئی حدیث گھڑ لیتا ہے' حالانکہ اس کی کوئی ذاتی غرض نہیں ہوتی' بلکہ وہ لوگوں کی ہدایت کرنا چاہتا ہے' لیکن سوچتا ہے کہ اگر لوگوں کے لئے پیغمبرؐ یا امامؑ سے کوئی حدیث نقل کر دے' تو لوگ بہتر طور پر قبول کر لیں گے۔ مثلاً (دل میں کہتا ہے) لوگ جو اتنی غیبت کرتے ہیں اور بیہودہ باتیں کرتے ہیں' انہیں غیبت اور بیہودہ باتوں سے روکنے کے لئے بہتر ہے کہ میں فلاں دعا کی فضیلت میں ایک حدیث گھڑ لوں' تا کہ لوگ یہ حدیث دیکھیں اور پھر بیہودہ باتوں اور غیبت کی بجائے وہ دعا پڑھیں' یا قرآن کے ثواب کے بارے میں کہوں کہ قرآن کی فلاں سورت کو اگر چالیس مرتبہ مسلسل پڑھو گے تو فلاں اثر ہو گا۔

کیا یہ کوئی مستحسن عمل ہے؟

یہ ایک مسئلہ ہے۔

مقصد نیک ہے' لیکن ایک آدمی جھوٹ بول کر یا جعلی حدیث کے ذریعے اس نیک مقصد کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔

کیا یہ درست ہے؟ یا نہیں درست نہیں ہے؟

تاریخ میں بہت سے لوگوں نے یہ کام کیا ہے۔ ایک حدیث ہے جسے تفسیر کی زیادہ تر کتابوں میں لکھا گیا ہے' بظاہر مجمع البیان کے مقدمے میں بھی ہے اور میں نے اسے بارہا کتابوں میں پڑھا ہے۔ اس حدیث کو قرآنی سوروں کی قرأت کے مخصوص فضائل کے بارے میں اُبَیّ بن کعب سے نقل کرتے ہیں' مثلاً سورۂ سَبِّحِ اسْمَ کی قرأت کے لئے خاص فضیلت کا ذکر کرتے ہیں' سورۂ هَلْ اَتٰیکَ حدیثُ الْغَاشِیَة کے لئے فضیلت اور دوسرے ثواب کا' سورۂ لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا کے لئے ایک اور ثواب کا' سورۂ بقرہ کے لئے ایک اور ثواب کا' سورۂ آل عمران کے لئے ایک اور ثواب کا۔ ہر ایک کے لئے ایک بات کہی ہے۔ یہ سب پیغمبر اکرمؐ ہی سے روایت کی گئی ہیں۔ ایک آدمی اُس شخص کے پاس گیا جو ان کی روایت کر رہا تھا' اور اس سے پوچھا: آخر کیا وجہ ہے کہ صرف تم ہی نے ان احادیث کو روایت کیا ہے' تمہارے علاوہ کسی ایک شخص نے بھی ان کو روایت نہیں کیا؟ کہنے لگا: اگر سچ پوچھتے ہو تو حقیقت یہ ہے کہ ان احادیث کو میں نے رضائے الٰہی کے لئے گھڑا ہے۔ میں نے دیکھا کہ لوگ محفلوں میں بیٹھتے ہیں اور زمانۂ جاہلیت کے افسانے اور تاریخ بیان کرتے ہیں اور جاہلیت کے اشعار پڑھتے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ لوگوں کا وقت ضائع ہو رہا ہے۔ اس لئے میں نے اس بیہودہ کام کی جگہ لوگوں کو تلاوتِ قرآن کی طرف مائل کرنے کی غرض سے ان احادیث کو پیغمبر اکرمؐ کی زبان سے نقل کر دیا' اور اس میں کوئی برائی نہیں!

دوسرا آتا ہے اور فلاں مقصد کے لئے ایک خواب گھڑ لیتا ہے' اور سمجھتا ہے کہ اس خواب کے ذریعے لوگوں کی ہدایت کر رہا ہے۔

کیا یہ کام درست ہے کہ انسان نیک مقصد کے لئے' ناجائز ذرائع استعمال کرے؟ نہیں' یہ غلط کام ہے۔

یہ بات پہلے بھی میرے ذہن میں بار بار آتی تھی' آج ہی جب میں اس حوالے سے تفسیر المیزان کا مطالعہ کر رہا تھا' تو میں نے دیکھا کہ انہوں نے تبلیغِ نبوت کے آداب میں' جنہیں انہوں نے قرآن سے اخذ کیا ہے' {بیان کیا ہے} کہ مجموعی طور پر تمام انبیا' جن میں رسولِ اکرمؐ بھی

شامل ہیں، کن آداب کا خیال رکھا کرتے تھے۔ ان آداب میں انہوں نے اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ انبیاؑ کی سیرت اور روش یہ تھی کہ وہ حق تک پہنچنے کے لئے ہرگز باطل سے استفادہ نہیں کرتے تھے، حق تک پہنچنے کے لئے خود حق ہی سے استفادہ کرتے تھے۔

کیا قرآنی داستانیں غیر حقیقی ہیں؟

مصر سے تعلق رکھنے والے کچھ لوگوں نے بعض قرآنی داستانوں کے بارے میں ایک فضول بات کہی ہے (جو کبھی کبھی مصر کے علاوہ دوسرے ممالک کے لکھنے والوں کے یہاں بھی ملتی ہے) {ان کا کہنا ہے} کہ فلاں داستان دنیا کی تاریخوں میں کہیں نہیں ملتی۔ ٹھیک ہے نہیں ملتی، لیکن کیا دنیا میں واقع ہونے والے تمام حوادث تاریخی کتابوں میں موجود ہیں؟! جو تاریخی کتابیں آج ہمارے پاس موجود ہیں، وہ تقریباً تین ہزار سال پہلے کی ہیں۔ یعنی اسلام سے تقریباً چودہ سو سال پہلے سے {تعلق رکھنے والی} دنیا کی تاریخ کے بارے میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ وہ کسی حد تک واضح ہے، اس سے پہلے کی کوئی درست تاریخ ہمیں دنیا میں نہیں ملتی۔ چار پانچ ہزار سال پہلے کی تاریخ کو زمانہ قبل از تاریخ کہا جاتا ہے۔

کچھ لوگوں نے بعض قرآنی قصوں کے بارے میں کہا ہے کہ قرآن کا مقصد نیک ہے، وہ (ان) قصوں کو نصیحت حاصل کرنے اور عبرت کے لئے نقل کرتا ہے۔ قرآن، تاریخ کی کتاب تو ہے نہیں جو واقعہ نگاری کرنا چاہتی ہو، قرآن واقعات کو نصیحت کے لئے ذکر کرتا ہے۔ جب مقصد وعظ و نصیحت ہے، تو پھر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ جو واقعہ قرآنِ مجید نقل کرتا ہے وہ واقع ہوا ہو، یا اس نے اسے نتیجے کے حصول کے لئے ایک داستان کی صورت میں نقل کیا ہو۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ دنیا کے بہت سے حکما نے جانوروں کی زبان سے انتہائی عظیم نصیحتیں بیان کی ہیں، جن کے متعلق تمام لوگ جانتے ہیں کہ یہ غیر حقیقی ہیں، جیسے کلیلہ ودمنہ کی داستانیں، جن میں ہے کہ مثلاً خرگوش نے یہ کہا، لومڑی یہ بولی، شیر نے یہ کہا، شیر آیا اور لومڑی سے یوں بولا، پھر خرگوش کو ذمے داری دی گئی وغیرہ۔ جب کہنا چاہتے ہیں کہ انسان کو عاقل اور ہوشیار ہونا چاہئے اور جسامت اور طاقت عقل،

فکر اور ہوشیاری کی برابری نہیں کر سکتی' تو کہتے ہیں کہ خرگوش اپنے اس چھوٹے سے جسم اور کم طاقت کے باوجود اتنے بڑے اور طاقتور شیر کو آخر کار کنویں میں معلق کر دیتا ہے۔ اس بات کو وعظ و نصیحت کے لئے بیان کیا جاتا ہے' ورنہ یہ قصہ واقع نہیں ہوا ہے' کہ سچ مچ کوئی شیر' لومڑی اور خرگوش ہو اور انہوں نے آپس میں کوئی گفتگو کی ہو۔ بعض نے نعوذ باللہ یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ اس بات کی سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں کہ ہم قرآنی قصوں کے بارے میں اس اعتبار سے غور کریں کہ آیا قرآنی قصے تاریخ کا حصہ ہیں' یا یہ وعظ و نصیحت کے لئے تمثیل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

لیکن یہ انتہائی فضول بات ہے۔ محال ہے کہ انبیاً اپنی منطقِ نبوت میں' ایک حقیقت کے لئے' نعوذ باللہ ایک ایسی بات کو جو واقع نہیں ہوئی اور ایک جھوٹ کو تمثیل ہی کی صورت میں سہی بیان کریں۔

دنیا کی ادبیات (literature) میں یہ باتیں بہت زیادہ ملتی ہیں۔ جن لوگوں نے جانوروں کی زبان سے گفتگو بیان کی ہے' ان کے علاوہ بھی ان لوگوں نے جنہوں نے جانوروں کی زبان سے گفتگو بیان نہیں بھی کی انہوں نے بھی (تمثیل سے استفادہ کیا ہے)۔ حتیٰ سعدی کی یہی داستانیں جو گلستان اور بوستان وغیرہ میں آئی ہیں اُن کے بارے میں کچھ نہیں معلوم کہ اُن کی کوئی تاریخی اہمیت ہے بھی یا نہیں' اور ان میں سے بہت سیوں کے بارے میں یقیناً شبہ پایا جاتا ہے' اس وجہ سے کہ درحقیقت کہانی خود اپنی تردید آپ کر رہی ہوتی ہے۔ مثلاً کہتے ہیں کہ جب میں ہندوستان میں تھا' تو سومنات کے مندر میں گیا' وہاں زند {پارسیوں کی مقدس کتاب} اور پازند {زند کی ایک تفسیر} پڑھی جا رہی تھی۔ پھر میں نے بتوں کو توڑا' ایسا کیا' ویسا کیا۔ بنیادی طور پر یہی معلوم نہیں کہ سعدی اپنی زندگی میں وہاں گئے بھی تھے یا نہیں۔ اور اگر وہ سومنات کے مندر گئے بھی ہوں' تو وہاں زند اور پازند کیا کر رہی تھیں؟! یا وہ کہتے ہیں: جب میں کاشغر میں تھا' تو میں نے ایک بچے کو دیکھا جو نحو کی کتاب پڑھ رہا تھا' میں نے اُس سے یہ کہا اور اُس نے مجھے یہ جواب دیا۔ نہیں' سعدی کا مقصد وہ نصیحت ہے جو وہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ سلطان محمود اور ایاز کی زبان سے باتیں بیان کرتے ہیں' ان میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔

قرآنِ مجید، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ائمۂ اطہار علیہم السلام اور وہ لوگ جو اس مکتب کے تربیت یافتہ افراد ہیں، محال ہے کہ وہ پاکیزہ مقصد کے لیے ایک غیر پاکیزہ چیز سے، مثلاً ایک کھوکھلی چیز سے ایک باطل چیز سے ایک بے حقیقت چیز سے، خواہ وہ ایک تمثیل ہی کیوں نہ ہو استفادہ کریں۔ یہی وجہ ہے جو ہمیں اس بارے میں کوئی شک نہیں ہے کہ قرآن کی تمام داستانیں، جس طرح سے قرآن نے بیان کی ہیں، عین حقیقت ہیں۔ وہ داستان جو قرآن نے نقل کی ہے، اسکے قرآن میں نقل ہونے کے بعد ہمارے لیے اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ ہم دنیا کی تاریخوں میں اس کی تائید تلاش کریں۔ دنیا کی تاریخوں کو قرآن سے تائید لینی چاہیے۔ انہوں نے (علامہ طباطبائی نے) تفسیر المیزان میں اس اصول کو آیاتِ قرآنی کی دلیل سے ثابت کیا ہے کہ بنیادی طور پر انبیا کی سیرت میں ایسی کوئی بات نہیں پائی جاتی کہ انہوں نے اپنے مقدس مقصد کے لیے بھی کسی غیر مقدس چیز سے استفادہ کیا ہو۔

جدت پسند اور قدامت پسند علما کے درمیان مشہور دو باطل خیالات

اس حوالے سے ایک بات ہمارے متجددین (modernist) کے یہاں مشہور ہوگئی ہے اور ایک بات ہمارے متقدمین کے یہاں، اور ان دونوں ہی نے حقیقت کو ایسا نقصان پہنچایا ہے جسے خدا ہی جانتا ہے۔ وہ بات جو جدت پسندوں کے یہاں بیان کی جاتی ہے اور اس پر بہت زیادہ زور بھی دیا جاتا ہے، وہ فرنگیوں سے لی گئی ہے اور اسے مصری اس قاعدے اور ان الفاظ کے ساتھ بیان کرتے ہیں: الغایاتُ تُبرّرُ المبادِی. یعنی مقصد ذریعے کو جواز فراہم کردیتا ہے۔ لہٰذا کوشش کرو کہ تمہارا مقصد نیک ہو۔ اپنے نیک مقصد کے لیے، تم ہر ذریعے سے، حتیٰ ناجائز ذریعے سے بھی استفادہ کرسکتے ہو۔

اور جو چیز ہمارے قدامت پسندوں میں کسی حد تک عام ہوگئی ہے، وہ یہ ہے کہ وہ ایک حدیث نقل کرتے ہیں (البتہ) یہ حدیث ہے اور حتیٰ شیخ انصاری رضوان اللہ علیہ نے ”مکاسب محرمہ“ میں اسے نقل کیا ہے، اور دو مقامات پر نقل کیا ہے، ایک مقام پر تفسیر نہیں کی ہے، لیکن دوسرے

مقام پر تفسیر کی ہے۔ وہ حدیث یہ ہے کہ اگر تم بدعت کرنے والوں کو دیکھو یعنی ایسے افراد کو دیکھو جو دین میں بدعت پیدا کرتے ہیں' فَباھِتُوھُمْ. (۱) جو لوگ دین میں بدعت ایجاد کرتے ہیں' یعنی وہ افراد جو دین میں ایسی چیزیں بنا کر داخل کرتے ہیں' اور ایسی چیزیں لاتے ہیں' جو دین کا حصہ نہیں ہیں۔ اِدْخالُ مَا لَیْسَ فِی الدِّیْنِ فِی الدِّین. کو بدعت کہتے ہیں' یعنی کوئی شخص ایک ایسی چیز کو لاکر جو دین کا حصہ نہیں ہے' دین کے نام سے دین میں داخل کردے' اس انداز سے کہ لوگ یہ سمجھیں کہ یہ دین کا حصہ ہے۔ اس کے برعکس بھی ہے۔ ایک ایسی چیز جو دین کا حصہ ہے' اسکے ساتھ ایسا کام کریں کہ لوگ سمجھیں کہ یہ دین کا حصہ نہیں ہے۔ دونوں صورتیں بدعت ہیں۔ (اس مقام پر حدیث کی وضاحت سے پہلے ایک نکتے کا ذکر ضروری ہے)

بدعت اور اختراع

آج کل ''اختراع'' کو ''بدعت'' کہا جاتا ہے۔ دین کے علاوہ دوسرے معاملات میں اختراعات میں کوئی برائی نہیں ہے۔ ایک انسان شاعری میں مخترع بننا چاہتا ہے' ایک انسان ہنر میں مخترع ہونا چاہتا ہے' کوئی فلسفے میں مخترع بننے کا خواہشمند ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن دین میں اختراع کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کیونکہ دین لے کر آنے والے ہم نہیں ہیں۔ حتیٰ امامؑ بھی دین لے کر نہیں آئے ہیں۔ امامؑ پیغمبرؐ کے وصی اور اُن کے علم کا مخزن ہیں۔ جو کچھ پیغمبرؐ نے فرمایا ہے (یہ اُسے بیان کرتے ہیں)۔

خود پیغمبر بھی دین {ایجاد کرکے} نہیں لائے ہیں۔ خدا پیغمبر کو کبھی فرشتے کے ذریعے اور کبھی فرشتے کے بغیر دین کی وحی کرتا ہے' پیغمبر لوگوں تک پہنچاتا ہے' اور اس سب کو ایک ساتھ امام کے لئے بیان کرتا ہے۔ حتیٰ پیغمبر بھی دین کو {ایجاد کرکے} نہیں لائے ہیں۔

دین میں اختراع غلط ہے' بدعت ہے اور حرام ہے۔ ہاں' نئے استنباط (deduction) کرنا درست ہے' یہ اختراع نہیں ہے۔ اخباری حضرات اجتہاد کو اختراع تصور کرتے

۱۔ تو انہیں مبہوت کردو۔

ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تمام اجتہادات بدعت ہیں۔ وہ غلط سمجھتے ہیں۔ اجتہاد یعنی حسنِ استنباط۔ ممکن ہے ایک مجتہد کسی بات کا نئے انداز سے استنباط کرے' جسے پہلے وہ خود یا دوسرے کسی اور طرح سے استنباط کیا کرتے تھے۔ یہ استنباط کا مسئلہ ہے' ایجاد کا نہیں۔ آج' ہر جدت کو بدعت کا نام دیتے ہیں اور بدعت کی حمایت کرتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ فلاں نے بدعت ایجاد کی ہے۔ لیکن ہمیں غلط فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہئے۔ سرے سے یہ اصطلاح ہی غلط ہے۔ ہمارے یہاں قدیم زمانے ہی سے ''بدعت'' کے معنی دین میں اختراع کرنا ہیں' اِدْخَالٌ فِي الدِّينِ مَالَيْسَ فِي الدِّينِ. کسی اور چیز کو بدعت نہیں کہنا چاہئے۔ البتہ بعد میں رفتہ رفتہ یہ نہ کہنے لگے گا کہ بدعت میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ ہم نے اسے اس لئے بیان کیا ہے تاکہ بعض جوان غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اگر آج اختراع کو بدعت کہتے ہیں' تو اگر یہ بدعت ہنری' شعری' فلسفی یا علمی مسائل میں ہو' تو نہ صرف عیب نہیں بلکہ کمال ہے۔ لیکن دین میں' اور وہ بھی اختراع کے معنی میں' نہ کہ اجتہاد کے معنی میں یعنی جو چیز دین میں نہیں ہے اسے اپنی طرف سے گھڑ لینا' گناہانِ کبیرہ میں سے ہے۔ یہاں تک کہ حدیث ہے:

''مَنْ زَارَ مُبْدِعاً (مُبْتَدِعاً) فَقَدْ خَرَّبَ الدِّينَ.''

جو شخص کسی بدعتی سے ملنے کے لئے گیا' اُس نے دین کو برباد کر دیا۔ یعنی اگر کوئی شخص دین میں کوئی بدعت پیدا کرتا ہے' تو دوسروں پر اس سے میل ملاقات حرام ہے' ایسے شخص کے ساتھ میل جول رکھنا تک حرام ہے۔

بہرحال' بدعتی افراد کے بارے میں ایک حدیث ہے' جس کے ضمن میں کہا گیا ہے کہ جب بھی تم بدعت ایجاد کرنے والوں کو دیکھو' تو ''فَبَاهِتُوهُمْ.'' ''بَاهِتُوهُمْ'' ''یہ'' ''بَهَتَ'' سے نکلا ہے اور یہ دو مقامات پر استعمال ہوتا ہے' ایک مبہوت کرنے' شکست دینے اور متحیر کر دینے کے معنی میں' جیسا کہ خود قرآنِ مجید میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے زمانے کے جبار سے بحث و مباحثہ کیا اور آخرکار فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ. وہ ابراہیم کی منطق کے مقابلے میں زچ ہو گیا' مبہوت ہو گیا' ناکام ہو گیا' ذلیل ہو گیا۔ اور دوسرے بہتان یعنی جھوٹ گھڑنے کے معنی میں' جس

کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ آیت سُبْحَانَکَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِیْمٌ. میں بہتانِ عظیم یعنی بڑے جھوٹ کے معنی میں آیا ہے۔ شیخ انصاریؒ وضاحت کے ساتھ فرماتے ہیں کہ اگر بدعت کی بنیاد رکھنے والوں سے سامنا ہو تو بَاهِتُوهُمْ یعنی مضبوط منطق کے ساتھ ان کا مقابلہ کرو، انہیں مبہوت کردو، جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے زمانے کے جبّار کے ساتھ بحث و مباحثہ کیا تھا اور اسے مبہوت کردیا تھا۔ فَبُهِتَ الَّذِیْ کَفَرَ.

بدعت گزاروں کا مقابلہ منطق کے ساتھ کرو، تاکہ لوگ جان لیں کہ یہ بدعتی ہیں اور جھوٹ بولتے ہیں۔ ان کے ساتھ بحث و مباحثہ کرو اور انہیں شکست سے دوچار کردو۔

کچھ لوگوں نے اس حدیث سے اس طرح استفادہ کیا ہے کہ اگر بدعتی لوگوں سے سامنا ہو تو جھوٹ بولنا جائز ہے، اُن کی طرف جو بات منسوب کرنا چاہو کردو، جو جھوٹ بولنا چاہو بول دو۔ یعنی بدعتی افراد کی سرکوبی کے لئے، جو ایک مقدس مقصد ہے، اس ناجائز ذریعے یعنی جھوٹی نسبت دینے سے استفادہ کرو۔ اس طرح اس بات کا دائرہ مزید پھیلتا جاتا ہے۔ معقول لوگ کبھی ایسی بات نہیں کرتے، جبکہ نامعقول لوگ بہانہ تلاش کررہے ہوتے ہیں۔

نفس کی چالبازیاں عجیب ہیں! نفسِ امارہ کی مکاریاں عجیب ہیں! کبھی کبھی انسان کا نفس ایسی مکاریاں کرتا ہے کہ وہ خود بھی نہیں سمجھ پاتا۔ مثلاً پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کی شب ہے اور جشن منعقد کرنا چاہتا ہے، شبِ مسرت ہے، اب کیونکہ خوشی و مسرت کی شب ہے لہٰذا فسق و فجور کا ارتکاب کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ خوشی کی رات ہے، پیغمبر کی ولادت کی شب ہے، کیا کوئی مضائقہ ہے؟! میں تو نبی اکرمؐ کی خاطر یہ کام کررہا ہوں!

ایک داستان ہے، اس کا تعلق اُس زمانے سے ہے جب ایک ''شاہی'' (۱) کی اہمیت تھی۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص شراب کی دکان پر گیا اور دکاندار سے ایک شاہی کی شراب طلب کی۔ دکاندار نے کہا کہ ایک شاہی کی تو شراب نہیں آتی۔ کہنے لگا: جتنی آتی ہو دے دو، آخر ایک شاہی بھی کچھ نہ

۱۔{ایک قدیم ادنیٰ ایرانی سکہ۔}

کچھ تو ہوتی ہے۔ دکاندار مصر تھا کہ نہیں کچھ نہیں آئے گا۔ کہنے لگا کہ ایک قران (۱) کی جتنی شراب ہوتی ہے اسے بیس پر تقسیم کر دو اور وہی مجھے دے دو۔ دکاندار نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک چھوٹی پیالی کی تہ بھی نہیں بھرے گی۔ اُس نے کہا وہی دے دو۔ دکاندار نے کہا کہ لوگ شراب پیتے ہیں تا کہ مست ہو جائیں' اتنی سی شراب کا کیا فائدہ جو میں تمہیں دوں؟ اُس نے کہا تم اتنی ہی دے دو' اس کی بدمستی میرا ذمہ ہے۔

بعض لوگ بدمستی کے لئے بہانے کی تلاش میں رہتے ہیں' پھر بدمستی اُن کی ذمے داری ہوتی ہے۔ بس آوارگی اور بدمستی کے لئے ایک بہانہ مل جائے' ان کے لئے کافی ہے۔ کہتے ہیں: ہمیں اجازت دی گئی ہے کہ بدعتی افراد کے لئے جو دل میں آئے جھوٹ گھڑ لیں۔ اس کے بعد {ایسا فرد} جس سے بھی اسے ذاتی دشمنی ہو' اس کی طرف فوراً ایک جھوٹی نسبت دے دیتا ہے' اُس پر ایک تہمت لگا دیتا ہے اور پھر کہہ دیتا ہے کہ وہ بدعتی شخص ہے۔ باتیں گھڑنا' تہمت لگانا اور جھوٹ بولنا شروع کر دیتا ہے۔ کیوں؟ کہتا ہے ہمیں اجازت ملی ہوئی ہے۔ پھر آپ دیکھیں کہ دین کی کیا درگت بنتی ہے؟! ہمارا فرنگی افکار رکھنے والا کہتا ہے "اَلْغایاتُ تُبَرِّرُ الْمَبادی." "مقصد نیک ہونا چاہئے' جب مقصد نیک ہو' تو {اسکے حصول کا} ذریعہ کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ ہمارا قدامت پرست بھی کہتا ہے کہ ہمیں کہا گیا ہے "باھِتوھُم." "ہمیں حق حاصل ہے کہ جو ہمارا دل چاہے بول دیں' اور جو ہمارا دل چاہے گا ہم بولیں گے۔ پھر آپ دیکھئے گا کہ دین کی کیا حالت ہوتی ہے؟!

ابوہریرہ اور پیاز فروش

جس زمانے میں ابوہریرہ' معاویہ کی جانب سے مکہ کے حاکم تھے' اس زمانے میں ایک شخص عکہ (یہی موجودہ عکہ) سے پیاز فروخت کرنے کے لئے مکہ آیا۔ وہ پیاز کسی نے نہیں خریدی۔ پیاز یوں ہی پڑی رہی' اسے کسی اور جگہ لے جانا بھی ممکن نہیں تھا' گرمی میں سڑ رہی تھی۔ وہ شخص ابوہریرہ کے پاس گیا اور بولا: اے ابوہریرہ! ایک ثواب کا کام کر سکتے ہو؟ کہا: کیسا ثواب؟ بولا: میں ایک

۱۔ {قران' عہد قاچار میں ایرانی کرنسی کی ایک اکائی تھی۔}

مسلمان ہوں' مجھے بتایا گیا تھا کہ مکہ میں پیاز نہیں ہوتی اور مکہ کے لوگوں کو پیاز کی ضرورت ہے'
میرے پاس جتنا سرمایہ تھا' اُس سے میں نے پیاز خرید لی اور اُسے یہاں لے آیا' اب یہاں کوئی
اُسے خرید نہیں رہا' اور پیاز خراب ہو رہی ہے۔ تم ایک مومن کی مشکل حل کر سکتے ہو' ایک انسان کو
مرنے سے بچا سکتے ہو۔ کیا تم یہ کام کر سکتے ہو؟ کہا: ٹھیک ہے' جمعے کے دن' نمازِ جمعہ کے وقت' تم
پیاز ایک مقررہ مقام پر لے آنا' پھر میں دیکھ لوں گا۔ اس دن جب تمام لوگ جمع ہوئے تو ابو ہریرہ
نے خطاب کرتے ہوئے کہا: اَيُّهَا النَّاسُ سَمِعْتُ مِنْ حَبِيبِي رَسُولِ اللّٰه. {اے لوگو!} میں
نے اپنے حبیب رسول اللہ سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا: مَنْ اَكَلَ بَصَلَ عَكَّةَ فِي مَكَّةَ
وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ. جو کوئی عکہ کی پیاز مکہ (۱) میں کھائے گا اس کے لئے جنت واجب ہے۔ {یہ
سننے کے بعد} ایک گھنٹے کے اندر اندر لوگوں نے ساری پیاز خرید لی۔ ابو ہریرہ کا ضمیر بھی مطمئن تھا
کہ میں نے ایک مومن کی مشکل حل کی ہے' ایک مسلمان تاجر کو دیوالیہ ہونے سے بچالیا ہے۔

ذرا سوچئے کیا پیغمبر کی حدیث کو ان کاموں کے لئے ذریعہ بنانا چاہئے؟ اس کے بعد اسی
حوالے سے کیا کچھ نہیں کہا گیا! شاید شہروں کی فضیلت میں بیان کی گئی سو میں سے پچانوے خبریں
اور حدیثیں وہ ہیں جو لوگوں نے اپنے فائدے کے لئے گھڑی ہیں۔ مثلاً کہا گیا ہے کہ پیغمبر نے
فرمایا: خَيْرُ الْقُرىٰ بَيْهَق. بہترین قریہ (اس میں گاؤں اور شہر دونوں شامل ہیں) بیہق ہے' یہی
جو سبزوار کے نزدیک واقع ہے۔ نبی اکرمؐ کو بیہق سے کیا مطلب کہ وہ اتنے سارے مقامات کو چھوڑ
کر یہ کہیں کہ خَيْرُ الْقُرىٰ بَيْهَق. کیوں؟ اس لئے کہ بیہق کے رہنے والے فلاں صاحب اپنے
لئے کوئی راستہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اسی طرح کی اور باتیں کہ اگر ہم ان کی مثالیں بیان کرنا
شروع کریں' تو الی ماشاءاللہ بہت زیادہ ہیں اور ہم انہیں ذکر کرنا نہیں چاہتے' لیکن اتنا جان لیجئے
کہ ان چیزوں نے دین کو خراب کیا ہے' حالانکہ جیسا کہ انہوں نے (علامہ طباطبائی) نے فرمایا ہے
کہ آدابِ نبوت اور تمام انبیا کی مجموعی سیرت کا حصہ یہ رہا ہے کہ انہوں نے مقدس مقصد' یعنی حق

۱۔ خاص طور پر مکہ میں' مکہ کے سوا اور کہیں نہیں' اور وہ پیاز بھی عکہ کی ہو عکہ کے سوا کسی اور جگہ کی نہ ہو۔

کے لئے کسی صورت باطل سے استفادہ نہیں کیا۔

حضرت علیؑ اور ذریعے کا استعمال

حضرت علی علیہ السلام کی سیاست میں لچک کیوں نہیں تھی؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُن کا مقصد نیک تھا۔ ابن عباس جیسے لوگ انہیں آخر کیا مشورہ دے رہے تھے؟ مغیرۃ بن شعبہ جیسے لوگوں کی تجویز آخر کیا تھی؟ یہی مغیرۃ بن شعبہ جو بعد میں معاویہ کے خاص اصحاب اور حضرت علیؑ کے دشمنوں میں شامل ہوگیا تھا' یہ امیر المومنینؑ کی خلافت کے آغاز میں گفتگو کے لئے آپ کے پاس آیا' پہلے بڑے ہی سیاسی انداز میں آپ کو یہ مشورہ دیا کہ میرا خیال ہے کہ آپ فی الحال معاویہ کے بارے میں کچھ نہ بولیں' حتیٰ اس کی توثیق کردیں۔ یعنی حکمرانی کے لائق دوسرے لوگوں کی طرح' فی الحال اسکی بھی توثیق کردیں' اسے نظر انداز کردیں تاکہ وہ مطمئن ہوجائے' اور پھر جوں ہی حالات پر آپ کی گرفت ہوجائے' یکایک اسے معزول کردیں۔ حضرت نے فرمایا: میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا' کیونکہ اگر میں وقتی طور پر معاویہ کی توثیق کردوں' تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں معاویہ کو چاہے وقتی طور پر ہی سہی' حکومت کے لائق سمجھتا ہوں' جبکہ میں اسے اس لائق نہیں سمجھتا' اور میں اس بارے میں لوگوں سے غلط بیانی بھی نہیں کروں گا' زبردستی بھی نہیں کروں گا۔ جب مغیرۃ بن شعبہ نے دیکھا کہ اس کی باتیں بے اثر ثابت ہورہی ہیں' تو کہنے لگا کہ میں نے بھی غور کیا تھا تو اسی نتیجے پر پہنچا تھا کہ آپ کو ایسا ہی کرنا چاہئے' آپ حق بجانب ہیں۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ ابن عباس نے کہا: اس نے جو پہلی بات کہی تھی وہ اس کے دل کی بات تھی لیکن اس نے جو دوسری بات کی وہ اس کی سوچ نہیں تھی۔ مغیرہ اس گفتگو کے بعد معاویہ کے پاس چلا گیا۔

حضرت علی علیہ السلام نے کیوں اس کی بات نہیں مانی؟

اس لئے کہ آپ انبیاؑ کی راہ و روش پر چلنے والے تھے اور اس قسم کی سیاست بازیوں کے حق میں نہیں تھے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ ابوبکر نابغہ تھے' عمر نابغہ تھے' ان کا یہ نابغہ ہونا اسی حوالے سے تھا کہ وہ اپنے مقصد کے لئے کوئی بھی ذریعہ استعمال کرلیتے تھے۔ کچھ لوگ کیوں علیؑ کی سیاست کو

قبول کرنا نہیں چاہتے؟ کیونکہ دیکھتے ہیں کہ ان کی سیاست میں لچک نہیں ہے' ان کا ایک ہدف ہے اور کچھ ذرائع ہیں۔ ان کا ہدف حق ہے' جب وہ حق تک پہنچنا چاہتے ہیں' تو ہر گام پر ایسے ذریعے سے استفادہ کرتے ہیں جو حق ہو' تا کہ اس ہدف حق تک پہنچ جائیں۔ لیکن دوسرے لوگ' اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ ان کا ہدف حق ہے' تب بھی وہ ذرائع کو اہمیت نہیں دیتے' وہ کہتے ہیں کہ مقصد نیک ہونا چاہئے۔

رسولِ اکرمؐ اور ذرائع کا استعمال

قبیلۂ ثقیف کے کچھ لوگ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: اے اللہ کے رسول! ہم مسلمان ہونا چاہتے ہیں لیکن ہماری تین شرطیں ہیں' آپ ان شرائط کو مان لیجئے۔ ایک شرط یہ ہے کہ آپ ہمیں ایک سال اور ان بتوں کی پرستش کی اجازت دیجئے۔ (ان لوگوں کی طرح جو یہ کہتے ہیں کہ ہمیں ایک بار پیٹ بھر کر کھانے دو) آپ ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم ایک سال مزید اچھی طرح ان بتوں کی پرستش کرلیں تا کہ اس عمل سے اچھی طرح ہمارا پیٹ بھر جائے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ یہ نماز ہمارے لئے بہت سخت اور ناگوار ہے۔ (عربوں کو ان کا تکبر اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ رکوع اور سجود بجالائیں' اور کیونکہ پوری نماز خشوع اور خضوع ہی پر مشتمل ہے' اس لئے ان کی طبیعت پر بہت گراں گزرتی تھی)۔ تیسری شرط یہ ہے کہ ہمیں اپنے بڑے بت کو اپنے ہاتھوں سے توڑنے کے لئے نہ کہے گا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ان تین شرطوں میں سے آخری شرط جو یہ ہے کہ تم فلاں بت کو اپنے ہاتھوں سے نہیں توڑو گے' اس میں کوئی مضائقہ نہیں' میں {اس کام کے لئے} کسی اور کو بھیج دوں گا۔ لیکن تمہاری دوسری شرطیں' محال ہیں۔

یعنی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہرگز یہ نہیں سوچا کہ ایک قبیلہ آ کے مسلمان ہونا چاہتا ہے' اس نے چالیس سال بت پرستی کی ہے' چلو ایک سال اور کرنے دو' ایک سال بعد آ کے مسلمان ہو جائے۔ اگر آپ ایسا کرتے تو اس کا مطلب بت پرستی کی تائید کرنا ہوتا۔ نہ صرف ایک

سال بلکہ اگر وہ کہتے کہ یارسول اللہ! ہم آپ سے معاہدہ کرتے ہیں کہ صرف ایک دن اور بتوں کی پوجا کرنے دیجئے' اس کے بعد ہم مسلمان ہو جائیں گے (اور پیغمبرؐ معاہدے کی رو سے ایک دن کے لئے ایسا کرنا قبول کر لیتے)' تو یہ قبول کرنا محال تھا۔ اگر وہ کہتے کہ یارسول اللہ! ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم ایک دن نماز نہ پڑھیں' اسکے بعد مسلمان ہو کر نماز پڑھیں گے (اور یہ ایک دن نماز نہ پڑھنا پیغمبر اکرمؐ سے معاہدے کے مطابق اور ان کی رضامندی سے ہو) تو محال تھا کہ پیغمبرؐ اس بات کی اجازت دیتے۔ پیغمبرؐ ہر طریقے سے استفادہ نہیں کیا کرتے تھے۔

دین کے مفاد میں' لوگوں کی جہالت سے فائدہ اٹھانا

میرے نزدیک سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ ناجائز ذرائع کا استعمال خود ایک علیحدہ مسئلہ ہے' اس سے زیادہ حساس اور نازک بات یہ ہے کہ کیا حق کی خاطر لوگوں کی غفلت سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے؟

لوگوں کے خواب غفلت سے' لوگوں کی جہالت اور نادانی سے دین کے حق میں استفادہ ایک مسئلہ ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کم ہی لوگ ہوں گے جو کہیں گے کہ اس میں کوئی مضائقہ ہے۔ کہیں گے' یہ بیچارہ ایک جاہل آدمی ہے' نادان انسان ہے' بے خبر شخص ہے' اپنی اسی بے خبری' جہالت اور نادانی کے عالم میں اسکے بعض عقائد بن گئے ہیں۔ فلاں شخص نے بی بی شہر بانو کے حوالے سے مثلاً کوئی عقیدہ یا ایمان بنالیا ہے۔ اب ہمیں کیا کہ اسے اسکی اس غفلت سے بیدار کریں' اس نے بلا' خراہی راستے سے ایک عقیدہ بنالیا ہے کہ امام زین العابدین علیہ السلام کی مادر گرامی شہر بانو حقیقتاً کربلا میں موجود تھیں اور جب امام حسین علیہ السلام شہید ہو گئے' تو وہاں بندھے ہوئے ایک گھوڑے پر سوار ہوئیں اور اسے ایک چابک رسید کیا۔ پھر عمر سعد کے سپاہیوں نے ان کا تعاقب کیا ہے اور بی بی اُن سے بچ کر آ گئیں۔ اب اگر یہ کہیں کہ بی بی شہر بانو کے گھوڑے نے عزم کیا ہوا تھا' تو یہ بھی کہنا پڑے گا کہ لشکر عمر سعد کے گھوڑے بھی عزم کئے ہوئے تھے کہ ایک مرتبہ میں ڈیڑھ سو فرسخ تک دوڑ کر آئے' بلکہ ان کا عزم تو زیادہ ہوا' کیونکہ جب بی بی شہر

بانو اس پہاڑ پر پہنچی ہیں' تو اُن کا گھوڑا تھک چکا تھا اور وہ لوگ سر پر پہنچ گئے تھے' جب وہ انہیں گرفتار کرنے کے لئے ان کے قریب آئے تو انہوں نے کہنا چاہا کہ "یا ھو" مجھے اپنی پناہ میں لے لے لیکن اسکی بجائے غلطی سے ان کے منہ سے نکلا کہ "یا کوہ" مجھے پناہ میں لے لے اور یوں کوہ (پہاڑ) نے انہیں اپنی پناہ میں لے لیا!

عجیب بات ہے۔۔۔ تاریخ و حدیث ہمیں بتاتی ہے کہ امام سجاد سلام اللہ علیہ کی والدہ ماجدہ نفاس کی حالت میں یعنی وضع حمل کے فوراً بعد وفات پا گئی تھیں اور کربلا کی جنگ میں موجود ہی نہیں تھیں۔ آپ کو ایک مقتل بھی ایسا نہیں ملے گا' جو یہ کہتا ہو کہ امام زین العابدین علیہ السلام کی والدہ (خواہ وہ بی بی شہر بانو ہوں یا کوئی اور خاتون) کربلا میں موجود تھیں۔ یہ افسانہ سازوں کا بنایا ہوا ایک افسانہ ہے۔ کچھ لوگ اس کے بھی معتقد ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں اس سے کیا' جھوٹ ہے تو ہوا کرے' لیکن آخر کار لوگوں میں اسی راہ سے ایک ایمان اور ایک اعتقاد پیدا ہو گیا ہے۔ یہ درست ہے یا نہیں؟ یعنی لوگ خوابِ غفلت کی وجہ سے' جہالت و نادانی کے سبب سے' کچھ خرافات کی باعث' آخر کار ایک درست عقیدے تک پہنچ گئے ہیں۔

کیا ہمیں اس بات کا حق ہے کہ ہم اس کی تائید کریں؟

نہیں۔

امیر المومنین علیہ السلام کا وہ کلام جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں' اس میں ایک نکتہ تھا' جسے عرض کرنا ہم بھول گئے تھے۔ جہاں آپ فرماتے ہیں:

"طبیبٌ دَوّارٌ بطِبِّہ قَدْ اَحْکَمَ مَراهِمَهُ وَاَحْمیٰ مَواسِمَهُ."

اسکے بعد اسکے ذیل میں فرماتے ہیں:

"یَضَعُ مِنْ ذٰلِکَ حَیْثُ الْحاجَةُ اِلَیْهِ مِنْ قُلُوبٍ عُمْیٍ وَ آذانٍ صُمٍّ وَاَلْسِنَةٍ بُکْمٍ."(۱)

۱۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۱۰۶

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو ذرائع اور جو وسائل استعمال کیا کرتے تھے' کہیں تو طاقت اور داغنے کے اوزار کا استعمال کرتے تھے اور کہیں مرہم کا۔ ایک مقام پر تندی اور سختی کا رویہ رکھتے تھے ایک جگہ نرمی کا۔ لیکن وہ اسکے موقع محل سے واقف تھے۔

اسکے بعد یوں بیان کرتے ہیں: جس مقام پر بھی ان ذرائع سے استفادہ کرتے تھے' وہ لوگوں کی بیداری اور آگہی کی خاطر ہوتا تھا۔ تلوار کو اس مقام پر کام میں لاتے تھے جہاں لوگوں کو بیدار کرنا مقصود ہوتا تھا' انہیں سُلانے کے لئے اسے استعمال نہیں کرتے تھے۔ اخلاق کو اس جگہ کام میں لاتے تھے' جہاں وہ آگہی اور بیداری کا سبب بنتا تھا۔ تلوار کو اس جگہ استعمال کرتے تھے جہاں نابینا کے دل کو بینا کرتے تھے' بہرے کے کانوں کو سننے والا بناتے تھے' اندھے کی آنکھ کو دیکھنے والا بناتے تھے' گونگے کی زبان کو گویا کرتے تھے۔ یعنی پیغمبرؐ جو بھی ذرائع استعمال کرتے تھے' وہ لوگوں کی بیداری کے لئے تھے۔

پیغمبرؐ کے بچے کی وفات اور سورج گرہن

ایک داستان ہے' جو ہماری حدیث کی کتابوں میں موجود ہے' حتیٰ اہلِ سنت نے بھی اسے نقل کیا ہے۔ ماریہ قبطیہ سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک بیٹا تھا' جس کا نام ابراہیم تھا۔ یہ بیٹا' جس سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بہت پیار تھا' ڈیڑھ سال کی عمر میں دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔

قدرتی بات ہے رسولِ اکرمؐ جو پیکرِ محبت تھے' غمگین ہو جاتے ہیں' حتیٰ ان کی آنکھوں سے اشک جاری ہو جاتے ہیں اور فرماتے ہیں: دل جلتا ہے اور آنسو بہتے ہیں' اے ابراہیم ہم تمہاری خاطر غمگین ہیں' لیکن رضائے الٰہی کے برخلاف کوئی بات زبان پر نہیں لائیں گے۔

کیونکہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دل مغموم تھا' اسلئے تمام مسلمان بھی حزن وملال کا شکار تھے۔ اتفاق سے اسی دن سورج گرہن ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں کو یقین ہے کہ سورج گرہن' پیغمبرؐ کے غم میں عالمِ بالا کا ساتھ دینا ہے۔ یعنی رسولؐ کے بیٹے کی وفات کی وجہ سے سورج کو گرہن

لگا ہے۔(۱)۔

یہ بات مدینہ کے لوگوں میں پھیل گئی اور مرد وزن ایک زبان ہو کر کہنے لگے کہ دیکھا! سورج پیغمبر اکرمؐ پر طاری ہونے والے غم میں گہنا گیا۔ حالانکہ پیغمبر اکرمؐ نے لوگوں سے نہیں کہا تھا کہ (نعوذ باللہ) سورج گرہن اس وجہ سے ہوا ہے۔ اس بات کی وجہ سے رسولِ اکرمؐ پر لوگوں کا ایمان اور اعتقاد بڑھ گیا اور لوگ بھی اس قسم کے مسائل میں اس سے زیادہ غور وفکر نہیں کرتے۔

لیکن نبی اکرمؐ کیا کرتے ہیں؟

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں چاہتے کہ لوگوں کی ہدایت کے لئے اُن میں موجود کمزوریوں سے فائدہ اٹھائیں، وہ اُن کی قوی چیزوں سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں، پیغمبر اکرمؐ نہیں چاہتے کہ اسلام کے مفاد میں لوگوں کی جہالت اور نادانی سے فائدہ اٹھائیں۔ وہ لوگوں کے علم و معرفت سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں۔ پیغمبر نہیں چاہتے کہ لوگوں کی لاعلمی اور غفلت سے فائدہ اٹھائیں، وہ چاہتے ہیں کہ لوگوں کی بیداری سے استفادہ کریں، کیونکہ قرآن نے انہیں حکم دیا ہے: اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (۲) اور کچھ ذرائع کا ذکر کیا ہے۔

(پیغمبر اکرمؐ نے یہ نہیں سوچا کہ) عوام الناس نے اپنی جہالت سے یہ بات کہی ہے، خُذِ الْغَایَاتِ وَ اتْرُکِ الْمَبَادِیَ. (۳) آخر انہوں نے اس سے اچھا نتیجہ حاصل کیا ہے، میں نے تو ان سے نہیں کہا، میں یہاں خاموش رہتا ہوں۔ {نہیں، آپ نے} خاموشی بھی اختیار نہیں کی آپ منبر پر تشریف لائے، گفتگو فرمائی اور لوگوں کو مطمئن کر دیا۔ آپ نے فرمایا: یہ جو سورج

۱۔ البتہ اس بات میں اپنی حد تک کوئی مانع نہیں ہے۔ نبی اکرمؐ کی خاطر دنیا کا زیروزبر ہو جانا ممکن بات ہے۔ یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے۔

۲۔ اپنے پروردگار کے راستے کی طرف حکمت (عقلی دلائل) اور اچھی نصیحت کے ذریعے دعوت دو اور بہترین طریقے سے ان کے ساتھ بحث ومباحثہ کرو۔ (سورۂ نحل ۱۶۔ آیت ۱۲۵)

۳۔ مقاصد کو پیشِ نظر رکھو ذرائع پر توجہ نہ دو۔

گرہن ہوا تھا' یہ میرے بیٹے کی وجہ سے نہیں تھا۔

جو شخص حتیٰ اپنی خاموشی سے بھی غلط فائدہ نہیں اٹھاتا' اسے ایسا ہونا چاہئے' کیوں؟ اس لئے کہ اولاً تو اسلام کو ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ لوگ جن کے دین کی کوئی منطق نہیں' جو دلیل و برہان نہیں رکھتا' جن کے دین کی حقانیت کے آثار واضح اور نمایاں نہیں ان کے لئے چھوڑ دو وہ جھوٹے خوابوں' جعلی باتوں اور اس قسم کی خاموشیوں سے استفادہ کریں۔ اسلام کو اس قسم کی چیزوں کی ضرورت نہیں ہے۔ ثانیاً جو شخص ان چیزوں سے استفادہ کرتا ہے' وہ بھی آخر کار غلطی کرتا ہے۔ مشہور کہاوت ہے کہ سب لوگوں کو ہمیشہ جہالت میں نہیں رکھا جا سکتا۔ یعنی کچھ لوگوں کو ہمیشہ جہالت میں رکھا جا سکتا ہے' تمام لوگوں کو بھی ایک عرصے تک جہالت اور بے خبری میں مبتلا رکھا جا سکتا ہے' لیکن سب لوگوں کو ہمیشہ کے لئے جاہل نہیں رکھا جا سکتا۔ قطع نظر اسکے کہ خدا اس بات کی اجازت نہیں دیتا (بالفاظ دیگر) اگر یہ اصول نہ بھی ہوتا' تب بھی ایک پیغمبرؐ جو اپنے دین کو تا ابد قائم رکھنا چاہتا ہے' کیا وہ نہیں جانتا کہ سو سال بعد' دو سو سال بعد' ایک ہزار سال بعد لوگ آ کر ایک دوسرے طریقے سے فیصلہ کریں گے؟! اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خدا اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔

اچھے مقصد کے لئے جائز ذریعہ

حق کے لئے حق ہی سے استفادہ کرنا چاہئے۔ اس بات کے معنی یہ ہیں کہ: اگر میں جانتا ہوں کہ ایک ناحق اور نادرست بات' ایک جھوٹ' ایک ضعیف حدیث' ایک ایسی حدیث جس کے بارے میں' میں خود جانتا ہوں کہ وہ جھوٹی ہے' اگر میں وہ آپ کو سناؤں' تو آج ہی کی رات' آپ میں سے تمام گناہ گار توبہ کر لیں گے اور آپ سب نماز شب پڑھنے لگ جائیں' (اس کے باوجود) سلام مجھے اس عمل کی اجازت نہیں دیتا۔

کیا اسلام اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ ہم جھوٹ بولیں تا کہ لوگ امام حسین علیہ السلام لئے گریہ کریں؟ سننے والا تو نہیں جانتا کہ یہ جھوٹ ہے۔ امام حسین علیہ السلام پر اشک فشانی

بھی بے شک باعث اجر وثواب ہے۔ کیا اسلام {اسکے باوجود جھوٹ بولنے کی} اجازت دیتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

اسلام کو ان جھوٹی باتوں کی ضرورت نہیں ہے۔ حق میں باطل کی آمیزش کر دینا' حق کو ختم کر دیتا ہے۔ جب انسان حق کو باطل کے ساتھ ملحق کر دیتا ہے' تو پھر حق کھڑا نہیں رہ سکتا' خود بخود ختم ہو جائے گا۔ حق کو باطل کے ساتھ باقی رہنے کی تاب نہیں ہے۔

کہتے ہیں: کسی شہر کے ایک بڑے عالم دین کوئی مجلس سن رہے تھے۔ اس مجلس میں ایک صاحب جن کے سر پر سیدوں والی پگڑی بندھی ہوئی تھی' جھوٹے مصائب بیان کر رہے تھے۔ وہ عالم دین جو ایک بڑے مجتہد تھے' نیچے سے پکارے: جناب یہ کیا بیان کر رہے ہیں؟ وہ منبر سے چیخ کر بولا: تم جاؤ اپنے فقہ اور اصول سے کام رکھو' مجھے اپنے جد کا اختیار حاصل ہے' جو میرا دل چاہے گا میں بولوں گا۔ ''مجھے اپنے جد کا اختیار حاصل ہے'' سے کیا مراد ہے؟!

ہمارا مقصد یہ ہے کہ: جن راستوں سے مختلف حوالوں سے دین کو نقصان پہنچا ہے' ان میں سے ایک راستہ' اس اصول کا خیال نہ رکھنا ہے کہ جس طرح ہمارا ہدف نیک ہونا چاہئے' اسی طرح اس نیک ہدف کے لئے جو ذرائع ہم استعمال کریں' انہیں بھی مقدس ہونا چاہئے۔ مثلاً ہمیں جھوٹ نہیں بولنا چاہئے' غیبت نہیں کرنا چاہئے' تہمت نہیں لگانی چاہئے۔

ہمیں نہ صرف اپنے لئے جھوٹ نہیں بولنا چاہئے' بلکہ ہمیں دین کے فائدے کے لئے بھی جھوٹ نہیں بولنا چاہئے۔ یعنی دین کے مفاد میں بھی بے دینی سے کام نہیں لینا چاہئے۔ کیونکہ جھوٹ بولنا بے دینی ہے۔ دین کے مفاد میں جھوٹ بولنا' دین کے مفاد میں بے دینی کرنا ہے۔ دین کے مفاد میں تہمت لگانا' دین کے مفاد میں بے دینی کرنا ہے۔ دین کے مفاد میں غیبت کرنا' دین کے مفاد میں بے دینی کرنا ہے۔ دین اس بات کی اجازت نہیں دیتا' اگرچہ ہم خود اُس کے مفاد میں بے دینی کریں۔ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَ الْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ.

دیکھئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تبلیغی سیرت' جو آپ کی سیرت کا اہم ترین حصہ ہے' کیا تھی؟ نبی اکرمؐ نے کس طرح اسلام کی تبلیغ کی؟ کس طرح ہدایت و رہنمائی کی؟ بعد میں انشاء

اللہ ہم رسول اکرمؐ کی تبلیغی سیرت پر بات کریں گے اور کچھ عرائض پیش کریں گے۔

حضرت علیؑ اور دشمن پر پانی کی بندش

واقعاً ہمیں اپنے عظیم دینی پیشواؤں یعنی معصومین علیہم السلام کے حالاتِ زندگی پر غور وفکر کرنا چاہئے، ہمیں دیکھنا چاہئے کہ وہ کیسے تھے؟ اس بارے میں بہت زیادہ غور وفکر کی ضرورت ہے۔ جنگِ صفین، فرات کے ایک کنارے پر واقع ہوئی۔ معاویہ کے اصحاب نے ''گھاٹ'' یعنی اس جگہ پر قبضہ کرلیا جہاں سے پانی لیا جا سکتا تھا۔ بعد میں وہاں حضرت علیؑ پہنچے تو ان کے اصحاب کو پانی نہیں ملا۔ آپ نے کسی کو معاویہ کے پاس بھیجا اور ان سے کہا کہ ابھی تو ہم مذاکرات اور بات چیت کے لئے آئے ہیں، تاکہ خداوند متعال امن وامان کے ساتھ مسلمانوں کے درمیان اس مشکل کو حل کردے۔ تم نے ایسا کیوں کیا ہے؟ لیکن معاویہ جو یہ سمجھ رہے تھے کہ انہوں نے بڑی کامیابی حاصل کرلی ہے، وہ کچھ سننے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ جب امیر المومنینؑ نے دیکھا کہ کوئی فائدہ نہیں ہو رہا، تو حملے کا حکم دے دیا اور اسی دن شام ہونے سے پہلے پہلے معاویہ کے لشکر کو مار بھگایا گیا اور اصحابِ علیؑ نے گھاٹ پر قبضہ کرلیا۔ اب اصحاب نے کہا کہ ہم جیسے کو تیسا جواب دیں گے اور انہیں پانی نہیں لینے دیں گے۔ حضرت علیؑ نے فرمایا: لیکن میں ایسا نہیں کروں گا، کیونکہ پانی ایک ایسی چیز ہے جسے خدا نے کافر اور مسلمان سب کے لئے بنایا ہے۔ یہ عمل شجاعت اور مردانگی کے خلاف ہے، اُن لوگوں نے ایسا کیا، لیکن تم ایسا نہ کرنا۔ حضرت علی علیہ السلام نہیں چاہتے تھے کہ ایک بزدلانہ فعل کے ذریعے کامیابی حاصل کریں۔

بزرگوں کی سیرت میں ایسے بہت سے نکتے پائے جاتے ہیں۔

عمرو عاص اور ذریعے کا استعمال

ہم ایک داستان بیان کرتے ہیں، شاید بہت سے افراد یہ کہیں کہ اگر ہم علیؑ کی جگہ ہوتے، تو ایسا نہ کرتے۔

عمرو بن العاص انتہائی چالاک انسان تھا۔ ایک روز صفین کے میدان میں حضرت علیؑ آئے اور پکار کر بولے: اے معاویہ! کیوں اتنے مسلمانوں کا خون بہاتے ہو؟ تم خود آ جاؤ' ہم ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے ہیں' جو بھی جیتے' جو بھی ہارے۔ ایک صاف بات تھی' اس کا نتیجہ بھی پہلے ہی معلوم تھا۔ بسا اوقات عمرو عاص معاویہ سے کہا کرتا تھا: معاویہ! علیؑ ٹھیک کہہ رہے ہیں' بات تو یہی ہے' تم بھی تو ایک بہادر مرد ہو' اسلحہ اٹھا کر علیؑ کا مقابلہ کرو۔ معاویہ جو نتائج سے اچھی طرح باخبر تھے' انہوں نے ایک دن دھوکے سے عمرو عاص کو جنگ کے لئے بھیج دیا' لیکن حضرت علیؑ سے جنگ کے لئے نہیں۔ البتہ عمرو عاص بذاتہ ایک بہادر انسان تھا' مصر اسی نے فتح کیا تھا' وہ اسلحہ پہن کر میدانِ جنگ میں آیا اور مقابل طلب کیا۔

يَا قَادَةَ الْكُوفَةِ مِنْ اَهْلِ الْفِتَنْ

يَا قَاتِلِي عُثْمَانَ خَيْرِ الْمُؤْتَمَنْ

يَا اَيُّهَا الْاَشْرَافُ مِنْ اَهْلِ الْيَمَنْ

اَضْرِبُكُمْ وَ لَا اَرىٰ اَبَا حَسَنْ (۱)

ساتھ ہی وہ ادھر ادھر دیکھتا بھی جا رہا تھا کہ کہیں حضرت امیرؑ سے سامنا نہ ہو جائے۔ کہتا تھا: اَضْرِبُكُمْ وَ لَا اَرىٰ اَبَا حَسَنْ. تم لوگوں پر ضرب لگاؤں گا لیکن علیؑ نظر نہیں آ رہے۔ جن مقامات کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ وہاں حضرت ابوالفضل عباسؑ موجود تھے بظاہر اُن میں سے ایک مقام یہی ہے' اس وقت آپ چودہ سالہ نوجوان تھے۔ امیر المومنینؑ آہستہ آہستہ' اس طرح سے کہ عمرو عاص کو آغاز میں پتا نہ چل سکے کہ علیؑ ہیں' آگے بڑھتے رہے' بڑھتے رہے (لیکن آپ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ وہ آخر وقت تک غفلت ہی میں رہے)۔ عمرو عاص کو معلوم نہ ہو سکا کہ علیؑ ہیں' اور آپ اُس کے سر پر پہنچ گئے۔ جب آپ اسکے بالکل نزدیک پہنچ گئے' تو آپ نے یہ پسند نہیں کیا کہ اب بھی وہ نہ جان پائے کہ وہ کس کے سامنے ہے' {لہٰذا آپ نے} فرمایا: اَنَا الْاِمَامُ

۱۔ کتاب صفین' تالیف نصر بن مزاحم۔ ص ۴۷۱ معمولی فرق کے ساتھ۔

اَلْقُرَشِیُّ الْمُؤْتَمَن۔ میں ہوں قرشی موتمن امام۔ آپ نے اپنا تعارف کرایا: میں علی ہوں! اب عمرو عاص حواس باختہ ہوگیا' فوراً گھوڑے کا رُخ موڑا اور فرار ہونے لگا۔ امیر المومنینؑ نے اس کا تعاقب کیا اور اس پر اپنی تلوار سے وار کیا۔ وہ اچھل کر گھوڑے سے زمین پر گر گیا۔ مجھے نہیں معلوم اس نے کیا تیاری کر رکھی تھی' پہلے ہی سے کیا طے کر رکھا تھا' فوراً اپنی شرمگاہ کھول دی' کیونکہ وہ جانتا تھا کہ علیؑ ایسے انسان نہیں ہیں جو اس قسم کے انسان کا سامنا کریں۔ جیسے ہی اس نے ایسا کیا' حضرت اپنا منہ پھیر کر چلے گئے۔ بعد میں معاویہ اُسے کہتے رہتے تھے: اے عمرو عاص! تو نے اچھا ذریعہ اختیار کیا تھا' مجھے پوری دنیا میں کوئی ایک بھی ایسا شخص نہیں ملا جس نے اتنا مقدس ذریعہ اختیار کیا ہو۔

اب جو لوگ اپنے مقاصد کے لئے ہر ذریعہ استعمال کر لیتے ہیں' وہ عمرو عاص کے قبیل سے ہیں۔ جو کوئی بھی ہوتا' وہ یہی کہتا: افسوس! دیکھو تو علیؑ نے کیسے شخص کو کس موقع پر چھوڑ دیا؟! ٹھیک ہے' اسے ایک تلوار رسید کرتے اور اس کا کام تمام کر دیتے۔ لیکن علیؑ ایسے انسان نہیں تھے کہ عمرو عاص جیسے شخص کو قتل کرنے کے لئے بھی' جس نے اپنی نجات کے لئے اپنی شرمگاہ کو ذریعہ بنایا' حق کے راستے سے منحرف ہو جاتے۔ آپؑ نے اپنا منہ موڑا اور چلے گئے۔ ہم اس قسم کی باتوں کو ائمۂ اطہارؑ اور پیغمبر اکرمؐ کی سیرت میں بہت زیادہ پاتے ہیں: آپ حضرات اپنے دشمن کے مقابل بھی اپنے بلند اخلاق اور اپنے مکارمِ اخلاق کا دامن نہیں چھوڑتے تھے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو بتاتی ہیں کہ یہ حضرات ایک دوسری سطح کے لوگ تھے اور ایک دوسری سطح پر سوچا کرتے تھے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو حق وحقیقت کا محافظ سمجھتے تھے۔

امام حسینؑ اور ذریعے کا استعمال

امام حسین علیہ السلام کے لئے مسئلہ یہ نہیں تھا کہ آپ مارے جائیں گے یا نہیں مارے جائیں گے' مسئلہ یہ تھا کہ کہیں دین قتل نہ ہو جائے' دین کا ایک اصول' اگرچہ وہ ایک چھوٹا سا اصول ہی کیوں نہ ہو' پامال نہ ہو جائے۔

عاشور کی صبح ہوتی ہے۔ شمر ابن ذی الجوشن' خباثت میں شاید دنیا میں اسکی مثال نہ ہو' اسے اس بات کی جلدی تھی کہ جنگ شروع ہونے سے پہلے آ کر حالات کا جائزہ لے لے۔ اس نے سوچا کہ خیمہ گاہ کے پچھواڑے جائے' بلکہ وہاں سے کسی جرم کا مرتکب ہو لیکن اُسے نہیں معلوم تھا کہ امام حسینؑ نے پہلے ہی سے انتظام کر رکھا ہے' پہلے ہی سے حکم دے دیا ہے کہ خیموں کو ایک دوسرے کے نزدیک خطِ منحنی کی شکل میں نصب کریں' ان کے پیچھے ایک خندق بھی کھود لیں اور کچھ خشک لکڑیاں اس میں ڈال کر انہیں آگ بھی لگا دیں' تا کہ دشمن پیچھے کی طرف سے نہ آ سکے۔ جب شمر وہاں پہنچا اور اُسے یہ صورتحال نظر آئی' تو بہت سٹپٹایا اور گالم گلوچ پر اُتر آیا۔ امام حسین علیہ السلام کے بعض اصحاب نے بھی اُسے جواب دیا' البتہ گالیوں سے نہیں۔ بزرگ اصحاب میں سے ایک نے کہا: یا ابا عبداللہ! اجازت دیجئے' ایک تیر پھینک کر میں اس کا کام تمام کر دیتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: نہیں۔ وہ سمجھے کہ شاید امام کو پتا نہیں ہے کہ شمر کس قسم کا آدمی ہے۔ کہنے لگے: اے فرزندِ رسولؐ! میں اسے جانتا ہوں' مجھے معلوم ہے کہ یہ کتنا شقی انسان ہے۔ آپؑ نے فرمایا: میں جانتا ہوں۔ کہا: پس پھر کیوں اجازت نہیں دیتے؟ فرمایا: میں (جنگ کا) آغاز نہیں کرنا چاہتا۔ جب تک ہمارے درمیان جنگ شروع نہ ہو' اُس وقت تک ہم دو مسلمان گروہوں کی صورت میں ایک دوسرے کے سامنے ہیں۔ جب تک وہ جنگ اور خونریزی کی ابتدا نہیں کریں گے' میں جنگ نہیں چھیڑوں گا۔

یہ قرآنی اصول ہے' قرآن میں ہے: اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَ الْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۔ (۱) امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام بھی جنگ صفین میں اسی آیت کو سند قرار دیتے تھے' اور فرماتے

۱۔ ماہِ حرام کا جواب ماہِ حرام ہے (پس اگر مشرکین ماہِ حرام میں تمہارے خلاف لڑیں' تو تم بھی ماہِ حرام کے باوجود اُن سے جنگ کرو) اور محترم چیزوں میں قصاص جائز ہے۔ لہٰذا جو کوئی تم پر زیادتی کرے' تم بھی اُس پر اسی قدر زیادتی کرو۔ (سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۱۹۴)

تھے کہ میں اس آیت کی پابندی کی وجہ سے جنگ کا آغاز نہیں کروں گا' لیکن اگر انہوں نے آغاز کیا' تو ہم دفاع کریں گے۔ امام حسین علیہ السلام شمر کے معاملے میں بھی خیال رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب تک دشمن کی جانب سے عملاً جنگ کا آغاز نہ ہو' اُس وقت تک ہماری جانب سے جنگ شروع نہیں ہونی چاہئے۔ یہ وہ نکات ہیں جو ائمہ کے روحانی مقام کی نشاندہی کرتے ہیں' کہ وہ کس طرح سے سوچا کرتے تھے۔ {آپ حضرات کی سوچ یہ تھی۔} ایک چھوٹا سا اصول بھی' چاہے وہ ایک مستحب ہی کیوں نہ ہو' پامال نہیں ہونا چاہئے۔

لیکن دشمنوں میں یہ سوچ نہیں پائی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ دن چڑھ آیا۔ عمر سعد کا لشکر تیار ہوتا ہے۔ امام حسین علیہ السلام بھی میمنہ (right wing) تشکیل دیتے ہیں' میسرہ (left wing) تشکیل دیتے ہیں' قلبِ لشکر تشکیل دیتے ہیں' علمدار مقرر کرتے ہیں۔ آپ یہ نہیں سوچتے کہ وہ تیس ہزار کا لشکر ہے اور ہم بہتر افراد۔ میمنہ زہیر کو دیتے ہیں' میسرہ حبیب کے سپرد کرتے ہیں اور علم اپنے بھائی ابوالفضل العباس علیہ السلام کے حوالے کرتے ہیں۔ تیس ہزار کے لشکر کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں۔ لیکن دشمن اصول پسند نہیں ہے' اس کا کوئی اصول نہیں ہے' اس کے سامنے مردانگی اور بزدلی کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے' عمر سعد کی آنکھوں پر دنیا کی محبت اور رے کی حکومت کی لالچ کی پٹی بندھی ہوئی ہے اور اس کے تمام کام چاپلوسی پر مبنی اور عبید اللہ ابن زیاد کو خوش کرنے کے لیے ہیں' {اُس کا ہم وغم یہ ہے} کہ کونسا ایسا کام کیا جائے کہ جب میں عبید اللہ کے پاس جاؤں تو وہ مجھ سے زیادہ خوش ہو اور پھر رے کی حکومت کے حصول میں کوئی مشکل اور کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔ لہٰذا اس نے تیر کمان میں چڑھایا۔ امام حسین علیہ السلام کے لشکر کی طرف پہلا تیر خود عمر سعد پھینکتا ہے اور کہتا ہے: اے لوگو! اے میرے سپاہیو! تم سب امیر کے سامنے گواہی دینا کہ پہلا تیر میں نے خود پھینکا تھا۔ عمر سعد کے پاس تقریباً چار ہزار تیر انداز تھے۔ تیر بارش کی طرح اصحابِ حسینی کی طرف آرہے تھے۔ لکھا ہے کہ امام حسینؑ کے اصحاب میں سے کچھ لوگ جو تیر انداز تھے' انہوں نے مخصوص انداز میں ایک زانو کو زمین پر رکھا اور دوسرا زانو خم کر کے مردانہ وار تیر برسانا شروع کر دیئے۔ ان میں سے ایک شخص جامِ شہادت نوش کرتا تھا' تو اس

کے مقابلے میں دشمن کے کئی افراد گرتے تھے۔ امام حسینؑ کے زیادہ تر اصحاب شاید اسی تیراندازی میں شہید ہوئے۔ لیکن امام حسینؑ نے جنگ کا آغاز نہیں کیا۔

عاشور کے دن' جنگ ایک تیر سے شروع ہوکر' ایک تیر پر ہی ختم ہوئی۔ عمر سعد کے تیر سے جنگ کا آغاز ہوا' اور ایک تین منہ کے زہر آلود تیر سے جنگ کا خاتمہ ہوا۔ فَوَقَفَ لِيَسْتَرِيحَ سَاعَةً. حسینؑ چند لمحے ستانے کے لئے کھڑے ہوئے۔ دشمن جسے بالکل یہ خیال نہ تھا کہ حسینؑ بھی ایک انسان ہیں اور تلوار سے جنگ کر رہے ہیں' لٰہذا ان کے ساتھ نزدیک سے جنگ کرنی چاہئے۔ کیونکہ دشمن جانتا تھا کہ اگر حسینؑ کی طاقت پورے طور پر ختم ہو جائے' تب بھی وہ ان کے ساتھ جنگ نہیں کر سکتا' اس لئے اُس نے دور سے پتھر پھینکنا شروع کر دیئے۔ امام حسین علیہ السلام کی پیشانی اطہر زخمی ہو جاتی ہے۔ آپ اپنے پیراہن کے دامن کو اٹھا کر خون صاف کرنا چاہتے ہیں' یہی وہ موقع تھا جب عاشور کی جنگ کا اختتام ہوتا ہے' امام حسینؑ گھوڑے سے زمین پر تشریف لاتے ہیں۔ اب مجھ میں کچھ کہنے کی تاب نہیں' صرف اتنا عرض کروں گا کہ اچانک آواز سنائی دی کہ فرمایا: بِسْمِ اللّٰهِ وَ بِاللّٰهِ وَعَلىٰ مِلَّةِ رَسُولِ اللّٰهِ.

و صلی اللہ علی محمد و آلہ الطاہرین.

باسمک العظیم الاعظم الاجلّ الاکرم یا اللّٰہ ...

بارالہا! ہم سب کا انجام نیک قرار دے۔ ہمیں اسلام اور قرآن کا قدردان بنا۔ ہمیں حق شناس اور جائز ذرائع استعمال کرنے والا قرار دے۔ اپنی محبت اور معرفت کا نور ہمارے دلوں میں قرار دے۔ اپنے نبی اور آلِ نبی کی محبت اور معرفت کا نور ہمارے دلوں میں منور فرما۔ ہمارے مرحومین کو اپنی عنایت اور رحمت میں شامل فرما۔

و عجّل فی فرج مولانا صاحب الزمان.

☆☆☆

پانچویں نشست

دو سوالوں کا جواب

دوسوالوں کا جواب

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ رب العالمین باری الخلائق اجمعین. والصلوٰۃ والسلام علیٰ عبداللّٰہ ورسولہ و حبیبہ و صفیہ و حافظ سرّہ ومبلّغ رسالاتہ سیّدنا ونبیّنا ومولانا ابی القاسم محمد و آلہ الطیّبین الطاہرین المعصومین.

اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم

"لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِی رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ لِمَنْ کَانَ یَرْجُوا اللّٰہَ وَ الْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَکَرَ اللّٰہَ کَثِیْرًا"(۱)

حضرت داؤد کا واقعہ اور ذرائع کا استعمال

حق کی طرف دعوت اور اسکی جانب رہنمائی کے لئے باطل سے استفادہ نہیں کرنا چاہئے اس

۱۔ سورۂ احزاب ۳۳۔ آیت ۲۱

بارے میں ذرائع کے استعمال کی بابت سوال کیا گیا ہے کہ: پھر خدا کے پیغمبر حضرت داوٴد علیہ السلام کا واقعہ جس کا ذکر قرآنِ مجید میں آیا ہے' اس کا مسئلہ کیا ہے؟

ممکن ہے بعض لوگ اس واقعے سے واقف نہ ہوں۔ یہ واقعہ قرآن میں صرف اتنا بیان ہوا ہے کہ ارشاد ہوتا ہے: "ہمارے بندے داوٴد کا واقعہ یاد کرو کہ جب وہ محراب میں تھے' کہ اچانک محراب کے اوپر سے کچھ لوگ (ایک دوسرے کے مخالف فریق) آ گئے"۔ بظاہر یہ دو سے زیادہ افراد تھے' اگرچہ ایک مقام پر ایک شخص کی زبان سے کہتا ہے: اِنَّ ھٰـذَآ اَخِـــیۡ. لیکن دوسری تعبیریں جمع کی تعبیریں ہیں' گویا وہ دو سے زیادہ افراد تھے۔

قرآن نے اس بات کو یوں بیان کیا ہے کہ یہ دو افراد حضرت داوٴد کے پاس آئے (آپ جانتے ہیں کہ حضرت داوٴد علیہ السلام اللہ کے نبی بھی تھے اور مَلِک اور بادشاہ' یعنی اپنی قوم میں حکمراں بھی تھے) ان دو میں سے ایک فرد نے دوسرے کی شکایت کی (یا ایک شخص نے ایک پورے گروہ کی نمائندگی میں دوسرے کی شکایت کی) کہنے لگا: "یہ میرا بھائی ہے (اب یا واقعی سگا بھائی تھا یا دینی بھائی) اس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس صرف ایک دنبی ہے' اسکے باوجود یہ میرے پاس آیا ہے اور اس ایک دنبی کو بھی زبردستی مجھ سے لے لینا چاہتا ہے۔"

فَقَالَ اَکۡفِلۡنِیۡہَا وَ عَزَّنِیۡ فِی الۡخِطَابِ. (۱)

قرآنِ مجید صرف اتنا ہی نقل کرتا ہے کہ شکایت کرنے والے نے یہ کہا' دوسرے نے اپنا دفاع کیا یا نہیں' اس کے بارے میں بیان نہیں کرتا۔ اسکے بعد فرماتا ہے کہ حضرت داوٴدؑ نے کہا: لَـقَـدۡ ظَلَمَکَ بِسُؤَالِ نَعۡجَتِکَ اِلٰی نِعَاجِہٖ وَ اِنَّ کَثِیۡرًا مِّنَ الۡخُلَطَآءِ لَیَبۡغِیۡ بَعۡضُہُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ. اُس نے اپنے اس عمل سے تم پر ظلم کیا ہے۔ ہاں بہت سے لوگ' ایک دوسرے کے شریک' ایسے لوگ جو ایک دوسرے کے نزدیک ہوتے ہیں اور اُن میں باہمی اختلاف ہوتا ہے' اُن میں سے بعض ایک دوسرے پر ظلم کرتے ہیں۔ پھر قرآنِ مجید کہتا ہے کہ حضرت داوٴد ظَـنَّ. (جس

۱۔ اور کہتا ہے کہ اسے میرے حوالے کر دو اور گفتگو میں مجھ پر دباوٴ ڈالتا ہے۔

کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہاں عَلِمَ کے معنی میں ہے) جانتے تھے کہ یہ ہماری جانب سے امتحان تھا: وَ ظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ. (۱) کہ ہم نے ان کا امتحان لیا تھا' لہٰذا وہ تضرع وزاری اور توبہ و استغفار کرنے لگے اور خدا نے بھی اُن کی توبہ کو قبول کر لیا۔ قرآن مجید نے اس سے زیادہ بیان نہیں کیا ہے۔

یہاں پر دو سوال سامنے آتے ہیں: ایک یہ کہ جو لوگ حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس آئے تھے' وہ کون لوگ تھے؟ کیا واقعی انسان تھے اور کیا یہ واقعہ بھی سچا واقعہ تھا؟ کیا وہ واقعی انسان تھے اور ان میں سے ایک کے پاس کئی دنبیاں تھیں اور دوسرے کے پاس ایک دنبی تھی' اور جس کے پاس زیادہ تھیں وہ چاہتا تھا کہ اس دوسرے کی ایک دنبی کو بھی ہتھیا لے' جس پر اُس نے شکایت کی اور حضرت داؤدؑ نے فیصلہ کیا؟ یا نہیں' یہ لوگ انسان تھے ہی نہیں' بلکہ فرشتے تھے جنہیں خدا نے حضرت داؤدؑ کا امتحان لینے کے لئے بھیجا تھا' اور کیونکہ وہ فرشتے تھے' اس لئے اس واقعے میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یعنی سچ مچ کوئی دنبی نہیں تھی' نہ دو بھائی تھے' نہ کوئی تجاوز اور زیادتی ہوئی تھی' بلکہ یہ خدا کے حکم سے آئے تھے' اور انہوں نے حضرت داؤدؑ کا امتحان لینے کے لئے' اور ان کے الفاظ میں حضرت داؤد کو خبردار کرنے کے لئے' یہ اسٹیج تیار کیا تھا اور حضرت داؤدؑ بھی اس جانب متوجہ ہو گئے تھے اور استغفار کرنا شروع کر دیا تھا۔

اگر یہ فرشتے تھے' تو حضرت داؤدؑ کی بیداری کا باعث بننے کے لئے کیوں آئے تھے؟

یہاں پر اہلِ سنت سے خاص روایات موجود ہیں اور مجھے نہیں معلوم کہ شیعوں سے بھی روایات ہیں یا نہیں۔ لیکن تفسیر المیزان میں مجمع البیان سے نقل کیا گیا ہے (ان روایات کا خلاصہ مجمع البیان نے ذکر کیا ہے اور ان کی تکذیب کی ہے اور انہیں مسترد کیا ہے)۔ بہرصورت اگر روایت ضعیف ہے' تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ شیعوں سے ہے یا اہلِ سنت سے۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ واقعہ اس طرح سے تھا کہ حضرت داؤدؑ کی متعدد بیویاں تھیں'

۱۔ سورۂ ص ۳۸۔ آیت ۲۳، ۲۴

اس کے باوجود ایک موقع پر (وہ ایک عورت پر فریفتہ ہوگئے)۔ قصہ یہ تھا کہ حضرت داؤدؑ محراب میں مصروف عبادت تھے کہ شیطان پہلے ایک خوبصورت پرندے کی صورت میں ظاہر ہوا' آ کر اُس سوراخ پر بیٹھ گیا جو اس محراب میں بنا ہوا تھا۔ یہ پرندہ اتنا خوب صورت تھا کہ حضرت داؤدؑ نے اپنی نماز توڑ دی اور اس کو پکڑنے کے لئے دوڑے۔ وہ پرندہ اڑ کر کچھ دور چلا گیا' آپ اس کی طرف اور بڑھے' تو وہ اُڑ کر چھت پر چلا گیا' حضرت داؤدؑ بھی دوڑ کر اپنے دار السلطنت اور دار العمارہ کی چھت پر چلے گئے۔ اتفاق سے (پڑوس کے مکان میں) ''اوریا'' نامی ایک سپاہی کی بیوی غسل کر رہی تھی۔ وہ بہت خوبصورت اور حسین و جمیل عورت تھی۔ وہ حضرت داؤد کو بھا گئی۔ آپ نے معلومات کیں کہ یہ کون ہے؟ {آپ کو پتا چلا کہ} یہ فلاں سپاہی کی بیوی ہے۔ {پوچھا} وہ سپاہی کہاں ہے؟ {بتایا گیا} میدانِ جنگ میں ہے۔ {انہوں نے} اپنے سپہ سالار کو خط لکھا کہ جس طرح بھی ہو اس سپاہی کو کسی ایسی جگہ بھیج دو جہاں سے وہ زندہ واپس نہ آ سکے اور مارا جائے۔ سپہ سالار نے اس سپاہی کو اگلے موریچوں پر تعینات کر دیا اور وہ وہاں مارا گیا۔ جب وہ مارا گیا تو اس عورت کے حصول میں کوئی رکاوٹ نہ رہی۔ جب اُس کی عدت پوری ہوگئی' تو حضرت داؤدؑ نے اُس سے شادی کر لی۔ فرشتوں نے یہ واقعہ اس لئے اسٹیج کیا تھا' تاکہ انہیں بتائیں کہ آپ کی مثال اس آدمی کی سی ہے جس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور اس کے دوست کے پاس صرف ایک دنبی ہے۔ باوجود یہ کہ اُس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں' پھر بھی وہ دوسرے کی ایک دنبی کے حصول کی خواہش رکھتا ہے۔ اب حضرت داؤد کو احساس ہوا کہ {نعوذ باللہ} وہ گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے توبہ کی اور خدا نے ان کی توبہ کو قبول کیا۔

اس واقعے کی حقیقت

عیونِ اخبار الرضا میں' اُن مباحث میں جو امام رضا علیہ السلام نے مختلف اقوام اور ادیان کے لوگوں' یعنی مختلف غیر اسلامی اور بعض اسلامی مذاہب کے نمائندوں سے کی ہیں' آپ نے جو مباحث یہودیوں' نصرانیوں' زرتشتیوں' ستارہ پرستوں اور بعض علمائے اہلِ سنت کے ساتھ کی ہیں'

اُن میں روایت ہوئی ہے کہ ایک مجلس جسے مامون نے ترتیب دیا تھا' اور جس میں امامؑ نے مباحثہ کیا تھا' اُس میں امام رضا علیہ السلام نے اہلِ سنت کے ایک امام سے سوال کیا کہ آپ لوگ حضرت داؤدؑ کے واقعے کے بارے میں کیا کہتے ہیں' جس کا ذکر اجمالی طور پر قرآن میں کیا گیا ہے؟ اُس نے یہی باتیں کہیں {جنہیں ہم نے اوپر کی سطور میں بیان کیا ہے}۔ امامؑ نے فرمایا: سبحان اللہ! آپ لوگ کس طرح اللہ کے نبی کے بارے میں ایسی نسبت دے دیتے ہیں؟! آخر یہ کیسا پیغمبر ہے کہ نماز میں مشغول ہو اور اُس کی نظر ایک خوبصورت کبوتر پر پڑ جائے' تو وہ ایسا بے خود ہو جاتا ہے کہ اپنی نماز توڑ ڈالتا ہے۔ یہ پہلا گناہ ہے' جو فسق ہے۔ پھر نماز توڑنے کے بعد بچوں کی طرح پرندے کے پیچھے دوڑ پڑتا ہے' حالانکہ وہ پیغمبر بھی ہے اور بادشاہ بھی ہے' گویا وہاں کوئی بھی نہ تھا جس سے یہ کہے کہ تم یہ پرندہ میرے لئے پکڑ لاؤ۔ وہ چھت پر چڑھ جاتا ہے' اور وہاں نوعِ انسانی کا ایک اور کبوتر اس کے سامنے آجاتا ہے' اس کی نظر ایک خوبصورت عورت پر پڑ جاتی ہے' یہ ہرجائی دل جو اب تک اُس کبوتر کے پیچھے تھا' اب اُس کبوتر کو چھوڑ کر ایک جان سے نہیں بلکہ سو جان سے اس عورت کا عاشق ہو جاتا ہے۔ یہ دوسرا گناہ ہے۔ پھر تحقیق شروع کر دیتا ہے کہ یہ عورت شادی شدہ ہے یا نہیں۔ جب اسے بتاتے ہیں کہ وہ شادی شدہ عورت ہے' تو وہ پوچھتا ہے کہ کس کی بیوی ہے؟ وہ ایک سرفروش سپاہی کی بیوی ہوتی ہے' جو میدانِ جنگ میں جان ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہے۔ وہ مکاری اور عیاری سے کام لیتا ہے تاکہ وہ سپاہی مارا جائے' تاکہ وہ اس کی بیوی کے ساتھ شادی کر سکے۔ لہٰذا فسق ہے' فجور ہے' قتل ہے' نماز توڑنا ہے' شادی شدہ عورت سے عشق ہے۔ آخر یہ کیسا پیغمبر ہے؟!

اصل بات کیا ہے؟

امامؑ سے سوال کیا گیا کہ اصل بات کیا ہے؟

آپ نے فرمایا: قرآن نے تو سرے سے ان باتوں کا ذکر ہی نہیں کیا ہے۔ یہ کیسی باتیں ہیں جو تم نے خود گھڑ لی ہیں؟!

اصل واقعہ یہ ہے: ایک دن حضرت داؤدؑ (جن کی حکمتیں اور فیصلے ضرب المثل ہیں) کے

دل میں معمولی سی خود پسندی پیدا ہوئی کہ داؤد کے فیصلوں سے بڑھ کر فیصلے کسی کے نہیں ہوتے' میں لوگوں کے درمیان ایسا درست فیصلہ کرتا ہوں کہ اس میں ذرہ برابر بھی غلطی نہیں ہوتی۔ حضرت یونسؑ حضرت آدمؑ اور دوسرے انبیاؑ کے واقعات کی طرح۔ ذرہ برابر خود پسندی اور غرور اس بات کا سبب بن جاتا ہے کہ خدا بندے پر سے اپنی عنایت اٹھالیتا ہے' تاکہ بندہ اپنی عاجزی پر قائم رہے۔ ہم اپنی دعاؤں میں پڑھتے ہیں: وَ لَاتَکِلْنِیْ اِلیٰ نَفْسِیْ طَرْفَۃَ عَیْنٍ اَبَداً. انسان کسی بھی مقام پر ہو' اسے ہمیشہ خدا سے عرض کرنا چاہئے: بارالہا! مجھے پلک جھپکنے کے عرصے کے لئے بھی اپنے آپ پر نہ چھوڑنا۔

ام سلمہ کہتی ہیں: ایک مرتبہ میں نصف شب کے وقت بیدار ہوئی' دیکھا کہ پیغمبر اکرمؐ بستر پر نہیں ہیں۔ اچانک میں نے دیکھا کہ آپ ایک کونے میں مشغول عبادت ہیں۔ میں نے آپ کی باتیں سنیں' تو دیکھا کہ آپ فرما رہے تھے: اِلٰھِیْ لَاتُشْمِتْ بِیْ عَدُوِّیْ وَ لَاتَرُدَّنِیْ اِلیٰ کُلِّ سُوْءٍ اسْتَنْقَذْتَنِیْ مِنْہُ .. وَ لَا تَکِلْنِیْ اِلیٰ نَفْسِیْ طَرْفَۃَ عَیْنٍ اَبَداً. (۱) بارالہا! مجھے جن برائیوں سے نجات دی ہے' ان میں دوبارہ نہ پلٹا دینا' بارالہا! میرے دشمنوں کو شاد نہ فرمانا۔۔۔ بارالہا! مجھے ایک لمحے کے لئے بھی' پلک جھپکنے کے عرصے کے لئے بھی اپنے آپ پر نہ چھوڑنا' یعنی مجھ سے اپنے لطف و عنایت کو دور نہ کرنا۔ (یہ باتیں پیغمبر آخرالزماں کہہ رہے ہیں) یہاں پہنچنے پر ام سلمہؓ نے بے اختیار زار و قطار رونا شروع کردیا۔ جب پیغمبر کی دعا ختم ہوگئی تو آپ نے پوچھا: ام سلمہؓ! کیوں رو رہی ہو؟ عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! جب آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ بارالہا! مجھے پلک جھپکنے کے عرصے کے لئے بھی اپنے آپ پر نہ چھوڑنا' تو افسوس ہو ہمارے حال پر۔ آنحضرتؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں تو تکلفاً کہہ رہا تھا (نعوذ باللہ) تمہیں سکھانے کے لئے کہہ رہا تھا۔ فرمایا: ہاں ایسا ہی ہے' میرے بھائی یونسؑ کو ایک لمحے کے لئے خدا نے اُس کے اپنے اوپر چھوڑ دیا تھا' تو اُسے وہ سب کچھ برداشت کرنا پڑا۔

۱۔ بحار الانوار۔ طبع جدید۔ ج ۱۶۔ ص ۲۱۷

خدا اپنی عنایت کو کیسے اٹھالیتا ہے؟

اللہ کے کسی نبیؑ کے دل میں معمولی سی بھی خود پسندی آ جائے' تو اس پر سے خدا کی عنایت اٹھ جاتی ہے اور وہ اسی وقت بلندی سے گر جاتا ہے۔

امام رضا علیہ السلام نے فرمایا: اس عظیم پیغمبرؑ کے پاکیزہ دل میں یہ خود پسندی پیدا ہوئی کہ کیا اس دنیا میں مجھ سے بہتر بھی کوئی قاضی ہے؟ حضرت داوٗدؑ کے دل میں "میں" کا تصور پیدا ہوا۔ اے داوٗدؑ! اب تمہارے ذہن میں "میں" کی فکر "میں" کا تصور نہیں آنا چاہئے۔ لہٰذا خدا نے انہیں اس امتحان میں ڈال دیا۔ جب حضرت داوٗدؑ پر سے خدا کی عنایت اٹھ گئی' تو انہوں نے ایک فیصلہ کرتے ہوئے جلد بازی سے کام لیا۔ یعنی وہ یہ بھول گئے کہ جب مدعی اپنا دعویٰ پیش کر رہا ہو' تو قاضی کو فرضی طور پر ہی سہی ایک لفظ بھی نہیں بولنا چاہئے۔ ایک شخص آتا ہے اور کہتا ہے: یہ صاحب جنہیں آپ دیکھ رہے ہیں' انہوں نے میرا مال ہتھیا لیا ہے' اتنے مال و دولت کے باوجود (جبکہ ان کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس صرف ایک دنبی ہے) یہ میری ایک دنبی پر بھی نظر رکھے بیٹھا ہے۔ حضرت داوٗدؑ اپنے انسان دوستی کے جذبات کا شکار ہو گئے اور اتنا بھی صبر نہ کیا کہ دیکھیں کہ مدعا علیہ کیا کہتا ہے۔ آخر اُس کے پاس بھی اپنے دفاع میں کچھ ہے یا نہیں؟ فوراً فرمایا: درحقیقت (یا شاید فرضی صورت میں' اگر ایسا ہو تو) اس نے تجھ پر ظلم کیا ہے۔ جب وہ ایسا کر بیٹھے تو یکایک انہیں احساس ہوا کہ اے داوٗد! فیصلہ کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ دوسرے کی بات کو سنے بغیر کوئی بات کہو۔ قاضی کو خاموش رہنا چاہئے' دوسرے کو اپنی بات کہنے کا موقع دینا چاہئے' تاکہ وہ اپنا دفاع کر سکے' اس کے بعد اسے اپنی بات کہنی چاہئے۔ اس مقام پر حضرت داوٗد کو احساس ہوا کہ اُن سے غلطی ہو گئی ہے' نہ صرف انہیں اس بات کا احساس ہوا کہ انہوں نے غلط فیصلہ کیا ہے' بلکہ فوراً ہی اپنی غلطی کی وجہ بھی جان گئے۔

اے داوٗد! غلطی کی اصل وجہ کیا ہے؟

وجہ یہ ہے کہ تمہارے اندر "میں" آ گئی تھی' تم یہ سمجھ رہے تھے کہ "میں کچھ ہوں"۔ اسی "میں" نے تمہیں نقصان پہنچایا ہے۔ قرآن میں کسی عورت کا تذکرہ نہیں ہے' کسی "اوریا" کا ذکر نہیں ہے'

کسی اڑ جانے والے پرندے کی بات نہیں ہے' ان باتوں کا ذکر نہیں ہے۔

یہ واقعہ گھڑنے کی وجہ

اب دیکھنا یہ ہے کہ کس طرح یہ واقعہ ہم مسلمانوں کی بعض کتابوں میں درآیا؟ ہم آپ سے صرف اتنا کہیں گے کہ: یہودیوں سے خدا کی پناہ' ان کے ہاتھوں دنیا کو کیا کیا سہنا پڑا؟! ایک کام جو قرآن ان سے منسوب کرتا ہے' اور جواب بھی {ان کی طرف سے} جاری ہے' وہ حقائق میں تحریف اور انہیں بدلنے کا کام ہے۔ یہ لوگ شاید دنیا کے ذہین ترین افراد ہوں' ایک غیر معمولی ذہین اور دھوکے باز قوم ہوں۔ اس ذہین اور دھوکے باز قوم کا ہاتھ ہمیشہ انسانی معاشرے کی شہ رگوں پر رہا ہے' اقتصادی شہ رگ پر' ثقافتی شہ رگ پر۔

اگر کوئی ان تحریفات کو (جمع کر سکے) جو انہوں نے حتیٰ موجودہ دور میں بھی دنیا کی تاریخوں میں' جغرافیوں میں اور دنیا کی خبروں میں کی ہیں (تو یہ ایک مفید کام ہوگا)۔ البتہ کچھ لوگوں نے یہ کام کیا ہے' لیکن کافی حد تک نہیں کیا۔ آج دنیا کی بڑی خبر رساں ایجنسیاں' جو ایک انتہائی حساس شہ رگ ہے' یہودیوں کے ہاتھوں ہی چل رہی ہیں' تاکہ دنیا میں واقعات کا حتیٰ الامکان اپنی مرضی کے مطابق پروپیگنڈہ کریں اور انہیں حسبِ خواہش دنیا تک پہنچائیں۔

جس ملک میں بھی اُن کے لئے ممکن ہوتا ہے' وہ ان شہ رگوں کو' آج کل کی زبان میں ذرائع ابلاغِ عامہ کو' جیسے مطبوعات اور مجموعی طور پر ان اداروں کو جہاں سے افکار کو تبدیل کیا جا سکتا ہے' منحرف کیا جا سکتا ہے' پروپیگنڈہ کیا جا سکتا ہے اور بدلا جا سکتا ہے' نیز اقتصادی شہ رگوں کو (اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں)۔ قدیم دور سے ہی ان کا یہ کام رہا ہے۔ ایک مقام پر قرآنِ مجید فرماتا ہے:

"اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَ قَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ." (۱)

۱۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۷۵ {مسلمانو! کیا تمہیں امید ہے کہ یہ یہودی تمہاری طرح ایمان لے آئیں گے' جبکہ ان کے اسلاف کا ایک گروہ کلامِ خدا کو سن کر تحریف کر دیتا تھا' حالانکہ سب سنتے بھی تھے اور جانتے بھی تھے۔}

مسلمانو! تم ان کے ایمان لانے کے منتظر ہو؟! کیا تم انہیں پہچانتے نہیں ہو؟! یہ وہی لوگ ہیں (یعنی اب بھی اُن کی روح وہی روح ہے' وگرنہ اگر کسی کے اجداد گمراہ ہوں تو یہ ان کے موجودہ لوگوں کے گمراہ ہونے کی دلیل نہیں ہوتی۔ انہوں نے اپنے اجداد کی اُسی روح کو زندہ رکھا ہوا ہے) کہ جب یہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بھی تھے' تب بھی جب خدا کا کلام سن کر واپس لوٹتے تھے' تو اِسے اپنی مرضی کے مطابق تبدیل کر دیا کرتے تھے' اپنی جہالت اور نادانی کی وجہ سے نہیں' بلکہ پوری طرح جانتے بوجھتے ہوئے۔

کئی ہزار سال پہلے سے آج تک تحریف اور حقائق کو بدل ڈالنا' یہودیوں کا ایک بنیادی کام رہا ہے۔ ہر قوم کے درمیان اُس کے لباس اور اُس کی روش کے مطابق ظاہر ہوتے ہیں اور اپنے افکار و نظریات کو انہی لوگوں کی زبان سے نشر کرتے ہیں' اپنے ارادوں کو انہی لوگوں کی زبان سے کہلواتے ہیں۔ مثلاً اگر شیعہ اور سنی کے درمیان اختلاف ڈالنا چاہتے ہیں' تو ایسا نہیں ہوتا کہ خود کچھ بولیں' بلکہ ایک سنی کو ڈھونڈ نکالتے ہیں' اور وہ اپنے امکان بھر شیعوں کے خلاف جھوٹ بولنا اور اُن پر تہمت لگانا شروع کر دیتا ہے۔ البتہ حق کا دفاع اپنی جگہ درست ہے' جھوٹی باتوں کو مسترد کرنا چاہیے' لیکن بعض اوقات ایسے افراد ان کو مل جاتے ہیں' جیسے "الخطوط العریضة" کا مصنف' کہ وہ بھی آ کر چار جھوٹی باتیں منسوب کر دیتا ہے۔ اس کی زبانی اُس پر جھوٹ باندھتے ہیں اور اُس کی زبانی اِس پر۔ انہوں نے اپنی توریت کو بھی ان جھوٹی باتوں سے بھر دیا ہے۔ گزشتہ امتوں کے واقعات ہیں جو توریت نے ایک انداز سے نقل کئے ہیں اور قرآنِ مجید نے دوسرے انداز سے' بلکہ قرآنِ مجید نے انہیں اس انداز سے نقل کیا ہے کہ ان کے جھوٹ پر سے' جس میں انہوں نے واقعے کو تحریف کیا ہے' اور جسے تحریف شدہ توریت میں شامل کر دیا ہے' پردہ اُٹھایا ہے۔

انہوں نے نعوذ باللہ قرآنِ مجید کو جھٹلانے کے لئے توریت کے حق میں کچھ روایات کو پیغمبرؐ یا ائمہؑ یا مثلاً بعض اصحابِ پیغمبرؐ کے نام سے گھڑ لیا ہے۔ لیکن انہیں اس انداز سے گھڑا ہے کہ کوئی ان کے غیر حقیقی ہونے کو نہ سمجھ پائے۔ مثلاً (یہ شاید عبرت آموز ہو) عمالقہ کے واقعے میں' جنہوں نے اسی موجودہ بیت المقدس پر قبضہ کر لیا تھا' اور حضرت موسیٰ علیہ السلام یہودیوں سے کہتے تھے کہ

انہوں نے اس پر زبردستی قبضہ کیا ہے' چلو وہاں چلتے ہیں' لیکن یہ لوگ (جان بچایا) کرتے تھے' کہتے تھے:

"یَامُوْسٰی اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِیْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّکَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ."(۱)

قرآن کریم نے ان کو ذلیل کر دیا۔ جس قدر حضرت موسیٰ علیہ السلام کہتے: کچھ تو غیرت سے کام لو' کچھ کر کے دکھاؤ' اپنا حق چھین لو۔ یہ کہتے: نہیں' وہ طاقتور لوگ ہیں' ہم یہاں بیٹھے ہوئے ہیں' تم اور تمہارا خدا دونوں وہاں جاؤ' وہاں جا کر جنگ کرو اور عمالقہ کو باہر نکال دو' جب کام پورا ہو جائے' تو ہمیں اطلاع کر دینا' پھر ہم وہاں چلیں گے۔ بولے:

گر بہ مغزم زنی و گر دُمم
کہ من از جای خود نمی جنبم (۲)

حضرت موسیٰ علیہ السلام دوبارہ آئے' اور اُن سے بات کی کہ یہ کیا کہہ رہے ہو؟! خدا پر بھروسہ کرو' خدا کی راہ میں جہاد کرو۔ اگر خدا کی راہ میں جہاد کرو گے' تو خدا تمہاری مدد کرے گا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ ایک عملی معاملہ تھا۔

کہنے لگے: ہم ہرگز ہرگز نہیں جائیں گے۔

یہاں قرآنِ مجید نے انہیں اس طرح رسوا کیا ہے' کہتا ہے یہ لوگ لالچی تھے' چاہتے تھے کہ بغیر تکلیف اٹھائے (سرزمینِ بیت المقدس) مفت ان کے ہاتھ آ جائے۔ جنگِ بدر میں بظاہر مقداد اسود نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا تھا: اے اللہ کے رسولؐ! ہم آپ سے وہ بات نہیں کہیں گے جو یہودیوں نے حضرت موسیٰ سے کہی تھی کہ تم اپنے خدا کے ساتھ جاؤ اور ان

۱۔ سورۂ مائدہ ۵۔ آیت ۲۴ {ان لوگوں نے کہا کہ موسیٰ ہم ہرگز وہاں داخل نہیں ہوں گے' جب تک وہ لوگ وہاں ہیں آپ اپنے پروردگار کے ساتھ جا کر جنگ کیجئے' ہم یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔}

۲۔ یعنی چاہے تم میرا سر پیٹو یا میری دُم میں اپنی جگہ سے ہلنے والا نہیں۔

کے ساتھ جنگ کرو جب اُن کا قصہ پاک ہو جائے اور رکاوٹیں ختم کر لو تو ہمیں اطلاع کر دینا۔ ہم آپ سے کہتے ہیں کہ آپ ہمیں جو حکم دیں گے، ہم اُس کی اطاعت کریں گے، اگر آپ حکم دیں گے کہ ہم سمندر میں کود جائیں تو ہم سمندر میں کود پڑیں گے۔

ان لوگوں نے سوچا کہ کس طرح توریت کی تائید اور قرآن کی تکذیب کی جائے اور مسلمان سمجھ بھی نہ پائیں کہ ہم قرآن کی تکذیب کر رہے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے عمالقہ کے بارے میں افسانے تراشے۔ کہنے لگے۔ یہ عمالقہ جو بیت المقدس میں تھے، جانتے ہو یہ کیسے لوگ تھے؟ (وہ کہنا چاہتے تھے کہ اگر ہماری قوم ان سے لڑنے نہیں گئی، تو حق بجانب تھی، نعوذ باللہ قرآن کا اعتراض بے جا ہے، یہ جنگ کا موقع ہی نہ تھا۔ لیکن بہت سے مسلمانوں نے یہ بات نہیں سمجھی) وہ قوم جو وہاں تھی، اس کے آدمی معمولی لوگ نہ تھے، جن سے جنگ ممکن ہوتی۔ البتہ یہ نہیں کہا کہ ''ان سے جنگ کی جا سکتی تھی'' کیونکہ اس طرح مسلمان سمجھ جاتے۔ کہنے لگے وہاں کے لوگ عُناق نامی عورت کی اولاد تھے، اور عناق وہ عورت تھی کہ جب بیٹھتی تھی تو دس مربع جریب (۱) کی جگہ گھیرتی تھی۔ اس کا عوج نامی ایک بیٹا تھا، جب حضرت موسیٰ اپنے عصا کے ساتھ اس کے سامنے کھڑے ہوئے، تو باوجود یہ کہ اُن کا قد چالیس ہاتھ کا تھا اور ان کا عصا بھی چالیس ہاتھ لمبا تھا اور وہ زمین سے چالیس ہاتھ اچھلے تھے، تب کہیں جا کے اُن کا عصا عوج بن عناق کے ٹخنے تک پہنچا تھا۔ ان کے کچھ لوگ بیت المقدس کے ریگستان میں آئے ہوئے تھے۔ حضرت موسیٰ نے کچھ جاسوسوں کو بھیجا تھا تاکہ معلوم کریں کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ ایسے لوگ جن کا قد کئی فرسخ کا تھا، وہ سمندر سے مچھلیاں پکڑتے تھے اور سورج سے انہیں بھون کر کھا لیا کرتے تھے اور صحرا میں اس طرح سے چلا کرتے تھے، ایک مرتبہ ان میں سے کسی نے دیکھا کہ کچھ چیزیں زمین پر حرکت کر رہی ہیں (یہ وہی حضرت موسیٰ کے لوگ تھے) اس نے ان میں سے چند ایک کو اٹھایا، اپنی آستین میں ڈالا اور اپنے بادشاہ کے پاس آ کر انہیں وہاں زمین پر پھینکا اور بولا: یہ لوگ ہم سے یہ علاقہ چھیننا چاہتے ہیں۔

۱۔ دس ہزار مربع میٹرز مین۔

اگرچہ بیت المقدس میں ایسی کوئی قوم رہتی تھی' تو موسیٰ نے خواہ مخواہ کہا کہ وہاں جاؤ اور قبضہ کرلو' یہودی حق بجانب تھے' جو یہ کہتے تھے کہ یہ ہمارا کام نہیں ہے' تم اور تمہارا خدا جاؤ اور انہیں باہر نکال دو' ہم بعد میں آجائیں گے۔ وہ کوئی معمولی لوگ نہیں تھے۔

ان لوگوں نے یہودیوں پر قرآن کی تنقید کو مسترد کرنے کے لئے چالاکی سے یہ افسانے گھڑ لئے اور مسلمانوں کی زبان پر چڑھا دیئے۔ بعد میں خود مسلمان بیٹھ کر عوج بن عناق کی باتیں سنایا کرتے تھے' عمالقہ کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا کرتے تھے اور یہ (کہا کرتے تھے) کہ اگر معاملہ یوں تھا تو قرآن ان سے کیا کہتا ہے؟!

حضرت داؤد علیہ السلام کے معاملے میں بھی مسئلہ کچھ ایسا ہی تھا۔ یہ پرندے کا قصہ اور حضرت داؤدؑ کا ''اوریا'' کی بیوی پر عاشق ہو جانا اور پھر ''اوریا'' کو قتل کروا دینا بھی (ایک جعلی داستان ہے)۔ اس سے بھی بدتر انہوں نے کہا ہے کہ ابھی ''اوریا'' زندہ ہی تھا کہ حضرت داؤدؑ اس کی بیوی کو اپنے گھر لے آئے اور نعوذ باللہ اس کے ساتھ زنا کیا اور سمجھے کہ بات آئی گئی ہو گئی ہے' لیکن کچھ عرصے بعد اس عورت نے آپ کو بتایا کہ میں حاملہ ہو چکی ہوں' اب کیا کروں؟ جب حضرت داؤدؑ نے دیکھا کہ عورت ان سے حاملہ ہو چکی ہے اور کل بچہ متولد ہو گا تو ان کا پول کھل جائے گا' لہٰذا انہوں نے حکم دیا کہ اسے مار ڈالا جائے۔

قرآن مجید نے حضرت داؤد علیہ السلام کی داستان کو انتہائی پاکیزگی اور شفافیت کے ساتھ نقل کیا ہے اور تحریف شدہ توریت نے اسے اس قدر ناپاک انداز اور غلاظت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ بعد میں یہودیوں نے ان جعلی روایات کو مسلمانوں کی زبانوں پر جاری کر دیا۔ اس مقام پر ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی اہمیت آشکارا ہوتی ہے۔ امام رضا علیہ السلام ان کے جھوٹ سے پردہ اٹھاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ تم یہ کیسی بکواس اور بیہودہ باتیں کرتے ہو؟! یہ تم اللہ کے نبی کی طرف کیسی باتیں منسوب کرتے ہو؟! قرآن مجید میں کہاں ایسی باتیں آئی ہیں؟! قرآن مجید تو اس واقعے کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہتا کہ کچھ لوگ آئے (حضرت داؤدؑ کے پاس اور ان میں سے ایک نے دوسرے کی شکایت کی)' اور فیصلے کے متعلق بھی صرف اتنا کہتا ہے کہ حضرت

داؤدؑ نے مدعی کی بات سنی تو فوراً ہی اپنا فیصلہ سنا دیا' پھر یکبارگی انہیں احساس ہوا کہ ان سے غلطی ہوگئی ہے' جس پر انہوں نے استغفار کیا۔ یہ واقعہ تھا' اس میں کسی عورت کا تذکرہ ہی نہیں۔

اس واقعے کے دو پہلو ہیں: آنے والے وہ لوگ فرشتے تھے یا انسان؟ اگر انسان تھے' تو یہ ایک سچا واقعہ تھا۔ لہٰذا خدا ہی نے ان انسانوں کو بھیجا تھا' اور یہ حضرت داؤد کو متنبہ کرنے کے لئے نہیں آئے تھے' بلکہ سچ مچ انہیں ایک مسئلہ پیش آیا تھا۔ لیکن جب حضرت داؤدؑ نے اس فیصلے میں عجلت سے کام لیا تو یکبارگی خود ہی متوجہ ہو گئے۔ پس یہاں پر کسی ناجائز ذریعے' اور کسی جھوٹ سے کام نہیں لیا گیا ہے۔

اور اگر جو لوگ آئے وہ فرشتے تھے اور حضرت داؤدؑ کی تنبیہ کے لئے آئے تھے' تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ فرشتے حضرت داؤد کو متوجہ کرنے کی خاطر ایک جعلی ڈرامہ رچانے کے لئے کس طرح پہنچ گئے؟! اور جو سوال ہم سے ہوا تھا وہ اس اعتبار سے تھا کہ کس طرح دو فرشتوں نے آکر ایک جعلی ڈرامہ رچایا؟! البتہ ان کا مقصد حضرت داؤد کو تنبیہ کرنا تھا' جو ایک مقدس مقصد ہے' لیکن جو داستان انہوں نے بیان کی وہ جعلی ہے۔

جواب

یہاں ہم وہی بات عرض کریں گے جو علامہ طباطبائی نے تفسیر المیزان میں بیان فرمائی ہے' اگرچہ انہوں نے جو کچھ بیان کیا ہے' وہ ایک اعلیٰ سطح کا ہے' اس لئے شاید ہم اسے اس نشست میں بیان نہ کر پائیں۔ وہ فرماتے ہیں: پہلی بات تو یہ ہے کہ اُن کا فرشتے ہونا یقینی بات نہیں ہے' اور اگر بالفرض وہ فرشتے ہوں بھی' تو وہ فرشتوں کا تمثّل تھا' اور فرشتوں کا تمثّل اُس سے مختلف ہے کہ عالمِ مادّی اور عالمِ تکلیف میں کچھ لوگ (حضرت داؤدؑ کے پاس آئیں اور اُن سے ایک جھوٹی داستان بیان کریں) جو اُن کے لئے جائز نہیں۔ بالفاظِ دیگر وہ فرماتے ہیں کہ: یہ مسئلہ ایک سچی یا جھوٹی بات ہے' اور ہماری یہ ذمے داری کہ ہم سچ بولیں' جھوٹ نہ بولیں' عالمِ مادّی اور عالمِ عینی سے تعلق رکھتی ہے۔ اگر عالمِ مادّی اور عالمِ عینی میں دو موجود حضرت داؤدؑ کے پاس آتے ہیں اور اپنی بات

کہتے اور جھوٹ بولتے ہیں' تو اس کا تعلق اس معاملے سے تھا' جبکہ تمثّل کا مسئلہ ایک مختلف مسئلہ ہے۔

مسئلۂ تمثّل یعنی ایک حقیقت کا کسی اور صورت میں ظاہر ہونا' جیسے سچے خواب۔ سچے خواب باوجود یہ کہ تمثّل ہے' ان میں سچ اور جھوٹ ان معنوں میں نہیں ہوتا۔ مثلاً (ہم یہ مثال عرض کرتے ہیں) پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خواب میں دیکھتے ہیں کہ بندروں کا ایک گروہ اُن کے منبر پر چڑھ اور اتر رہا ہے اور اُن کی امت کے لوگ منبر کے نیچے بیٹھے ہوئے ہیں' ان لوگوں کے چہرے منبر کی جانب ہیں اور وہ اُلٹے چلے جارہے ہیں۔ آپ غمگین حالت میں نیند سے بیدار ہوتے ہیں۔ محسوس کرتے ہیں کہ یہ عالمِ اسلام پر ایک کاری ضرب کی علامت ہے۔ جبرئیل پیغمبرؐ کے لئے اس خواب کی تفسیر بیان کرتے ہیں (وَ مَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِیْٓ اَرَیْنٰکَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَ الشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِی الْقُرْاٰنِ وَ نُخَوِّفُهُمْ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا)(۱) کہ اس خواب کی تعبیر ہے اور تعبیر یہ ہے کہ آپ کے بعد بنی امیہ آپ کی امت پر مسلط ہو جائیں گے' آپ کے اسی منبر پر بیٹھیں گے' اسلام کے ظواہر کو ملحوظ رکھیں گے' اسلام کے نام پر بات کریں گے' لوگوں کا رُخ بھی اسلام کی جانب ہوگا لیکن عملی طور پر لوگوں کو اسلام سے دور کریں گے۔

یہ وہ خواب ہے جو اللہ نے اپنے پیغمبر کو دکھایا۔ یہ خواب جھوٹا ہے یا سچا؟ اگر کہیں کہ سچا خواب وہ ہوتا ہے جو اسی طرح ظاہر ہو جس طرح انسان نے دیکھا ہے' تو اس صورت میں یہ ایک جھوٹا خواب ہے۔ کیونکہ حقیقت میں رسولؐ کے منبر پر کوئی بندر نہیں چڑھا تھا' اور حقیقت کی دنیا میں کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا تھا کہ لوگ منبر رسولؐ کے نیچے بیٹھے ہوں اور ساتھ ہی اُلٹے چلتے ہوئے اس سے دور ہو رہے ہوں۔ لیکن اس کے باوجود یہ ایک سچا خواب ہے۔ کیونکہ ایک حقیقت کی تصویر

۱۔ سورۂ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۶۰ (اور جو خواب ہم نے آپ کو دکھایا ہے وہ صرف لوگوں کی آزمائش کا ذریعہ ہے جس طرح کہ قرآن میں قابلِ لعنت شجرہ بھی ایسا ہی ہے اور ہم لوگوں کو ڈراتے رہتے ہیں لیکن اُن کی سرکشی بڑھتی ہی جارہی ہے۔)

ہے۔ بندر بنوامیہ کا تمثّل ہیں اور لوگوں کا بیٹھے ہوئے الٹے چلنا' اسلام کی شکل وصورت کا باقی رہنا اور اُس کی روح اور حقیقت کا ختم ہو جانا ہے۔

اگر ایک پیغمبرؑ کے لیے فرشتے متمثّل ہوتے ہیں' یعنی اُن کے تمثّل میں کوئی حقیقت اس صورت میں متمثّل ہوتی ہے' تو وہاں سچ اور جھوٹ کا مسئلہ اس شکل میں پیش نظر نہیں ہوتا۔ نبیؑ کے سامنے فرشتوں کے تمثّل کا سچ اور جھوٹ ہونا اس بات سے وابستہ ہے کہ وہ ایک حقیقت پر منطبق ہوتا ہے یا نہیں' اگر ایک حقیقت پر منطبق ہوتا بھی ہے تو اس صورت میں جس میں وہ متمثّل ہوا تھا عالمِ حقیقی میں بھی اسی طرح سے واقع نہیں ہوتا' جیسے کہ سچے خواب میں یہ ضروری نہیں ہے کہ جس صورت میں متمثّل ہوا ہے' اسی صورت میں دنیائے حقیقت میں بھی واقع ہو۔

لہٰذا بالفرض اگر یہ فرشتے بھی ہوں (اگر چہ ان کا فرشتے ہونا یقینی نہیں ہے) تو آخر کیوں ایک حقیقت کے لئے اس طرح کے ذریعے سے استفادہ کیا گیا؟ اس سوال کا جواب وہی ہے جو علامہ طباطبائی نے دیا ہے اور ہمارے خیال میں بھی یہ جواب درست ہے۔ اگر چہ مجھے نہیں معلوم کہ بات کی جس طرح سے مجھے وضاحت کرنی چاہیے تھی اُس طرح میں کر سکا ہوں یا نہیں۔

کفارِ قریش کے سامان پر قبضہ اور ذرائع کے استعمال کا مسئلہ

ایک اور سوال جسے ہم خود کچھ توسیع دینا چاہتے ہیں' یہ ہے کہ اگر اسلام میں نیک مقصد کے حصول کے لئے کسی ناجائز اور فاسد ذریعے سے استفادہ جائز نہیں ہے' تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیوں اس بات کی اجازت دیا کرتے تھے کہ مسلمان مدینہ کے قریب سے گزرنے والے کفارِ قریش کے قافلوں کو روک کر اُن کے مال واسباب پر قبضہ کر لیں جو (شام سے مکہ کی طرف) مالِ تجارت لے کر جاتے تھے۔ اہلِ یورپ اس عمل کے لئے راہزنی جیسا نازیبا لفظ بھی استعمال کرتے ہیں۔

کیا یہ کام ایک نیک مقصد کے لئے نہیں تھا؟

ہم اس سوال میں اضافہ کرتے ہیں' ہم کہتے ہیں کہ ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ خود جہاد بھی اسی

قبیل سے ہے' کیونکہ جہاد بھی آخرکار انسانوں کے قتل پر منتہی ہوتا ہے! اور ظاہر بات ہے کہ انسانوں کو قتل کرنا خود کوئی اچھا کام نہیں ہے۔ جو کام خود کوئی اچھا کام نہیں ہے' اسلام نے کیوں اس کی اجازت دی ہے؟

آپ کہیں گے کہ ایک نیک مقصد کے لئے۔

پس اسلام میں خود جہاد کی اجازت دینا' اس بات کی اجازت دینا ہے کہ نیک مقصد کے لئے ناجائز ذرائع کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔

اس حوالے سے دوسری مثالیں بھی ہمارے پاس موجود ہیں: کیا ہماری فقہ یہ نہیں کہتی کہ ''دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی' فتنہ انگیز است'' (۱) یہ شیخ سعدی کا جملہ ہے' لیکن فقہ بھی اس بات کی اجازت دیتی ہے۔ فقہ بھی یہ کہتی ہے کہ اگر کسی مقام پر ایک جھوٹ معاشرے کی مصلحت اور اسکے مفاد میں ہو' تو یہ جھوٹ بول دینا چاہئے۔ یعنی اگر کسی مقام پر دو صورتیں پیدا ہو جائیں' ایک یہ کہ سچ بولا جائے جس کے نتیجے میں کوئی بے گناہ مومن اپنی جان سے محروم ہو جائے' یا جھوٹ بول کر ایک بے گناہ کو نجات دلائی جائے' تو اس موقع پر جھوٹ بول دو اور بے گناہ کو نجات دلا دو۔ یہ وہی دروغ مصلحت آمیز ہے۔ کیا یہ ایک نیک مقصد کے لئے ایک ناجائز ذریعے کے استعمال کے سوا کچھ اور ہے؟ جواب یہ ہے کہ: بعض مسائل میں ذریعہ بھی ناجائز نہیں ہوتا۔ جہاد اور مال و دولت کے معاملے میں سلسلہ یہی ہے۔

ہمارا یہ سمجھنا غلط ہے کہ ہر انسان کی' ایک بائیولوجیکل انسان کی جان و مال محفوظ ہونی چاہئے' انسان' انسان ہونے کے ناطے جیسا بھی ہو ہوا کرے۔ یہ فرنگیوں کا انداز فکر ہے' جو کہتے ہیں کہ انسان یعنی نوع آدم' بائیولوجیکل انسان' ایسا انسان جسے بائیولوجی انسان سمجھتی ہے۔ البتہ ایسا انسان جسے علم بائیولوجی انسان کہتا ہے' یعنی ایک ایسا موجود جس کا ایک سر' دو کان' دو ہاتھ اس خاص حالت میں ہوں' اس کے ناخن چوڑے ہوں' سیدھا کھڑا ہو سکتا ہو اور دو پیروں پر چلتا ہو۔ ان

۱۔ {مصلحت اور بھلائی کی خاطر بولا جانے والا جھوٹ' فتنہ پیدا کرنے والے سچ سے بہتر ہے۔}

علامات کا حامل موجود بائیولوجیکل انسان ہے۔ بائیولوجی کے اعتبار سے معاویہ بھی ایک انسان ہیں اور ابوذر بھی ایک انسان ہیں' یعنی ایسا نہیں ہے کہ ہم یہ کہیں کہ ابوذر کا خون معاویہ کے خون سے بائیولوجی کے اعتبار سے بہتر ہے۔ بائیولوجی کے اعتبار سے موسیٰ چمبہ اور لوموبا ایک ہی جیسے دو انسان ہیں۔

لیکن انسان کے حوالے سے' بائیولوجیکل انسان کا ذکر نہیں ہے' بلکہ انسان کا ذکر ہے معیارِ انسانیت کی بنیاد پر' (لہٰذا) ایک انسان' ضدِ انسان بن کے سامنے آتا ہے۔ موسیٰ چمبہ ایسا انسان ہے جو ضدِ انسان ہے' شمر ابن ذی الجوشن ایسا انسان ہے جو ضدِ انسان ہے' یعنی انسانیت کی ضد ہے۔ یہاں انسانیت معیار ہے۔ انسانیت یہ نہیں ہے کہ فلاں موجود کے دانت اس قسم کے ہوں۔ انسانیت' یعنی شرافت' فضیلت' تقویٰ' عدالت' حریت پسندی' آزاد منشی' حلم' بردباری۔ یہ چیزیں معیارِ انسانیت ہیں۔

بائیولوجیکل انسان' بالقوہ (potential) اجتماعی انسان ہے' بالفعل (by act) اجتماعی انسان نہیں ہے۔ اگر کوئی انسان انسانیت کے خلاف اٹھ کھڑا ہو (اور دوسرے الفاظ میں) ایسا انسان جو آزادی کے خلاف پرچم بلند کرے' جو توحید کے مقابل کھڑا ہو جائے' عدالت کے سامنے قدِ علم کرے' سچائی اور نیکی کے خلاف صف آرا ہو' تمام اچھائیوں کی مخالفت پر کمر بستہ ہو جائے' اس انسان کو کوئی احترام حاصل نہیں' اس کا خون اور مال محترم نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس کا خون اور مال قابلِ احترام ہے اور اس کا خون اور مال ضائع کرنا ایک برا کام ہے لیکن ہم ایک نیک مقصد کے لئے اس برے کام کو انجام دیتے ہیں۔ نہیں' یہ کام سرے سے برا ہے ہی نہیں۔ قصاص کا مسئلہ اور قاتل سے قصاص لینے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم ایک اعلیٰ مصلحت کی خاطر افسوس کے ساتھ کسی برے کام کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ اگر کوئی انسان اس مقام پر پہنچ جائے کہ دوسرے انسان کو بے جرم قتل کر دے' تو (دراصل) اُس نے خود اپنی حرمت کو ختم کر دیا ہے۔ جو ہاتھ جانتے بوجھتے' عمداً اور علی الاعلان خیانت کا مرتکب ہوتا ہے' اس ہاتھ نے خود اپنی حرمت کو پامال کیا ہے۔ سید مرتضیٰ نے ابوالعلا معری کے جواب میں کیا خوب کہا ہے۔ ابوالعلا نے کہا: مجھے اسلام کا یہ

قانون سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک مقام پر تو کہتا ہے کہ ایک ہاتھ کی دیت پانچ سو دینار ہے اور دوسرے مقام پر کہتا ہے کہ اگر اس نے ایک چوتھائی دینار کی بھی چوری کی ہے تو اس ہاتھ کو کاٹ دیا جائے۔ اس {ہاتھ} کی کیا قیمت ہے؟ ایک چوتھائی دینار یا پانچ سو دینار؟ یہ دو ہزار گنا اوپر نیچے کیونکر ہو رہی ہے؟ سید مرتضیٰ نے فرمایا:

عِزُّ الْاَمَانَةِ اَغْلَاهَا وَاَرْخَصَهَا

ذُلُّ الْخِيَانَةِ فَافْهَمْ حِكْمَةَ الْبَارِي

گوشت پوست کے بنے ہوئے اس ہاتھ کا کوئی احترام نہیں ہے۔ اگر کہا گیا ہے کہ ہاتھ کی دیت پانچ سو دینار ہے' تو یہاں امانتدار ہاتھ کا احترام ملحوظ ہے' انسانیت اور امانتداری محترم ہے' امانتداری کی عزت ہے جس نے اس کی قیمت بڑھا دی ہے' اور چوری اور خیانت کی ذلت ہے جس نے اس کی قیمت کو اس قدر گرا دیا ہے۔ امانتداری قیمت کو بڑھا دیتی ہے اور خیانت قیمت کو کم کر دیتی ہے۔ انسانیت جان و مال کی قیمت بڑھاتی ہے اور اس کے مقابل' جھوٹ اور دروغ' غیبت اور انسان کشی اور لوگوں کے حقوق اور آزادی پر تجاوز وغیرہ اسکی قیمت کو اس قدر کم کر دیتے ہیں کہ بے قیمت چیز سے بھی زیادہ بے قیمت ہو جاتی ہے۔

کفارِ قریش جنہوں نے اس زمانے تک کم از کم تیرہ برس اپنی تمام کوششیں اس بات پر صرف کی تھیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا گلا گھونٹ دیں' تا کہ لوگوں تک صدائے حق نہ پہنچ سکے' کیونکہ یہ ان کے مفادات کے خلاف ہے' مسلمانوں کو تکلیفیں پہنچائیں' اذیتیں دے کر ان کو قتل کر دیں اور کسی ظلم سے دریغ نہ کریں' جبکہ وہ جانتے تھے کہ وہ حق بات کہہ رہے ہیں' پھر بھی ہم کہیں کہ ان کا مال محترم ہے' ان کا تجارتی مال قابلِ احترام ہے؟!

پہلی بات تو یہ کہ یہ تجارتی مال انہوں نے کہاں سے حاصل کیا ہے؟ قرآنی نص کے مطابق مکہ کے کچھ لوگ سود خور تھے' ان کے پاس جو بھی مال تھا وہ چوری اور سود خوری سے حاصل کیا ہوا تھا۔ کیا ان کا مال قابلِ احترام ہے؟!

لہٰذا ایسا نہیں ہے کہ ان کا مال محترم ہونے کے باوجود نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس پر

قبضہ کرنے کی اجازت اس لئے دی تھی کہ آپ کا مقصد نیک تھا۔ بلکہ اگر کوئی نیک مقصد نہ بھی ہوتا' تب بھی ان کے مال کی کوئی حرمت نہیں تھی۔

دوسرے مواقع پر مسئلہ ایسا نہیں ہے' بلکہ اہم اور اہم ترین کا مسئلہ ہے۔ فقہا نے مقدمۂ واجب میں بالخصوص اس کا ذکر کیا ہے۔ اس بارے میں ہم آپ کی خدمت میں ایک وضاحت عرض کریں گے: اس حوالے سے ہماری گفتگو کہ ہدف' ذریعے اور وسیلے کو جائز قرار نہیں دیتا (اور نبوت کے مقصد کے حوالے سے علامہ طباطبائی کی گفتگو) یہ تھی کہ ہم ایمان کے راستے میں' لوگوں کے ایمان کی تقویت اور حفاظت کے لئے' لوگوں کو حق و حقیقت اور اسلام کی طرف دعوت دینے کے لئے' باطل سے استفادہ نہ کریں۔ یعنی ایمان اور راہِ حق کی جانب دعوت کا مزاج ایسا ہے جو جھوٹ اور باطل کو قبول نہیں کرتا۔ ہماری بات اس حوالے سے تھی نہ کہ کسی اور اعتبار سے۔ جس قرآنی آیت سے وہ استدلال کرتے ہیں' وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت سے بہت عتاب آمیز آیت ہے:

"وَ لَوْ لَآ اَنْ ثَبَّتْنٰکَ لَقَدْ کِدْتَّ تَرْکَنُ اِلَیْهِمْ شَیْئًا قَلِیْلًا اِذًا لَّاَذَقْنٰکَ ضِعْفَ الْحَیٰوةِ وَ ضِعْفَ الْمَمَاتِ۔" (۱)

اے پیغمبر! اگر خدا کی عنایت نہ ہوتی' تو نزدیک تھا کہ آپ سے لغزش سرزد ہو جاتی۔ اب پیغمبر کی لغزش کیا تھی؟ جیسا کہ تفاسیر میں لکھا گیا ہے' ایسا نہیں تھا کہ پیغمبر نے کوئی لغزش کی ہے' شاید ان کے ذہن میں کوئی معمولی سا تصور پیدا ہوا ہوگا لیکن آپ نے فوراً ہی اس کے برخلاف فیصلہ کر لیا۔ اسکے باوجود قرآن انہیں سرزنش کرتا ہے۔

{ایک قبیلے کے لوگ آنحضرتؐ کے پاس آئے اور} انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہمیں اسلام اختیار کرنے کے عوض اس بات کی اجازت دیجئے کہ ہم ایک سال نماز نہ پڑھیں' یا

۱۔ سورۂ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۷۴ ۷۵ {اور اگر ہماری خاص توفیق نے آپ کو ثابت قدم نہ رکھا ہوتا' تو آپ کچھ نہ کچھ ان کی طرف مائل ضرور ہو جاتے' اور پھر ہم دنیاوی زندگی اور موت دونوں مرحلوں میں دُہرا دُہرا مزہ چکھاتے}

ایک سال تک ہمیں بتوں (کی پوجا) سے نہ روکیں۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی بات ماننے کا فیصلہ نہیں کیا تھا' لیکن شاید ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا ہو کہ ان کی ہدایت کے لئے اور خدا کی خاطر کچھ لچک' کچھ توافق' کچھ ساز باز کر لیتا ہوں (جیسا کہ بعض لوگ حضرت علی علیہ السلام سے تقاضا کرتے تھے کہ خدا کی خاطر معاویہ کے ساتھ کچھ ساز باز کر لیں) نہیں' ایمان کا مزاج ان لچکوں اور ان ساز بازوں سے موافقت نہیں رکھتا۔

اگر ایمان اور حقیقت کا مسئلہ درپیش نہ ہوتا' بلکہ اجتماعی اور انفرادی حقوق کا (معاملہ ہوتا تو کوئی مضائقہ نہیں تھا)۔ مثلاً کسی انسان کی جان بچانے کی خاطر جھوٹ بول دینے میں بھی کیا مضائقہ ہے۔ بعد میں جب پتا چل جائے کہ اس نے یہ جھوٹ اس کی جان بچانے کے لئے بولا تھا' تو کوئی بری بات نہیں ہے۔ لیکن اگر میں چاہوں کہ لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دوں' اور {اس مقصد کے لئے} ایک غیر حقیقی اور جھوٹی دلیل پیش کروں' بعد میں پتا چلے کہ جو دلیل میں نے دی تھی اور جو راستہ میں نے طے کیا تھا وہ جھوٹا تھا اور میں نے جھوٹ بول کر لوگوں کو مومن بنایا تھا' تو یہ عمل ایمان پر ایسی کاری ضرب لگاتا ہے جس کا علاج ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا ہماری گفتگو تبلیغ کے موضوع پر تھی۔ ہم پہلے مثال عرض کر چکے ہیں کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ تقویت ایمان کی خاطر اہل بدعت پر تہمت بھی لگائی جا سکتی ہے۔ بالفاظِ دیگر تقویتِ ایمان کے لئے اہل بدعت کی جانب جو جھوٹی نسبت دینا چاہو دے دو۔ وہ چاہتے تھے کہ اس بہانے سے کہ ہمارا مقصد نیک ہے' ایک اجازت نامہ جاری کر دیں' اور یہ کہیں کہ جب بھی مقصد نیک ہو اسلام نے ہمیں اپنے دشمنوں پر جھوٹی نسبت دینے کی اجازت دی ہے۔ ہم نے عرض کیا تھا کہ نہیں' اسلام ایمان اور حق وحقیقت کی طرف دعوت دینے کے لئے ہرگز جھوٹ کی اجازت نہیں دیتا' کسی بھی شکل میں اور کسی بھی صورت میں۔ تمام نیک کام اسی قبیل سے ہیں۔

میرزا حسین نوریؒ کا کلام

مرحوم حاج میرزا حسین نوری اعلی اللہ مقامہ کا شمار چوٹی کے شیعہ محدثین میں ہوتا ہے اور ان

کی وفات کو تقریباً بہتر سال سے زیادہ کا عرصہ نہیں گزرا ہے، کیونکہ ان کا انتقال سن ۱۳۲۱ھ ق میں ہوا ہے۔ میرے مرحوم والد قدس اللہ سرہ جو سن ۲۱ میں تعلیم کے لئے نجف اشرف تشریف لے گئے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ اس سال (جو ان کی تعلیم کا پہلا سال تھا) میں نے ایک بار مرحوم حاجی کو دیکھا کہ وہ منبر پر گئے (وہ عظیم محدث بھی تھے اور منبر سے خطاب بھی فرماتے تھے) اور مجھے یاد ہے کہ انہوں نے اس آیت کو عنوان قرار دیا: وَ لَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِکَ غَدًا اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ۔ (۱) اسکے کچھ ہی عرصے بعد وہ بیمار ہوئے اور دنیا سے رخصت ہو گئے۔ وہ مرحوم حاج شیخ عباس قمی رضوان اللہ علیہ کے استاد تھے۔ مرحوم حاج میرزا حسین نوریؒ واقعتاً ایک بلند پایہ محدث تھے۔ انہوں نے ایک چھوٹی سی کتاب لکھی ہے (جسے میں نے اول سے آخر تک پڑھا ہے اور اس سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوا ہوں، اور میں نے متعدد بار اس کتاب کی ترویج و تبلیغ کی ہے) {یہ کتاب} صاحبانِ منبر کے متعلق احکام کے بارے میں ہے اور اس میں ایسے صاحبانِ منبر پر تنقید کی گئی ہے جو تبلیغ دین کی شرائط کا خیال نہیں رکھتے۔ کتاب کا نام "لولو و مرجان" ہے، جو فارسی زبان میں ہے۔ (۲)

مرحوم حاج میرزا حسین نوریؒ نے محسوس کیا کہ بعض صاحبانِ منبر دو چیزوں کا خیال نہیں رکھتے۔ ایک سچائی کا، اور وہ بھی اس بہانے سے کہ ہمارا مقصد نیک ہے اور نیک مقصد کے لئے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اگر ہم نے کوئی ضعیف حدیث بیان کر بھی دی، تو کوئی بات نہیں۔ (ایمان کی جانب دعوت کے علاوہ) ہمارا دوسرا مقصد امام حسین علیہ السلام پر رُلانا ہے، اور یہ بھی ایک نیک مقصد ہے، یہ بھی ایمان کی طرف دعوت ہے اور ایمان کا معاملہ ہے۔ انہوں نے اپنی نصف کتاب میں سچ اور جھوٹ کے بارے میں بحث کی ہے اور اس مسئلے پر گفتگو کی ہے کہ اسلام کسی صورت اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم دین کی تبلیغ کے لئے حتیٰ ضعیف روایات کا بھی

۱۔ سورۂ کہف ۱۸۔ آیت ۲۳ اور ۲۴

۲۔ یہ کتاب اردو زبان میں آدابِ اہلِ منبر کے نام سے دستیاب ہے۔

سہارا لیں؛ چہ جائیکہ ایسی کسی چیز کا جس کے بارے میں ہم جانتے ہوں کہ وہ جھوٹی ہے۔

اپنی کتاب کے دوسرے نصف حصے کو انہوں نے اخلاص کے مسئلے کے لئے مخصوص کیا ہے؛ یعنی دین کی تبلیغ میں اور امام حسین علیہ السلام پر رلانے میں خلوصِ نیت شرط ہے (سیرت نبویؐ کے طور پر جن موضوعات کو ہم بیان کرنا چاہتے ہیں' اُن میں سے ایک یہی موضوع ہے) اسکے بعد انہوں نے اجر اور اُجرت کا مسئلہ اٹھایا ہے۔ انہوں نے اس کتاب میں اس بات کی بہت تاکید کی ہے۔ آج یہ نکتہ ہمارے ذہن میں آیا کہ وہی بات جو ہم نے ذریعے کے استعمال کے عنوان کے تحت بیان کی ہے' اسے انہوں نے ایک دوسرے عنوان کے تحت بیان کیا ہے اور وہ کبھی کبھی کوئی دلچسپ اور مزیدار بات بھی بیان کر دیتے ہیں۔ جیسے کہ انہوں نے کہا کہ ہندوستان کے ایک عالم نے مجھے خط لکھا ہے کہ یہاں لوگ آ کر انتہائی جھوٹی باتیں کرتے ہیں اور ضعیف اور باطل حدیثیں بیان کرتے ہیں' آپ جو مرکز میں تشریف فرما ہیں' کچھ کیجئے' کوئی کتاب لکھئے تا کہ ان کو روکا جا سکے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے جواب میں لکھا کہ یہ جھوٹ کہیں اور نہیں اسی مرکز میں گھڑے جاتے ہیں۔ اسکے بعد وہ اس بارے میں کہتے ہیں کہ دیکھئے معاملہ کہاں تک پہنچ گیا ہے۔ یزد کے ایک عالم نے مجھ سے نقل کیا کہ ایک مرتبہ میں یزد سے صحرا کے راستے امام رضا علیہ السلام کی زیارت کے لئے مشہد جا رہا تھا۔ ایامِ محرم شروع ہو گئے۔ شبِ عاشور ہم ایک گاؤں میں پہنچے۔ مجھے بہت افسوس ہوا کہ ایام عاشور میں ہم مشہد' یا کم از کم کسی ایسے شہر نہیں پہنچ سکے جہاں عزاداری ہوتی ہو۔ دل میں کہا کہ بالآخر اس گاؤں میں بھی لازماً کہیں نہ کہیں عزاداری ہوتی ہی ہوگی۔ پوچھ گچھ کی تو معلوم ہوا کہ مثلاً ایک امام بارگاہ ہے جہاں لوگ عزاداری کرتے ہیں۔ وہاں گئے تو ہم نے دیکھا کہ ایک دیہاتی ذاکر منبر پر بیٹھ رہا ہے۔ جب وہ منبر پر بیٹھ گیا تو میں نے دیکھا کہ مسجد کا خادم گیا اور اپنے دامن میں پتھر بھر کر لایا اور ذاکر یا مداحِ اہلِ بیتؑ کے دامن میں ڈال دیئے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ یہ کس لئے ہے؟ اُس ذاکر نے کچھ مصائب پڑھے لیکن کسی نے گریہ نہیں کیا۔ وہ بولا: چراغ گل کر دو۔ چراغ گل کر دیئے گئے۔ جیسے ہی چراغ گل کیے گئے' اُس نے لوگوں کے سروں پر سنگ باری شروع کر دی۔ لوگوں کی آہ و بکا بلند ہونے لگی' لوگ چیخ پکار مچانے لگے اور

آخرکار لوگوں نے گریہ کرلیا۔ جب سب کچھ ختم ہوگیا تو میں نے اس سے پوچھا کہ یہ کیا تھا؟ یہ ایک گناہ ہے اور اس کی دِقت ہوتی ہے' تم نے ایسا کیوں کیا؟ کہنے لگا: یہ لوگ امام حسینؑ کی خاطر اس کے علاوہ کسی اور طریقے سے گریہ کرتے ہی نہیں ہیں۔ بہرصورت لوگوں کے آنسو تو نکلوانے ہیں' جو ذریعہ بھی ممکن ہو اس سے استفادہ کرنا چاہئے۔

وہ کہتے ہیں یہ بات غلط ہے' یہ کیا ہوا کہ ''جس طریقے سے بھی ہو سکے''؟!

کیا امام حسین علیہ السلام پر اتنے جانسوز مصائب نہیں گزرے؟!

اگر اُس کے سینے میں دل ہے' اگر اسے امام حسینؑ سے محبت ہے' اگر وہ واقعاً امام حسینؑ کا شیعہ ہے' تو اگر تم سچے مصائب بھی بیان کرو گے تو بھی وہ گریہ کرے گا' اور اگر اس کے سینے میں دل ہی نہیں ہے' اگر اسے امام حسینؑ سے محبت ہی نہیں ہے' اگر وہ امام حسینؑ کی معرفت ہی نہیں رکھتا' تو وہ سو سال بھی گریہ نہ کرے' ہمیں کیا۔ یہ کیا طریقہ ہے جو تم اختیار کررہے ہو؟!

لہٰذا یہ بات جو ہم نے عرض کی کہ {حق و} حقیقت کے لئے ہر وسیلے سے استفادہ نہیں کیا جاسکتا' اس سے ہماری مراد ایمان ہے اور اُن کا مقصد بھی یہی ہے۔ یعنی حق و حقیقت کی جانب دعوت کے راستے میں' لوگوں کو بے ایمانی سے ایمان کی طرف لے جانے کی راہ میں تو اہم اور زیادہ اہم کا معاملہ بھی نہیں ہے۔ اہم اور زیادہ اہم (اہم اور مہم) کا مسئلہ کسی اور جگہ کے لئے ہے۔ یعنی اجتماعی مصلحت میں اور حتیٰ انفرادی اور ذاتی عبادات کے معاملے میں جیسے نماز پڑھنا یا غصبی زمین وغیرہ کے مسئلے میں۔ لیکن تبلیغ اور اسلام کا پیغام پہنچانے کے معاملے میں انسان کو ذرہ برابر حق و حقیقت سے (تجاوز نہیں کرنا چاہئے)۔ انسان ایک حدیث بیان کرنا چاہتا ہے' پھر سوچتا ہے کہ اگر اس حدیث کو اس طرح سے بیان کروں تو اس کا اثر بہتر ہوگا۔ یہ گناہ ہے' بلکہ اسے دخل در معقولات کہنا چاہئے' تمہیں ان باتوں کا حق نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ قرآنی آیات پیش کرتے ہیں کہ خدا نے ضمانت دی ہے: اِنَّا لَنَنۡصُرُ رُسُلَنَا. (۱) ہم تبلیغ کے راستے میں اپنے پیغمبروں کی مدد کرتے

۱۔ سورۂ مومن ۴۰۔ آیت ۵۱

ہیں۔اے میرے پیغمبرو! تم حق وحقیقت کی راہ پر چلو' تاثیر پیدا کرنا ہمارا کام ہے' ہم ضمانت دیتے ہیں۔انبیا نے بھی وہی راستہ اختیار کیا اور جس نتیجے تک پہنچنا چاہتے تھے اس تک پہنچ گئے۔

پس لوگوں کو دین وایمان کی طرف دعوت دیتے ہوئے ذرائع کے استعمال میں ہمیں اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ ہم ہر ممکنہ ذریعے کو کام میں لائیں۔اس طرح ہم غلط کرتے ہیں' اس کا الٹا نتیجہ نکلتا ہے۔ہم ذرائع (کتابوں) کے معاملے میں محتاج نہیں ہیں' چھوڑ دو ان لوگوں کو جو کتابوں کے اعتبار سے محتاج ہیں' وہ جائیں اور جعلی چیزیں گھڑیں۔ہمارا مطلب یہ ہے کہ ہم کیوں ایسا کریں؟! ہم کتب کے اعتبار سے اتنے ثروتمند ہیں کہ اس کی ضرورت کا احساس بھی غلط ہے۔آپ لوگوں کو امام حسین علیہ السلام پر رلانا چاہتے ہیں' عاشور کا منظر اس قدر ولولہ انگیز ہے' اس قدر جذباتی ہے' اس قدر رقت آمیز ہے' اس میں اس قدر عظیم' دل سوز اور جاذب مناظر ہیں کہ اگر ہمارے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہو تو صرف امام حسینؑ کا نام سنتے ہی ہماری آنکھوں سے اشک جاری ہو جائیں گے۔ اِنَّ لِلْحُسَیْنِ مَحَبَّۃً مَکْنُوْنَۃً فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ. امام حسینؑ سے ایک پوشیدہ محبت ہر مومن کے دل میں ہے۔ اَنَا قَتِیْلُ الْعَبْرَۃ. (۱) میں مقتول اشک ہوں۔

عربی زبان میں امام جعفر صادق علیہ السلام کے ایک صحابی کے اشعار ہیں' انتہائی عجیب شعر ہیں۔شاید اپنی طالب علمی کے ابتدائی دور میں جبکہ میں مشہد میں ہوتا تھا ابھی قم نہیں گیا تھا' میں نے ان اشعار کو محدث قمی کی کتاب "نفثة المصدور" سے حفظ کیا تھا۔وہ لکھتے ہیں کہ ابو ہارون مکفوف (جو بظاہر نابینا تھے اور انہیں مکفوف کہا جاتا تھا) ایک ماہر شاعر تھے اور کبھی کبھی امام حسین علیہ السلام کے بارے میں مرثیہ کہا کرتے تھے۔وہ کہتے ہیں کہ ایک دن میں امام صادق علیہ السلام کی خدمت میں پہنچا۔انہوں نے مجھ سے فرمایا: جو مرثیہ تم نے میرے جد کے بارے میں کہا ہے وہ پڑھو۔میں نے عرض کیا ضرور۔فرمایا: عورتوں کو بھی کہو کہ پردے کے پیچھے آ جائیں تاکہ وہ بھی سن سکیں۔عورتیں اندرونی سے آکر اس کمرے میں پردے کے پیچھے نزدیک

۱۔ بحار الانوار۔ طبع جدید۔ ج ۴۴۔ ص ۲۷۹ اور ۲۸۰

آ کر بیٹھ گئیں۔

اس نے اشعار پڑھنا شروع کئے جو بظاہر اس نے نئے ہی کہے تھے۔ لیکن آپ ذرا ان کا مضمون دیکھئے' اور ان میں موجود سبق کو ملاحظہ کیجئے۔ جب ان اشعار کو (جو باوجودیکہ پانچ مصرعوں سے زیادہ نہ تھے) پڑھا تو امام صادق علیہ السلام کے گھر میں کہرام مچ گیا۔ امام صادقؑ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور ان کے شانے لرز رہے تھے۔ امامؑ کے در دولت سے گریہ وزاری کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ بعد میں بظاہر خود امامؑ نے فرمایا کہ بس کرو۔ اتنے مرثیے کہے گئے ہیں لیکن میں نے اس جیسا مرثیہ کوئی نہیں دیکھا' یا بہت کم دیکھا ہے۔ کہتا ہے:

اُمْرُرْ عَلیٰ جَدَثِ الْحُسَیْنِ فَقُلْ لِاَعْظُمِهِ الزَّکِیَّةِ

أَاَعْظُماً لَا زِلْتَ مِنْ وَطْفَاءَ سَاکِبَةٍ رَوِیَّةِ

وَ اِذَا مَرَرْتَ بِقَبْرِهِ فَاَطِلْ بِهِ وَقْفَ الْمَطِیَّةِ

وَ ابْکِ الْمُطَهَّرَ لِلْمُطَهَّرِ وَ الْمُطَهَّرَةِ النَّقِیَّةِ

کَبُکَاءِ مُعْوِلَةٍ اَتَتْ یَوْماً لِوَاحِدِهَا الْمَنِیَّةُ (۱)

ان اشعار کا مضمون یہ ہے: کہتا ہے اے رہ گزر' اے بادِ صبا! حسین ابن علیؑ کی قبر سے گزر' اور ان کے محبوں کا پیغام انہیں پہنچا دے' ان کے عاشقوں کا پیام انہیں دیدے۔ اے بادِ صبا' ہمارا پیغام حسینؑ کی پاکیزہ ہڈیوں تک پہنچا دے' کہہ دے' اے ہڈیو! تم ہمیشہ حسینؑ کے دوستوں کے آنسوؤں سے سیراب ہو۔ یہ اشک بہتے ہیں اور تمہیں سیراب کرتے ہیں۔ اگر ایک دن تمہیں پانی سے دور رکھا گیا تھا' اگر حسینؑ کو تشنہ لب شہید کیا گیا تھا' تو ان کے یہ محبّ اور شیعہ ہمیشہ اپنے اشک تم پر نچھاور کرتے ہیں۔ اے بادِ صبا اگر وہاں سے گزر ہو تو صرف یہ پیغام پہنچانے پر اکتفا نہ کرنا۔ وہاں اپنی سواری کو روک لینا' بہت دیر تک روکے رکھنا' ٹھہر جانا اور حسینؑ کے مصائب کو یاد کرنا اور آنسو بہانا' آنسو بہانا اور آنسو بہانا' ایک عام آدمی کی طرح نہیں بلکہ اس عورت کی طرح جس

۱۔ نفثة المصدور۔ ص ۳۶' الاغانی۔ ج ۱۔ جزء ۷

کا صرف ایک ہی بچہ ہو وہ کس طرح اپنے بچے کی موت پر اشک بہاتی ہے اس طرح سے اشک بہانا اس پاکیزہ انسان پاکیزہ باپ کے بیٹے پاکیزہ ماں کے فرزند پر گریہ کرنا۔

وَ لاحَولَ وَ لا قُوَّۃَ اِلا باللّٰہ العلیّ العظیم

وَ صلّی اللّٰہُ علی محمد و آلہ الطاھرین .

☆☆☆

چھٹی نشست

تبلیغ کی اہمیت اور مبلغ کی شرائط

تبلیغ کی اہمیت اور مبلغ کی شرائط

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین باریٔ الخلائق اجمعین. والصلوٰۃ والسلام علیٰ عبداللہ ورسولہ و حبیبہ و صفیہ و حافظ سرّہ ومبلّغ رسالاتہ سیّدناونبیّنا ومولانابی القاسم محمدوآلہ الطیّبین الطاہرین المعصومین.

اعوذباللہ من الشیطان الرجیم

"یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا وَّ دَاعِیًا اِلَی اللهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیْرًا." (۱)

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت سے حاصل ہونے والے لازمی اسباق میں سے ایک سبق، حق کی طرف دعوت کا طریقہ، اندازِ تبلیغ اور لوگوں کو پیغامِ حق پہنچانے کی روش ہے۔ شاید

۱۔ سورۂ احزاب ۳۳۔ آیت ۴۵ اور ۴۶ (اے رسول ہم نے آپ کو گواہ، بشارت دینے والا، عذاب الٰہی سے ڈرانے والا اور خدا کی طرف اس کی اجازت سے دعوت دینے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔)

ابتدا میں انسانوں کو حق کی طرف بلانا' خدا کی طرف دعوت دینا اور اُن تک پیغامِ الٰہی پہنچانا بعض لوگوں کو ایک معمولی کام نظر آئے۔ لوگ یہ سوچتے ہوں کہ یہ دعوت اور پیغام رسانی دوسری دعوتوں اور پیغام رسانیوں سے کس طرح مختلف ہے۔{اس سلسلے میں} ہم سب سے پہلے اس حوالے سے خود قرآنِ کریم کے نکتۂ نظر کو عرض کریں گے' کہ قرآن اس کام کو کس قدر اہم' سخت اور دشوار سمجھتا ہے۔ پھر اسکے بعد وضاحت کریں گے کہ اس دعوت اور پیغام رسانی اور دوسری دعوتوں اور پیغام رسانیوں کے درمیان کیا فرق ہے۔

خداوندِ عالم سے حضرت موسیٰ کی درخواستیں

قرآنِ مجید سورۂ طٰہٰ میں حضرت موسیٰ بن عمران علیٰ نبینا وآلہ وعلیہ السلام کے بارے میں ایک نکتہ بیان کرتا ہے' جو بظاہر ایک اور ماجرا ہے۔ حضرت موسیٰ مصر کی جانب واپس لوٹ رہے تھے کہ اُن کی زوجہ کو درد زہ اٹھا' لہٰذا حضرت موسیٰ اپنی اہلیہ کو سردی سے محفوظ رکھنے کی غرض سے آگ کی تلاش میں نکلے۔ وادیٔ مقدس میں آپ پر خدا کی طرف سے وحی نازل ہوئی۔ آپ پر پہلی مرتبہ وحی نازل ہوتی ہے۔ پھر اس کے بعد فرعون اور فرعونیوں تک پیغامِ الٰہی پہنچانے کی ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ موسیٰ نبوت کے حامل ہیں۔ پس اب آپ ایک عام آدمی نہیں رہے ہیں جنھوں نے ایسی بات کہی ہو۔ جب آپ سے کہا گیا کہ جائیں اور جا کر فرعون اور فرعونیوں کو خدا کا پیغام پہنچائیں' تو وہ محسوس کرتے ہیں کہ اُن کے کاندھوں پر ایک بھاری بوجھ اور دشوار ذمے داری ڈال دی گئی ہے۔ لہٰذا آپ ان جملوں کے ذریعے خدا سے کچھ درخواستیں کرتے ہیں:

"رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ."

"پروردگار مجھے شرحِ صدر عطا فرما۔"

مختصراً "شرحِ صدر" کے معنی ہیں "باطنی طور پر انتہائی وسیع اور غیر معمولی طور پر زیادہ تحمل" کا مالک ہونا۔ اے خدا! میرے باطن کے ظرف کو وسیع کردے۔ وَ يَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ. میرے کام کو میرے لیے آسان بنادے۔ پس وہ محسوس کر رہے تھے کہ اُن کا کام ایک سنگین اور دشوار کام ہے۔

وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ. میری زبان کی گرہ کو کھول دے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ "میری زبان کی گرہ کو کھول دے" سے مراد یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں کچھ لکنت تھی۔ مثلاً وہ "سین" درست طور پر نہیں بول سکتے تھے۔ یہاں تک کہا گیا ہے کہ جب وہ کم سن تھے تو فرعون نے اُن کا امتحان لینے کی خاطر ایک سرخ انگارہ اُن کی زبان پر رکھ دیا تھا (جس سے اُن کی زبان میں لکنت آ گئی تھی)۔ ہمارے خیال میں یہ بے بنیاد باتیں ہیں۔ "میری زبان کی گرہ کو کھول دے" سے بظاہر وہی مراد ہے جس پر قرآن بار بار تاکید کرتا ہے کہ پیغمبر کی تبلیغ 'تبلیغِ مبین' ہونی چاہئے' اُس کی پیغام رسانی روشن' واضح' آشکار کرنے والی اور راہنما ہونی چاہئے۔ کیونکہ اس کے بعد فرماتے ہیں: یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ. تاکہ لوگ میری بات سمجھ سکیں۔ میں تیرا پیغام لوگوں کو سمجھا سکوں اور لوگ سمجھ سکیں۔ سمجھنا یعنی واضح ہونا' درک کرنا' انسان کے لئے کوئی بات واضح ہو جانا۔ وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ هٰرُوْنَ اَخِی اشْدُدْ بِهٖۤ اَزْرِیْ وَ اَشْرِكْهُ فِیْۤ اَمْرِیْ كَیْ نُسَبِّحَكَ كَثِیْرًا وَّ نَذْكُرَكَ كَثِیْرًا. پروردگارا! یہ بہت بھاری بوجھ ہے' میری مدد فرما۔ خود ایک انسان کی پیشکش کرتے ہیں' ہارون اُن کے بھائی ہیں۔ پروردگارا! میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر (جس کے لغوی معنی "معاون" ہیں) اور میرا مددگار قرار دے' اور اسے میرے اس کام میں میرا شریک قرار دے۔ کیوں؟ اس لئے کہ کام کا معیار بہتر رہے' اس لئے نہیں کہ نعوذ باللہ میں گریز کرنا چاہتا ہوں۔ كَیْ نُسَبِّحَكَ كَثِیْرًا وَّ نَذْكُرَكَ كَثِیْرًا. {تاکہ ہم تیری بہت زیادہ تسبیح کر سکیں اور تیرا بہت زیادہ ذکر کر سکیں۔} (۱)

رسولِ اکرمؐ سے قرآن کا خطاب

ایک اور مقام پر قرآنِ مجید رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخاطب ہو کر (لیکن خدا سے رسولِ اکرمؐ کے تقاضے کی صورت میں نہیں بلکہ خدا کی جانب سے بیان کی صورت میں) ایک

۱۔ سورۂ طٰہٰ ۲۰۔ آیت ۲۵ تا ۳۴

انجام شدہ کام کا ذکر کرتا ہے۔ سورۂ مبارکہ الم نشرح میں ارشاد ہوتا ہے:

"اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ."

"کیا ہم نے آپ کو شرحِ صدر عطا نہیں کیا؟"

حضرت موسیٰ علیہ السلام شرحِ صدر کا تقاضا کرتے ہیں، لیکن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے سے خود قرآنِ مجید ایک انجام شدہ کام کی صورت میں فرماتا ہے: کیا ہم نے آپ کو شرحِ صدر عطا نہیں کیا؟ وسیع ظرف نہیں دیا؟ یعنی وسیع ظرف کا پایا جانا اس کام کی ایک شرط ہے، اور ہم نے یہ شرط آپ کو فراہم کی ہے۔

"وَ وَضَعْنَا عَنْکَ وِزْرَکَ."

"اور اس بھاری بوجھ کو آپ کے کاندھے سے اتار نہیں دیا؟"

وہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں: وَ یَسِّرْ لِیْٓ اَمْرِیْ. اس بھاری بوجھ کو میرے لئے آسان اور ہلکا کر دے۔ یہاں قرآنِ مجید پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرماتا ہے کہ ہم نے یہ بھاری بوجھ آپ کے کاندھے سے اتار دیا ہے۔

اَلَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَکَ. یہ بہت بڑی بات ہے۔ یہ بھاری بوجھ جو اس قدر بھاری تھا کہ آپ کی کمر توڑے ڈال رہا تھا۔ خاتم الانبیاؐ سے خطاب ہے، بوجھ بھی دعوت و تبلیغ اور لوگوں کا سامنا کرنے کے سوا کوئی اور نہیں ہے، وہ لوگ جن کی ہدایت و رہنمائی مقصود ہے، بلکہ جنہیں پروردگار کی جانب کھینچ کر لے جانا ہے۔ یہ کام اس قدر مشکل ہے کہ {اس کے بارے میں} قرآن کی تعبیر یہ ہے کہ: آپ کی کمر توڑے ڈال رہا تھا۔ اَنْقَضَ کے بظاہر یہی معنی ہیں۔ اگر ایک چھت ہو اور ایک بہت بھاری وزن، مثلاً بڑی تعداد میں انسان یا کوئی بہت وزنی چیز اس کے اوپر رکھی ہوئی ہو کہ اس چھت کی لکڑیاں آواز کرنے لگیں اور معروف اصطلاح میں چر چرانے لگیں، تو کہتے ہیں: اَنْقَضَ یا نَقَضَ. یا اسی قسم کے الفاظ بولے جاتے ہیں۔ جب کہنا چاہتا ہے کہ یہ بوجھ اتنا بھاری تھا کہ گویا آپ کی کمر کی ہڈیاں چیخ رہی تھیں، تو کہتا ہے: اَنْقَضَ ظَهْرَکَ.

"وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ."

''ہم نے ہر جگہ آپ کا نام بلند کر دیا ہے۔''

ایک بار پھر کام کی سختی کا ذکر ہے:

''فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْراً اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْراً. فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَ اِلیٰ رَبِّکَ فَارْغَبْ.''

اے پیغمبر! کام بہت دشوار ہے' لیکن اگر انسان دشواریوں کو برداشت کرلے تو دشواری کے ساتھ آسانی ہے' یعنی آسانیاں دشواریوں کے بطن میں پوشیدہ ہیں' ہر دشواری کے اندر آسانی موجود ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ صبر کرو' استقامت سے کام لو۔ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْراً. ایک بار پھر تاکید کرتا ہے: اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْراً.

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیت سے یوں محسوس کیا کہ ہر دشواری کے ساتھ دو آسانیاں ہوں گی' اس احساس سے آپ کا چہرہ مبارک کھل اُٹھا اور آپ خوشی سے بار بار دُہراتے تھے' اور فرماتے تھے کہ ایک دشواری دو آسانیوں کا کیا بگاڑ سکتی ہے؟! میرے خدا نے مجھے ان دشواریوں کے ساتھ آسانی اور نرمی کا وعدہ دیا ہے۔

''فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَ اِلیٰ رَبِّکَ فَارْغَبْ.''

اگر آپ ان آیات کا حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی آیات کے ساتھ موازنہ کریں' اور پھر شیعوں اور سنیوں کے درمیان اس متواتر جملے کو مدنظر رکھیں جسے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں فرمایا ہے کہ:

''اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوسیٰ.''(۱)

''آپ کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھی۔''

یعنی جس طرح سے ہارون اس کام میں موسیٰ کے شریک اور معاون تھے' اسی طرح سے آپ

۱۔ اس حدیث کا بقیہ حصہ یہ ہے: اِلَّا اَنَّهُ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ. (سوا اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ۔ سفینۃ البحار۔ ج ۲۔ ص ۵۸۳ اور ۵۸۴)

بھی امت کے دو میں سے ایک باپ ہیں۔

اس صورت میں آپ دیکھیں گے کہ یہ جو شیعہ تفسیروں میں آیا ہے اور بظاہر روایات نے بھی جس کی تائید کی ہے کہ "فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ" کا اشارہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی خلافت کی جانب ہے، تو یہ بات بالکل دل کو لگتی ہے کہ ایسا ہی ہونا بھی چاہئے اس کے سوا کچھ اور نہیں۔ لیکن فی الحال ہماری بحث ایک دوسرے نکتے کے بارے میں ہے۔

بھاری بات

قرآنِ مجید کی ایک اور آیت جو دعوتِ حق اور پیغامِ ربانی پہنچانے کے معاملے کی غیر معمولی اہمیت اور شدید دشواری کا ذکر کرتی ہے، وہ سورۂ مزمل کی ایک آیت ہے، اور آپ جانتے ہیں کہ سورۂ مزمل اور سورۂ مدثر بعثت کی ابتدا میں نازل ہونے والی سورتوں میں سے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

"اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا."

"ہم عنقریب آپ پر ایک بھاری بات نازل کرنے والے ہیں۔"

بات کے بھاری ہونے سے کیا مراد ہے؟ کوئی بات، بات ہونے کے اعتبار سے ہلکی اور بھاری نہیں ہوا کرتی۔ ممکن ہے بات کا مضمون یا جو بات بیان کی گئی ہے اس کو نافذ کرنا سخت اور دشوار ہو، اور ممکن ہے آسان ہو۔ خود ہم بعض اوقات کہتے ہیں کہ: فلاں شخص نے فلاں شخص کو سخت بات کہی ہے، یعنی ایک ایسی بات کہی ہے جس کے معنی برداشت کرنا اس کے لئے مشکل ہے۔ یا ہم کہتے ہیں کہ: ہمیں بہت مشکل کام سونپا گیا ہے۔ ایسا شخص جو کسی افسر کی جانب سے مامور ہوتا ہے، وہ کہتا ہے کہ ہمیں بھاری ذمے داری دی گئی ہے۔ ایک حکم صادر کیا گیا ہے، اس سے کہا گیا ہے کہ جاؤ فلاں کام انجام دو۔ کہتا ہے کہ ہمیں بھاری ذمے داری دی گئی ہے۔ ذمے داری کے بھاری ہونے سے کیا مراد ہے؟ ذمے داری، وہ حکم، وہ کاغذ، وہ بات اور وہ خط وغیرہ تو نہ ہلکا ہوتا ہے اور نہ بھاری۔ اس بارے میں بحث نہیں ہے۔ جب اس ذمے داری کا مضمون اور مواد ایک غیر معمولی طور پر دشوار کام ہو، تو کہتے ہیں کہ بھاری ذمے داری۔ قرآنِ مجید کا ارشاد ہے: اِنَّا سَنُلْقِیْ

عَلَیْکَ قَوْلاً ثَقِیْلاً. ہم عنقریب آپ پر ایک بھاری بات نازل کرنے والے ہیں' اور یہ لوگوں کو دعوت دینے اور ان کی ہدایت کرنے کے سوا کوئی اور چیز نہیں ہے۔

ممکن ہے کچھ لوگ یہ سوال کریں کہ قرآنِ مجید دعوت اور تبلیغ کے کام کو اس قدر دشوار کام کیوں قرار دیتا ہے؟

تبلیغ کے مسئلے کی اہمیت

بعض مسائل کی اہمیت کو ہم نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ کیونکہ ہم نے اُن کی اہمیت کو' یعنی اُن کی منزلت کو جان لیا ہے' لہٰذا انہیں اُن کی منزلت کے ساتھ جانتے ہیں۔ مثلاً فتویٰ دینے کا مسئلہ۔ خوش قسمتی سے' بڑی حد تک ہمارے معاشرے کے کم از کم پچانوے فیصدی افراد یہ جانتے ہیں کہ فتویٰ دینا ایک مشکل اور انتہائی اعلیٰ سطح کا کام ہے۔ نہ کوئی جلد مفتی ہونے کا دعویٰ کرنے کی جرأت کرتا ہے اور نہ ہی معاشرہ اس دعوے کے شوقین افراد کا دعویٰ جلد قبول کرتا ہے۔ معاشرے نے اس بات کو محسوس کرلیا ہے کہ یہ ایک اعلیٰ سطح کا کام ہے۔ لیکن لوگوں کو حق کی دعوت دینے' لوگوں کو تبلیغ کرنے' لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کرنے' لوگوں کو خدا کی جانب حرکت دینے (اس کی اہمیت کو نہیں پہچانا گیا ہے)۔ یہاں ہم حرکت دینے کے بارے میں گفتگو کریں گے۔

{شاعر نے} کہا ہے:

در این رہ انبیاء چون ساربانند	دلیل و رہنمای کاروانند
و ز ایشان سید ما گشته سالار	همو اوّل همو آخر در این کار
جمال جانفزایش شمع جمع است	مقام دلگشایش جمعِ جمع است
روان از پیش و دلها جمله از پی	گرفته دست جانها دامن وی

انسان کو حرکت دینا ہے' البتہ کس طرف حرکت دینا ہے؟ مفادات کی جانب؟ نہیں۔ بہت سے مکاتیب (schools of thought) انسان کو حرکت دیتے ہیں' بہت اچھی طرح حرکت دیتے ہیں' لیکن کس طرف؟ مفادات کی طرف' اُس کے منافع کی جانب۔

ہم کچھ نسبتاً مقدس مقاصد کی بات بھی کر لیتے ہیں: لوگوں کے حقوق کے جانب {حرکت دیتے ہیں} اس لئے کہ آخر کار لوگوں کے مفادات ان کے حقوق میں پوشیدہ ہیں' اور یہاں تک ہم بھی ان سے متفق ہیں۔ انبیاؑ بھی لوگوں کو اُن کے حقوق کے حصول کی جانب حرکت دیتے ہیں۔ انبیاؑ کے پروگراموں میں سے ایک پروگرام لوگوں کو حرکت دینا ہے' لیکن یہ وہ معمولی سی حرکت ہے جو انبیاؑ دیتے ہیں' وہ محروم کو اس بات پر ابھارتے ہیں کہ اے محروم! جاؤ اور اپنا حق لے لو' اے مظلوم! جاؤ اور ظالموں سے اپنا حق چھین لو۔ یہ بھی انبیا کی تحریکوں کا ایک حصہ ہے' لیکن یہ بہت معمولی حرکت ہے' کیونکہ انسان کے مفادات اور اس کا طبیعی رجحان بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ ''ستم زدہ لوگو! متحد ہو جاؤ اور ظالموں سے اپنا حق چھین لو''۔

البتہ اس راہ پر چلانا بھی ایک کام ہے' ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ ایک معمولی کام ہے' لیکن انبیاؑ کے پروگرام کے مطابق یہ وہ معمولی کام ہے جو انبیاؑ نے انجام دیا ہے اور دوسروں کی نسبت اس کام کو بہتر طور سے انجام دیا ہے۔ وہ عظیم حرکت جو انبیاؑ پیدا کرتے ہیں' وہ حرکت ہے جو انسان کو اپنی ذات کی منزل سے حق کی جانب دھکیلتی ہے۔ {شاعر نے} کہا ہے:

صلای بادہ زد پیرِ خرابات
بدہ ساقی کہ فی التاخیر آفات
سلوک راہِ عشق از خود رہائی است
نہ طیّ منزل و قطعِ مسافات

انسان کو خود اپنے آپ سے آزاد کروانا اور حق تک پہنچانا۔ یعنی انسان کو اس کے اپنے اندر سے خود اس کے اپنے خلاف اٹھانا۔ {اسلام} نہ صرف یہ کہ مظلوم کو ظالم کے خلاف ابھارتا ہے' بلکہ بسا اوقات ظالم کو خود اسکے اپنے خلاف ابھارتا ہے' جس کا نام توبہ ہے' پلٹنا' انسان کو خود پرستی اور نفس پرستی سے حقیقت پرستی کی طرف حرکت دینا۔ مشکل کام یہ ہے۔

جس کسی نے بھی اس کام میں انبیاؑ کا مقابلہ کیا' ہم اسے اہمیت دے سکیں گے۔ فلاں انقلابی رہنما نے عوام کو ان کے مفادات کی طرف حرکت دی ہے' چاہے اُن کے حقوق کے حصول کے نام

پر ہم نہیں کہتے کہ ان کے حقوق کے نام پر بلکہ سچ مچ ان کے حقوق کے حصول کے لئے ہم اس کے لئے مقدس لفظ بھی استعمال کرتے ہیں کہ یہ ایک عظیم کام ہے لیکن یہ انبیاؑ کا ایک بہت معمولی سا کام ہے۔ انبیاؑ کے کام کا کوئی مقابلہ ہی نہیں خدا کی طرف دعوت دینے والے ہر شخص ہر مبلغ اور خدا کا پیغام پہنچانے والے ہر انسان کو اس کی پیروی کرنی چاہئے اُسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علی علیہ السلام کے نقشِ قدم پر چلنا چاہئے۔ انسانوں کو خود غرضی خود پرستی نفس پرستی اور مفاد پرستی سے حق وحقیقت پرستی کی طرف لانا ہی مشکل کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ بہت مشکل اور دشوار کام ہے۔

ہم نے عرض کیا کہ ہم نے بعض کاموں کی بعض امور کی اہمیت کو کسی حد تک اُن کے مقام کے مطابق درک کرلیا ہے اور بجا طور پر درک کیا ہے اور ہمیں انہیں اسی طرح درک کرنا چاہئے۔ لیکن ہمیں اعتراف کرنا چاہئے کہ ہم نے بعض کاموں کی اہمیت کو اُن کے مقام کے مطابق درک نہیں کیا ہے۔

آج رات ہمارا موضوع سیرتِ نبیؐ سے تبلیغ ودعوت کے معاملے میں سبق حاصل کرنا ہے اور اتفاق یہ پیش آیا ہے کہ عالم وفاضل خطیب جناب آقائے فلسفی بھی اس مجلس میں موجود ہیں جن کے بارے میں بجا طور پر یہ کہنا چاہئے کہ وہ اس فن میں اعلیٰ مقام پر فائز ہیں اور انہوں نے اس شہر اور اس ملک کے لئے انتہائی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ ہم نے عرض کیا یہ ایک اتفاق ہے۔ ہماری مراد یہ ہے کہ ہم نے ایسا نہیں سوچا تھا لیکن ایسا ہوا اور بہت خوب ہوا۔ ہمیں جنابِ عالی کی اور اُن حضرات کی جنہوں نے ایک داعی اور ایک لائق خطیب (ممکن ہے آپ کہیں کہ اسلام کا مقام بہت بلند ہے ہم نسبی (comparative) طور پر لائق کہیں تب بھی کافی ہے) بننے کے لئے مشکلات سہی ہیں قدر کرنی چاہئے۔ {شاعر} کہتا ہے:

یَرَی النَّاسُ دُهْناً فِی الزُّجَاجَةِ صَافِیاً

وَلَمْ یَدْرِ مَا یَجْرِیْ عَلیٰ رَأْسِ سِمْسِمِ

یعنی لوگ تلوں کا صاف شدہ تیل بوتلوں میں دیکھتے ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ تلوں کے ان

دانوں پر کیا گزری ہے جس کے بعد اب وہ یہ صاف شدہ تیل دیکھ رہے ہیں۔ صاف شفاف اور پاک و پاکیزہ تبلیغ لوگ دیکھتے ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ ان بیچاروں پر کیا گزری ہے جس کے بعد انہیں آج یہ صاف شفاف تیل نظر آ رہا ہے۔

بہرصورت قرآن مجید اس معاملے کو بہت ہی بلند سطح پر لے گیا ہے۔

کیوں؟

خدا صرف اپنے پیغمبر سے کہہ سکتا تھا: اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلاً ثَقِیْلاً۔ یا: اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ۔ لیکن یہ سب امت کے لئے تعلیم ہے۔

اس حقیقت کو خدا کس لئے اپنے پیغمبر تک پہنچاتا ہے اور پوری امت کے حوالے کرتا ہے؟

خدا اور نبیؐ کے درمیان بہت سے معاملات ہیں، لیکن کیونکہ اُن کا تعلق عوام سے نہیں ہے، اس لئے صرف خدا جانتا ہے اور اس کا نبیؐ اور دوسروں سے اس کا ذکر نہیں ہوا ہے۔ جب کوئی مسئلہ بیان کیا جاتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اسے سیکھا جائے۔ دعوت کا کام ہے، تبلیغ کا کام ہے، آسان کام نہیں ہے۔ پس ہم قرآن سے سیکھتے ہیں کہ دعوت اور تبلیغ میں سب سے پہلی شرط شرح صدر ہے، وسیع القلبی ہے، ایک دنیا کے برابر وسیع ظرفیت ہے۔

عقل اور فکر کو ابلاغ

ممکن ہے آپ کہیں کہ تبلیغ اور پیام رسانی کا کام اس قدر مشکل کیوں ہوگا؟ جواباً ہم عرض کرتے ہیں کہ: ہر پیغام رسانی اتنی مشکل نہیں ہوتی۔ ایک پیغام رسانی کا تعلق صرف جس کو پیغام پہنچانا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے یہ ایک آسان کام ہے۔ کورٹ کا بیلف جو پیغام پہنچاتا ہے اور ایک شخص کو اطلاع کے طور پر یا الزام کے طور پر جو وارنٹ پہنچاتا ہے، تو یہ جس کو پیغام پہنچانا ہے، جو وہ اسے دکھا دیتا ہے۔ اگر آپ کوئی پیغام پہنچانا چاہتے ہیں، اور اگر آپ کی ذمے داری دوسرے کی صرف جس تک پیغام پہنچانا ہو، پیغام اس کو فقط دکھانا یا سنانا ہو، تو یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ لوگوں کی آنکھوں یا کانوں تک کوئی بات پہنچائی جا سکتی ہے۔ لیکن انبیاءؑ کے پاس بلاغ مبین ہے، کیا

اُن کی ذمے داری محض اتنی ہے کہ وہ لوگوں تک بات کو پہنچا دیں' اور بس کیا یہی کافی ہے؟ بس اتنا کافی ہے کہ {پیغام} لوگوں کی آنکھوں تک پہنچ جائے؟ نہیں' حس تک پہنچانے' آنکھ یا کان تک پہنچانے سے بڑھ کر' عقل اور فکر تک پہنچانا ہے۔ یعنی بات کو اس طرح بیان کرنا کہ وہ عقل میں داخل ہو جائے۔ کسی چیز کا صرف آنکھ سے نظر آنا اس بات کے لئے کافی نہیں ہے کہ عقل بھی اسے قبول کرلے۔ جو چیز کسی پیغام کو عقل تک پہنچاتی ہے' وہ صورت' شکل یا تحریر نہیں ہوتی' وہ کوئی اور چیز ہوتی ہے۔ عقل نے اپنے دروازے بند کر رکھے ہیں' وہ صرف برہان اور استدلال کے ذریعے اور قرآنِ مجید کی تعبیر کے مطابق حکمت کے سوا کسی اور ذریعے سے کوئی پیغام قبول نہیں کرتی۔

انبیاؑ پہلے مرحلے میں اپنی بات عقلوں تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ اگر آپ دیکھتے ہیں کہ مسیحیت نے اس کے برخلاف مؤقف اختیار کیا ہے اور وہ کہتی ہے کہ: ایمان کا عقل سے کوئی تعلق نہیں' تو ان کا یہ کہنا مسیحیت میں ہونے والی تحریف کی وجہ سے ہے۔ اصل مسیح ہرگز یہ بات نہیں کہتا۔ اصل مسیح نے نہ تثلیث کی بات کی ہے اور نہ ہی یہ دیکھنے کے بعد کہ تثلیث کسی عقلی معیار پر پوری نہیں اترتی اور عقل کسی صورت اسے نہیں مانتی یہ کہا ہے کہ: ایمان کا معاملہ عقل سے جدا ہے' ایمان کا علاقہ عقل کے لئے ممنوعہ علاقہ (prohibited area) ہے۔ عقل کو {ایمانیات میں} مداخلت کا حق نہیں ہے! اس چیز کا تعلق مسیحیت میں ہونے والی تحریف سے ہے۔ کسی نبیؑ نے ایسی بات نہیں کہی۔ تمام انبیاؑ کے حوالے سے جو کچھ حقیقتیں ہیں' وہ قرآنِ مجید میں مزید اضافے کے ساتھ درج ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

"اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَ الْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ۔" (۱)

سب سے پہلے وہ حکمت کا ذکر کرتا ہے۔ لوگوں کو اپنے پروردگار کی جانب بلاؤ۔

"یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاھِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا" (۲)

۱۔ سورۂ نحل ۱۶۔ آیت ۱۲۵ {آپ اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعے دعوت دیں۔}

۲۔ سورۂ احزاب ۳۳۔ آیت ۴۵ {اے پیغمبر ہم نے آپ کو گواہ' بشارت دینے والا اور عذابِ الٰہی سے ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔}

ہم نے تمہیں اس امت پر گواہ بننے کے لئے بھیجا ہے (اب گواہ کے کوئی بھی معنی ہوں' اس پر فی الحال ہماری گفتگو نہیں) ہم نے تمہیں اس امت کے لئے خوش خبری دینے والا بنا کر بھیجا ہے' آپ انہیں بشارت دیجئے' نوید سنایئے' تشویق کیجئے۔ یعنی اس راستے پر چلنے کے جو عالی شان نتائج انہیں حاصل ہوں گے' ان سے انہیں آگاہ کیجئے۔ و نذیرا' ہم نے آپ کو نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

ہم نے بارہا عرض کیا ہے کہ "نـذیـر" کے معنی ڈرانے والا نہیں ہیں' دراصل ڈرانے والا "مُخَوِّف" کا ترجمہ ہے۔ "نذیر" ایک خاص انداز کے ڈرانے والے کے لئے استعمال ہوتا ہے' اس کے معنی ہیں' خطرے کا اعلان کرنے والا۔ مثلاً اگر ایک انسان دروازے سے باہر نکلنا چاہتا ہو اور اس اثنا میں کوئی شخص ناگوار آواز پیدا کرے' تو اسکے اس عمل سے انسان خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ انذار نہیں ہے۔ انذار اس ڈرانے کو کہتے ہیں جس میں خطرے کا اعلان ہو۔ ایک شخص فیصلہ کر کے ایک راہ پر چل پڑتا ہے' ایک اور شخص آتا ہے اور اسے خطرے سے آگاہ کرتا ہے۔ یعنی اس سے کہتا ہے کہ تمہارے اس عمل اور اس راہ پر چلنے کے نتیجے میں فلاں خطرہ ہے۔

(قرآن مجید کہتا ہے) اے پیغمبر! ہم نے آپ کو نذیر بننے کے لئے بھیجا ہے' آپ اس معنی میں ڈرانے والے بنئے' خطرے کا اعلان کرنے والے بنئے۔ لہٰذا آپ اپنی بعثت کے ابتدائی برسوں میں آکر کوہ صفا کے دامن میں کھڑے ہوئے اور بلند آواز سے فرمایا (جیسا کہ اس زمانے میں اس طرح سے آواز لگانے کا رواج تھا) یا صباحا' یاصباحا (اور ان جملوں کے ذریعے) یعنی خطرہ! خطرہ! لوگ کوہ صفا کے دامن میں جمع ہو گئے اور کہنے لگے: کیا ہوا ہے؟ ان لوگوں نے پہلی مرتبہ محمد امین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطرہ خطرہ سنا تھا! کہنے لگے: کیا خطرہ ہے؟ کیا عام الفیل جیسا کوئی واقعہ پیش آ گیا ہے؟ آپ نے سب سے پہلے لوگوں سے تصدیق طلب کی کہ: اے لوگو! اب تک تم نے مجھے اپنے درمیان کیسا پایا ہے؟ سب بولے: صادق اور امین۔ فرمایا: اگر اس وقت میں تم لوگوں کو انذار کروں اور اس خطرے کا اعلان کروں کہ ان پہاڑیوں کے پیچھے (۱) دشمن

۱۔ آپ جانتے ہیں کہ مکہ پہاڑیوں کے درمیان واقع ہے۔

ایک لشکرِ جرار کے ساتھ موجود ہے اور تم پر حملہ کرنا چاہتا ہے تو کیا تم میری بات مانو گے؟ وہ بولے: کیوں نہیں۔ جب آپ نے ان لوگوں سے یہ گواہی لے لی تو فرمایا:

"اِنِّیْ نَذِیْرٌ لَّکُمْ بَیْنَ یَدَیْ عَذَابٍ شَدِیْدٍ." (۱)

میں تمہارے لئے خطرے کا اعلان کرتا ہوں کہ جس راستے پر تم چل رہے ہو اس کا انجام دنیا اور آخرت میں سخت عذابِ الٰہی ہے۔

"یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰکَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا وَّ دَاعِیًا اِلَی اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیْرًا." (۲)

آپ لوگوں کو خدا کے حکم سے خدا کی جانب بلانے کے لئے آئے ہیں۔ لوگوں کو پروردگار کی جانب حرکت دینے کی غرض سے آئے ہیں۔ آپ خدا کی طرف دعوت دینے والے ہیں۔

خدا کی جانب دعوت کا یہ کام کوئی معمولی کام نہیں ہے۔

اب جبکہ خدا کی طرف دعوت دینے کا کام آپ کے سپرد کیا گیا ہے تو لوگوں کو یہ دعوت کس ذریعے سے دی جائے؟

کیا یہ ہو سکتا ہے کہ مثلاً انسان خواب دیکھ لے اور خواب کے ذریعے لوگوں کو خدا کی جانب دعوت دے؟ ہر روز صبح آ کر کہے کہ آج میں نے اس کام کے لئے خواب دیکھا ہے آؤ لوگو! ایسا کرلو؟ نہیں قرآنِ کریم نے اس کا راستہ معین کیا ہے خدا کی جانب دعوت ہے کائنات کی سب سے بڑی حقیقت کی جانب دعوت ہے ایسی چیز کی جانب دعوت ہے جس کی جانب انسانی عقول کو ہدایت اور حرکت دی جاسکتی ہے۔ ایک ایسی چیز کی جانب دعوت ہے جسے عقلوں کو قبول کرنا چاہئے۔ کس طریقے سے؟ دلیل سے برہان سے حکمت سے اور منطقی گفتگو سے۔

۱۔ میں ایک سخت عذاب سے پہلے تمہیں تنبیہ کرنے والا ہوں۔

۲۔ سورۂ احزاب ۳۳۔ آیت ۴۵، ۴۶

دل کو ابلاغ

ایک پہلو اس کام کو دشوار کر دیتا ہے۔ کیا انبیاؑ کی تبلیغ میں اور دعوتِ الٰہی پہنچانے کے عمل میں صرف اتنا کافی ہے کہ یہ پیغام عقل تک پہنچا دیا جائے؟ جس کے بارے میں تو ہم بتا چکے ہیں کہ یہ قطعاً کافی نہیں ہے' اس پیغام کو عقل کے مرحلے تک بھی پہنچنا چاہئے۔ کیا یہ کافی ہے؟ نہیں' یہ تو مسئلے کا اوّلین مرحلہ ہے۔ ایک معلم (teacher) کی ذمے داری فقط یہ ہے کہ وہ اپنی بات کو' اپنے علم کو طالبِ علم کی عقل تک پہنچا دے۔ وہ آ کر تختۂ سیاہ (blackboard) کے پاس کھڑا ہو جاتا ہے' ادھر شاگرد بیٹھا ہوا ہے' وہ اسکے لئے ریاضی کا مسئلہ بیان کرتا ہے۔ جب وہ پہلے پہل مسئلہ بیان کر رہا ہوتا ہے' تو طالبِ علم کی عقل یہ نہیں سمجھ پاتی کہ واقعاً ایسا ہے یا نہیں۔ اسکے لئے دلیل درکار ہوتی ہے۔ جب معلم ریاضی کی دلیل اور برہان قائم کرتا ہے' تب طالبِ علم کی عقل میں اس کا مدعا بیٹھتا ہے۔

لیکن انبیاؑ صرف اپنا مدعا لوگوں کی عقل میں داخل کرنے کے لئے نہیں آئے ہیں۔ فلسفی حضرات جو کام کرتے ہیں' اُن کی زیادہ سے زیادہ کامیابی یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی بات کو لوگوں کی عقل تک پہنچا دیتے ہیں' اس سے زیادہ کچھ نہیں کر پاتے۔ پیغامِ الٰہی کو عقلوں تک پہنچانے کے ساتھ ساتھ اسے دلوں میں بھی اتارنا چاہئے' یعنی اسے انسان کی روح کی گہرائیوں میں پہنچنا چاہئے اور اس کے تمام احساسات' یعنی اس کے پورے وجود پر چھا جانا چاہئے۔ لہٰذا صرف انبیاؑ ہی لوگوں کو راہِ حقیقت پر حرکت دے سکے ہیں' فلسفی ایسا نہیں کر سکے۔ فلسفی بے چارہ مشکلات اٹھاتا ہے' تکلیفیں جھیلتا ہے' اپنے آپ کو فنا کر دیتا ہے' اُس کی ان تمام محنتوں کا آخری نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک فکر لوگوں کی عقل تک پہنچا دیتا ہے' وہ بھی تمام لوگوں کی عقول تک نہیں' بلکہ صرف ان چند لوگوں تک جو اس کے شاگرد ہوتے ہیں اور جنہیں اسکی زبان سے واقف ہونے کے لئے کئی برس تک اس کے پاس آ کر درس پڑھنا پڑتا ہے۔ کیونکہ اُس کا بلاغ' بلاغِ مبین نہیں ہوتا' اس میں بلاغِ مبین کی قابلیت نہیں ہوتی اور اسے سیکڑوں اصطلاحات میں لپیٹ کر اپنی بات بیان کرنا پڑتی ہے۔

ہمارے ایک عظیم استاد کے بقول: فلسفی جواتنی اصطلاحیں استعمال کرتا ہے' اس کی وجہ اسکی کمزوری اور ناتوانی ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے: امکانِ ذاتی' امکانِ استقبالی' امکانِ استعدادی' واجب الوجود بالذات' عقلِ اوّل' عقلِ دوّم۔ اسکی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی بات کو ان اصطلاحات میں لپیٹے بغیر بیان ہی نہیں کرسکتا' اور یہ اس کی کمزوری ہے۔ اسکے برخلاف انبیا' ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کوئی اصطلاح درمیان میں لائے بغیر اُس آخری بات کو جسے سیکڑوں اصطلاحات میں لپیٹ کر بیان کیا گیا ہے بلاغِ مبین کے ذریعے' صرف دو کلموں اور فقط دو جملوں میں بیان کردیتے ہیں۔ اور فلسفی حیران رہ جاتا ہے کہ کس طرح سہلِ ممتنع بات اتنی آسانی سے بیان کردی گئی ہے:

"قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَ لَمْ يُوْلَدْ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ."(۱)

"سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ وَ هُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ."(۲)

انتہائی سادگی کے ساتھ۔

لہٰذا انبیا نہ صرف فلسفیوں سے بہتر انداز سے اپنا پیغام لوگوں کی عقلوں تک پہنچاتے ہیں' بلکہ اس سے بھی بڑا کام یہ کرتے ہیں کہ وہ پیغام کو دل تک پہنچادیتے ہیں۔ یعنی پورے وجود

۱۔ سورۂ اخلاص ۱۱۲ {کہہ دیجیے کہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ اسکی نہ کوئی اولاد ہے اور نہ والد' اور نہ اسکا کوئی ہمسر ہے۔}

۲۔ سورۂ حدید ۵۷۔ آیات ۱ تا ۳ {زمین اور آسمان میں موجود ہر چیز پروردگار کی تسبیح میں مصروف ہے اور وہ پروردگار صاحبِ عزت بھی ہے اور صاحبِ حکمت بھی۔ آسمان اور زمین کا کل اختیار اسی کے پاس ہے اور وہی حیات اور موت کا دینے والا ہے اور ہر شئے پر اختیار رکھنے والا ہے۔ وہی اوّل ہے' وہی آخر ہے' وہی ظاہر ہے' وہی باطن ہے اور وہی ہر شئے کا جاننے والا ہے۔}

پر جس کے بعد پھر کوئی کسر باقی نہیں رہتی۔ جو شخص کسی پیغمبر کا مرید ہو جاتا ہے' یعنی ایک پیغمبر پر ایمان لے آتا ہے' اس کا پورا وجود اس پیغمبر سے وابستہ ہو جاتا ہے۔

بوعلی سینا اور بہمن یار کا واقعہ

یہ مشہور واقعہ شاید آپ نے بارہا سنا ہوگا' لیکن کیونکہ یہ ہمارے اس مدعا پر ایک اچھی دلیل ہے' اس لئے ہم اسے دوبارہ عرض کر رہے ہیں۔ بوعلی سینا کا مشہور واقعہ ہے۔ بوعلی سینا اپنی ذہانت اور فکر کے اعتبار سے (معمول سے زیادہ قوی تھے) کیونکہ وہ ایک غیر معمولی انسان تھے۔ اُن کی آنکھوں کی بینائی دوسروں سے زیادہ تیز تھی' اُن کے کان بہت زیادہ تیز تھے' اس کا ذہن بھی بہت مضبوط تھا۔ رفتہ رفتہ لوگوں نے بوعلی کی حس کے بارے میں' اُن کی آنکھوں اور اُن کے کانوں کے بارے میں افسانے بنانے شروع کر دیئے۔ مثلاً وہ اصفہان میں کاشان کے تانبے کے کاریگروں کے ہتھوڑوں کی آواز سن لیا کرتے تھے۔ البتہ یہ افسانے ہیں' لیکن عام طور پر افسانے انہی باتوں کے بنائے جاتے ہیں جن کے اعتبار سے انسان میں غیر معمولی پن پایا جاتا ہے۔

بوعلی کا شاگرد بہمن یار اُن سے کہا کرتا تھا: آپ کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا ہے کہ اگر آپ نبوت کا دعویٰ کریں' تو لوگ آپ کے اس دعوے کو قبول کر لیں گے' اور خلوصِ نیت کے ساتھ آپ پر ایمان لے آئیں گے۔

وہ {اپنے اس شاگرد سے} کہتے تھے: تم یہ کیسی باتیں کرتے ہو؟ تم ابھی ان باتوں کو نہیں سمجھتے۔ بہمن یار کہتا تھا: نہیں' میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ بوعلی سینا نے چاہا کہ عملاً اس پر ظاہر کریں۔ ایک مرتبہ موسمِ سرما میں' جب یہ دونوں ایک سفر میں ساتھ ساتھ تھے' سخت برفباری ہو کے چکی تھی' طلوعِ فجر کے نزدیک' جب موذن اذان دے رہا تھا' بوعلی جاگ رہے تھے' انہوں نے بہمن یار کو آواز دی: بہمن یار! {اُس نے کہا:} جی۔ {انہوں نے کہا:} اٹھو۔ {بہمن یار بولا:} کیا کام ہے؟ {بوعلی نے کہا:} مجھے شدید پیاس محسوس ہو رہی ہے' یہ پیالا اس مٹکے سے بھر کر لا دو' تاکہ میں پیاس بجھا لوں۔ اس زمانے میں ہیٹر جیسی چیزیں تو ہوتی نہ تھیں' اس سردی میں اُس نے گھنٹے بھر

لحاف اوڑھ کر بمشکل تمام اپنے آپ کو حرارت پہنچائی تھی۔ اب وہ اس گرم بستر سے کیسے باہر آتا۔ لہٰذا بحث کرنے لگا اور دلیلیں دینے لگا کہ استاد! آپ خود طبیب ہیں، دوسروں سے بہتر جانتے ہیں کہ جب معدہ التہاب کی حالت میں ہو، اس وقت اگر انسان ٹھنڈا پانی پی لے تو یکا یک سرد ہو جاتا ہے اور ممکن ہے آپ بیمار ہو جائیں، خدانا خواستہ آپ کو کوئی پریشانی لاحق ہو جائے۔ {بوعلی نے} کہا: میں طبیب ہوں اور تم میرے شاگرد، مجھے پیاس لگی ہے تم میرے لئے پانی لے آؤ۔ وہ پھر دلیلیں دینے لگا، بہانے بنانے لگا کہ جناب یہ ٹھیک نہیں ہے، صحیح ہے کہ آپ میرے استاد ہیں لیکن میں آپ کی بھلائی چاہتا ہوں۔ میرا آپ کی بھلائی چاہنا آپ کے حکم کی اطاعت کرنے سے بہتر ہے۔ (کہتے ہیں کہ ست انسان کو کوئی کام کہو گے تو وہ تمہیں پدرانہ نصیحتیں کرنا شروع کر دے گا) اُس نے بھی نصیحتیں کرنا شروع کر دیں۔ اب جب بوعلی سینا پر اچھی طرح ثابت ہو گیا کہ وہ اٹھنے والا نہیں ہے، تو کہا: مجھے پیاس نہیں لگی، میں تمہیں آزمانا چاہتا تھا۔ تمہیں یاد ہے، تم مجھ سے کہا کرتے تھے کہ آپ نبوت کا دعویٰ کیوں نہیں کرتے، لوگ قبول کرلیں گے؟ میں اگر نبوت کا دعویٰ کروں، تو تم جو میرے شاگرد ہو اور کئی برس تم نے میرے پاس تعلیم حاصل کی ہے، تم ہی میرا حکم ماننے پر تیار نہیں ہو، میں خود تم سے کہہ رہا ہوں کہ اٹھو میرے لئے پانی لے آؤ، تو تم میرے حکم کے برخلاف ہزاروں دلیلیں پیش کر رہے ہو، پیغمبر کی وفات کو چار سو سال گزرنے کے بعد بھی وہ بوڑھا اپنا گرم بستر چھوڑ کر بلند مینار پر جا کر یہ آواز دنیا بھر کو پہنچا رہا ہے کہ: اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ. وہ ہے پیغمبر، میں نہیں، میں بوعلی سینا ہوں۔

جب کوئی پیغام اور وہ بھی الٰہی پیغام دلوں تک پہنچنا چاہے اور دلوں کو اپنے اثر میں لینا اور اُنہیں تسخیر کرنا چاہے، معاشرے کو حرکت میں لانا چاہے، اور وہ بھی صرف اپنے مفادات اور حقوق کے راستے پر حرکت نہیں، بلکہ چاہتا ہو کہ انسان کو تائب کرے، اُسے آنسو بہانے پر مجبور کرے، جب اسکے سامنے آیاتِ قرآنی کی تلاوت کی جائے، تو اسکی آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب رواں ہو جائے: يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا...... وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ (سورۂ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۱۰۷ اور ۱۰۹) اور وہ زمین پر گر کر مسلسل اشک بہائیں، تو یہ کام آسان نہیں

ہے بہت مشکل اور دشوار کام ہے۔

بلاغِ مبین

اس حوالے سے ہم دیکھتے ہیں کہ قرآنِ مجید دوسرے انبیا کی زبانی اور رسولِ اکرم کی زبانِ مبارک سے کچھ باتوں کا ذکر کرتا ہے' یعنی طریقہ کار (method) بیان کرتا ہے کہ دعوت دینے کی کیا شرائط ہیں۔ پہلی شرط وہی ہے جو ہم نے عرض کی کہ قرآنِ مجید نے بہت سی آیات میں ''کلامِ بلاغ'' کا ذکر کیا ہے'' بلاغ'' یعنی پیغام پہنچانا۔

یہ بات بھی عرض کرتے چلیں کہ بعض الفاظ کی قسمت خراب ہوتی ہے اور بعض الفاظ خوش قسمت ہوتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں تبلیغ کا لفظ (البتہ جدت پسندوں کی اصطلاح میں) بدقسمت بن گیا ہے۔ آج جدت پسند (modern) لوگوں کے یہاں ''تبلیغ'' کے معنی ہیں ایک ایسی چیز جس کی حقیقت نہ ہو' جسے ہم جھوٹ بول کر لوگوں کو باور کرانا چاہتے ہوں۔ لیکن یہ موجودہ دور کی ایک غلط اصطلاح ہے۔ ہم نے ہمیشہ یہ عرض کیا ہے کہ اگر ہمارے پاس قرآن وسنت میں ایک صحیح اصطلاح موجود ہو اور وہ اصطلاح آج بدل گئی ہو اور اُس نے ایک دوسرے معنی اختیار کر لئے ہوں' تو ہمیں اپنی اُس اصطلاح کو چھوڑ نہیں دینا چاہئے۔ کیونکہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اب ''تبلیغ'' کا لفظ استعمال نہیں کرنا چاہئے' کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ آج کے معاشرے میں جب ہم کہتے ہیں ''تبلیغ'' تو اس کے معنی ہوتے ہیں سفید جھوٹ۔ مثلاً بناسپتی گھی کے بارے میں کہتے ہیں کہ آپ اس کی معمولی مقدار کھا کر ہرن کی طرح دوڑ سکتے ہیں' آپ ہاتھی سے بھی زیادہ طاقتور ہو جائیں گے۔

{لہٰذا} جہاں بھی ''تبلیغ'' کہا جائے گا' اسکے معنی جھوٹ لئے جائیں گے۔ اس لئے بہتر ہے کہ ہم اپنی دینی اصطلاحات میں لفظ تبلیغ استعمال نہ کریں! ہم نے پوچھا کیوں؟! تبلیغ ایک ایسی اصطلاح ہے جو قرآن میں آئی ہے' بلاغ کا لفظ قرآن میں آیا ہے۔ جب ایک اصطلاح ایک صحیح اور درست معنی کی حامل ہو' تو ہمیں صرف اس لئے اُس کے استعمال کو ترک نہیں کر دینا چاہئے کہ

آج معاشرے میں اس کا استعمال بدل گیا ہے اور اس کے کچھ اور معنی لئے جاتے ہیں۔ ہمیں چاہئے کہ ہم اپنے معنی کو استعمال کریں اور بتانا چاہئے کہ قرآنِ مجید میں اور بنیادی طور پر لغت میں تبلیغ کے اصل معنی کیا ہیں۔ تبلیغ یعنی پیغام رسانی۔

پس قرآنِ مجید نے بلاغ کا لفظ بھی استعمال کیا ہے اور بلاغ مبین '{یعنی} واضح اور واضح کرنے والا بھی کہا ہے۔ وہ داعی اور وہ مبلغ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا ہے' جس کا بلاغ مبین ہو' جس کا بیان حقائق کی بلندیوں پر ہونے کے باوجود سادہ ہو' واضح ہو' عام فہم ہو' لوگ اُسکی بات سمجھتے اور درک کرتے ہوں۔ جو شخص پیچیدہ اور دشوار باتیں کرتا ہو اور لوگ بھی آخر میں واہ واہ کرتے ہوں (اُسکی بلاغت 'بلاغ مبین نہیں ہے)۔ کہتے ہیں (ایک شخص ایک مقرر کی تقریر سننے کے بعد) زور شور کے ساتھ واہ واہ کر رہا تھا' گویا کہہ رہا ہو کہ آپ کو پتا نہیں کیسی زبردست تقریر کی تھی! لوگوں نے اُس سے پوچھا' ٹھیک ہے زبردست تقریر تھی' لیکن ذرا بتاؤ تو مقرر نے کہا کیا تھا؟ اس پر وہ کہتا ہے کہ: میری سمجھ میں نہیں آئی۔ پس پھر اس میں اچھی بات کیا تھی؟!

تقریر میں بنیادی بات یہ ہے کہ جب اُسے سننے والا اٹھے' تو کچھ سمجھ کے اٹھے۔ داعی اور مبلغ کی شرائط میں سے سب سے بڑی' یا ایک شرط یہ ہے کہ اُس کی بات سننے والا جب اٹھے' تو بھرا ہوا دامن لے کر اٹھے' حقیقتاً اُس نے کوئی بات سمجھی ہو' اور یہ مبلغ اور داعی کی ایک خوبی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر کوئی شخص ایسی باتیں کرتا ہو جو سمجھ میں نہ آتی ہوں' تو اس کی باتیں (بہت عمدہ ہیں)۔ نہیں' ایسا نہیں ہے' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی جب کسی جگہ بات کرتے تھے' تو ایسی عالی بات کرتے تھے کہ چودہ سو سال بعد بھی لوگ اُس کے ایسے معانی حاصل کرتے ہیں جو پہلے والوں نے اس سے نہیں سمجھے تھے' لیکن اُس دور میں بھی مجلسِ پیغمبرؐ میں بیٹھنے والے تمام لوگ اس بات کو اپنی حد تک سمجھتے تھے۔ حضرت علی علیہ السلام کے خطبات اپنی تمام تر عظمت کے باوجود ایسے ہوا کرتے تھے کہ جو لوگ اس مجلس میں موجود ہوتے تھے' وہ اپنی صلاحیت کے مطابق ان خطبوں سے مستفید ہوتے تھے اور انہیں سمجھتے تھے۔

نصیحت یا خلوصِ کلام

قرآنِ مجید میں ابلاغ و دعوت کے بارے میں داعیانِ الٰہی کی زبان سے "نُصح" کا لفظ کثرت سے ذکر ہوا ہے۔ نُصح یعنی خیر خواہی یعنی خلوص۔ کیونکہ عربی زبان میں نُصح کی ضد "غِش" ہے۔ جب کسی چیز میں کوئی دوسری چیز شامل کردی جائے تو اصطلاحاً کہتے ہیں کہ اس میں غِش داخل کردی گئی ہے۔ نُصح کے مقابل غِش ہے اس بنیاد پر مراد یہ ہوئی کہ گفتگو میں خلوص ہونا چاہئے۔ یعنی بات انتہائی خیر خواہی اور جذبۂ ہمدردی کی بنیاد پر کہی گئی ہو۔ وہ شخص خدا کی طرف بلانے والا اور پیغامِ الٰہی کا مبلغ ہوسکتا ہے جس کے کلام میں نُصح پائی جائے یعنی لوگوں کی خیر خواہی اور ان کی مصلحت کے سوا اس کا کوئی اور محرک نہ ہو اس کی باتیں دل سے نکلتی ہوں کہ:

"اِنَّ الْکَلَامَ اِذَا خَرَجَ مِنَ الْقَلْبِ دَخَلَ فِی الْقَلْبِ وَ اِذَا خَرَجَ مِنَ اللِّسَانِ لَمْ یَتَجَاوَزِ الْآذَانَ۔"

"دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے" اور جو بات صرف زبان سے نکلے اور (اسے کہنے والے کا) دل اس سے بے خبر ہو وہ لوگوں کے کانوں سے آگے نہیں بڑھتی۔ (۱) پیغمبرؑ کرییٰ کہا کرتے تھے کہ: وَ اَنْصَحُ لَکُمْ، (۲) اَنَا لَکُمْ نَاصِحٌ (۳) اِنِّیْ لَکُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ (۴) اُن کی تمام باتیں یہی ہوا کرتی تھیں۔ جب حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام خدا سے اپنے کام کی سختی اور دشواری کا ذکر کرتے ہیں تو وہ سختی صرف یہ نہیں ہے کہ کیونکہ مجھے فرعون جیسے طاقتور اور جبار کے سامنے بات کرنا ہے اس لئے میرا کام دشوار ہے۔ نہیں، کچھ دوسری سختیاں بھی

۱۔ یہ باتیں پیغامِ الٰہی کی تبلیغ کے بارے میں ہیں دوسرے پیغاموں کی تبلیغ کا ان باتوں سے تعلق نہیں۔

۲۔ سورۂ اعراف ۷۔ آیت ۶۲

۳۔ سورۂ اعراف ۷۔ آیت ۶۸

۴۔ سورۂ اعراف ۷۔ آیت ۲۱

ہیں {فرماتے ہیں}: بارالٰہا! میری مدد فرما تاکہ میں ایک ایسا موسیٰ بن جاؤں جس کے اندر کوئی دوسرا موسیٰ موجود نہ ہو اس میں کوئی انانیت موجود نہ ہو میں انتہائی خلوص کے ساتھ تیرا پیغام لوگوں تک پہنچا سکوں۔

تکلف سے پرہیز

تبلیغ دین کی ایک اور شرط "تکلف سے پرہیز" ہے۔ قرآنِ مجید میں سورۂ صاد میں ایک آیت ہے:

"قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّ مَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ." (۱)

"میں کوئی کاروبار نہیں کر رہا' میں کوئی اجر نہیں مانگتا' اور میں تکلف کرنے والا نہیں ہوں۔"

"تکلف" کے بارے میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں' جو سب کے سب شاید ایک ہی مفہوم کی جانب پلٹتے ہوں۔ تکلف یعنی اپنے آپ کو اذیت دینا' اپنے آپ کو تکلیف میں ڈالنا۔ کیسے؟ کبھی خدانخواستہ انسان ایک چیز پر اعتقاد نہیں رکھتا' اور جس چیز پر وہ عقیدہ نہیں رکھتا دوسروں کے دل میں اس پر عقیدہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ کوئی تکلیف اس سے بڑھ کر نہیں کہ ایک انسان خود جس چیز پر عقیدہ نہ رکھتا ہو دوسروں کے دل میں اس پر اعتقاد پیدا کرنا چاہے۔ شاعر کہتا ہے:

ذاتِ نایافتہ از ہستی بخش کی تواند کہ شود ہستی بخش
کہنہ ابری کہ بود ز آب تہی کی تواند کہ کند آبدہی

پرانا بادل' جس میں خود پانی نہ ہو' وہ سرزمینوں کو سیراب کرنا چاہتا ہے! جب کوئی انسان ایسا کام کرنا چاہتا ہے' تو یہ اس کے لئے بہت دشوار ہوتا ہے۔

"تکلف" کے دوسرے معنی' جو ابن مسعود نے بیان کئے ہیں اور دوسرے مفسرین نے بھی اسی طرح کہا ہے' وہ "بغیر علم کے کلام کرنا" ہیں۔ یعنی پیغمبرؐ اور امام کے سوا دنیا میں آپ کسی کو بھی

۱۔ سورۂ ص ۳۸۔ آیت ۸۶

لے آئیں اور اُس سے تمام مسائل کے بارے میں سوال کرنا چاہیں" آپ دیکھیں گے یقیناً وہ نہیں جانتا ہو گا۔

کہتے ہیں: "سب چیزیں سب لوگ جانتے ہیں" ۔ یہ دعویٰ کون کر سکتا ہے (دائرہ کچھ محدود کر دیتے ہیں) کہ دینی مسائل کے بارے میں جو چاہو مجھ سے پوچھ لو میں تمہارے تمام سوالات کے جواب دوں گا؟ ہاں، پیغمبرؐ یہ دعویٰ کر سکتے ہیں، علیؑ ایسا کہہ سکتے ہیں: سَلُونی قَبلَ اَنْ تَفْقِدونی. (۱) علیؑ کے سوا کسی بھی اور شخص سے یہ توقع رکھنا بے جا ہے۔

پس مجھے اپنی حد پہچاننا چاہیے۔ ممکن ہے میں دینی مسائل میں سے فلاں فلاں مسائل کو جانتا ہوں۔ ٹھیک ہے جو کچھ میں جانتا ہوں، وہی مجھے لوگوں تک پہنچانا چاہیے۔ جو چیز میں نہیں جانتا اور لوگ وہ مجھ سے پوچھتے ہیں، پھر بھی میں زبردستی ان کے جواب دینا چاہوں!!۔ جو چیز آپ نہیں جانتے، اسے دوسروں کو کس طرح سمجھا سکتے ہیں؟! ابن مسعود نے کہا ہے:

"قُلْ مَا تَعْلَمُ، وَ لَاتَقُلْ مَا لَاتَعْلَمْ."

"جو جانتے ہو، وہ کہو اور جو نہیں جانتے، وہ نہ کہو۔"

جس چیز سے آپ واقف نہیں، اگر وہ آپ سے پوچھی جائے، تو آپ کو پوری صراحت کے ساتھ مردانگی سے کہنا چاہیے کہ میں نہیں جانتا۔ اس کے بعد انہوں نے اس آیت کی تلاوت کی کہ: "قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّ مَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ." {میں کوئی کاروبار نہیں کر رہا، میں کوئی اجر نہیں مانگتا، اور میں تکلف کرنے والا نہیں ہوں۔}

ابن جوزی ایک مشہور و معروف واعظ ہیں، وہ ایک منبر پر تشریف فرما تھے، جس کے تین زینے تھے۔ وہ لوگوں سے خطاب کر رہے تھے۔ نیچے بیٹھی ہوئی ایک عورت نے اٹھ کر ان سے ایک مسئلہ دریافت کیا۔ اُنہوں نے کہا: یہ میں نہیں جانتا۔ وہ عورت بڑی منہ پھٹ تھی، کہنے لگی: اگر آپ نہیں جانتے تو دوسروں سے تین زینے اوپر کیوں بیٹھے ہیں؟ اُنہوں نے کہا: میرا یہ تین زینے اوپر

۱۔ مجھے کھونے سے پہلے مجھ سے پوچھ لو۔ (سفینۃ البحار ج ا ص ۵۸۶)

بیٹھنا میرے جاننے اور تمہارے نہ جاننے کی مقدار کے برابر ہے' میں اپنی معلومات کی مقدار برابر تم سے اوپر بیٹھا ہوں۔ میں اگر اپنے مجہولات کی مقدار کے اعتبار سے اوپر جانا چاہوں تو ایسا منبر بنانا پڑے جو فلک الافلاک تک جا پہنچے گا۔ اگر میں ان باتوں کے برابر اوپر جانا چاہوں جو میں نہیں جانتا' تو ایک ایسے منبر کی ضرورت ہوگی جو آسمان تک بلند ہو۔ انسان جو چیز نہیں جانتا' اس کے متعلق اسے کہہ دینا چاہیے کہ میں نہیں جانتا۔

ہم جانتے ہیں کہ شیخ انصاریؒ شوشتر کے رہنے والے تھے۔ آپ علم اور تقویٰ کے لحاظ سے ایک نابغہ روزگار شخصیت تھے۔ آج بھی علما اور فقہا اس عظیم شخص کے کلام کی باریکیوں کو سمجھنے پر فخر کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب ان سے کوئی بات پوچھی جاتی اور انہیں وہ معلوم نہ ہوتی تو عمداً بلند آواز سے کہا کرتے تھے: نہیں جانتا' نہیں جانتا' نہیں جانتا۔ آپ ایسا اس لئے کہتے تھے تاکہ ان کے شاگرد یہ بات سیکھ لیں کہ اگر انہیں کوئی بات معلوم نہ ہو تو شرمائیں نہیں' کہہ دیں کہ نہیں جانتا۔

ایک سال ہم اصفہان کے شہر نجف آباد گئے ہوئے تھے' رمضان کا مہینہ تھا' کیونکہ چھٹیاں تھیں اور ہمارے دوست وہاں تھے' اس لئے وہاں گئے ہوئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں ایک سڑک عبور کر رہا تھا کہ بیچ سڑک پر ایک دیہاتی نے مجھے روک لیا اور بولا: جناب عالی' ایک مسئلہ معلوم کرنا ہے' آپ میرے اس مسئلے کا جواب دیجئے۔ میں نے کہا: فرمایئے۔ کہنے لگا: غسلِ جنابت کا تعلق بدن سے ہے یا روح سے؟ میں نے کہا: خدا کی قسم! میں اس بات کا مطلب نہیں سمجھا۔ غسلِ جنابت ہر غسل کی طرح ایک اعتبار سے انسان کی روح سے تعلق رکھتا ہے' کیونکہ اس میں نیت کی ضرورت ہوتی ہے' اور دوسرے اعتبار سے انسان کے بدن سے اس کا تعلق ہوتا ہے' کیونکہ انسان کو اپنا بدن دھونا ہوتا ہے۔ کیا تمہاری مراد یہ ہے؟ کہنے لگا: نہیں' مجھے صحیح صحیح جواب دیجئے۔ بتایئے کیا غسلِ جنابت کا تعلق بدن سے ہے یا روح سے؟ میں نے کہا: مجھے نہیں معلوم۔ کہنے لگا: پس پھر سر پر یہ عمامہ کیوں باندھ رکھا ہے؟

وَ مَا اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ. میں متکلف نہیں ہوں۔ پیغمبر یہ بات کہتے ہیں۔

☆☆☆

ساتویں نشست

اندازِ تبلیغ

اندازِ تبلیغ

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ رب العالمین باری الخلائق اجمعین. والصلوٰۃ والسلام علیٰ عبداللّٰہ ورسولہ و حبیبہ و صفیہ و حافظ سرّہ ومبلّغ رسالاتہ سیّدناو نبیّنا ومولانا ابی القاسم محمدو آلہ الطیّبین الطاہرین المعصومین.

اعوذباللّٰہ من الشیطان الرجیم

"اِلَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰہِ وَ یَخْشَوْنَہٗ وَ لَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰہَ وَ کَفٰی بِاللّٰہِ حَسِیْبًا." (۱)

سیرت النبیؐ میں ہماری گفتگو دعوت اور تبلیغِ اسلام کے بارے میں تھی۔ سب سے پہلے ہم

۱۔ سورۂ احزاب ۳۳۔ آیت ۳۹ {وہ لوگ اللہ کے پیغام کو پہنچاتے ہیں اور دل میں اس کا خوف رکھتے ہیں' اسکے سوا کسی سے نہیں ڈرتے اور اللہ حساب کرنے کے لئے کافی ہے۔}

نے اس فریضے اور ذمے داری کی اہمیت اور سنگینی کے بارے میں گفتگو کی؛ اسکے بعد پیغمبر اکرمؐ یا دوسرے انبیاؑ کی سیرت کی بعض خصوصیات کے بارے میں عرائض پیش کیے۔ شرح صدر کا مسئلہ جو قرآنِ کریم نے پیش کیا ہے، وہ ان ضروریات کا ایک حصہ ہے اور اس نکتے کی اہمیت کو عیاں کرتا ہے۔ پھر بلاغ مبین کا مسئلہ، نصح اور خیر خواہی کا مسئلہ اور عدمِ تکلف کا مسئلہ {زیرِ گفتگو رہا}۔ اب خدا کی مدد اور اس کی نصرت سے دوسرے مسائل عرض کریں گے۔

جس آیت کی ہم نے پہلے تلاوت کی تھی، اُس میں قرآنِ کریم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں فرماتا ہے:

"یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاھِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا وَّ دَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیْرًا." (۱)

"اے نبی! ہم نے آپ کو بشیر اور نوید دینے والا، نذیر اور خطرے کی نشاندہی کرنے والا (اور خدا کے حکم سے اس کی طرف بلانے والا اور نورانی چراغ بنا کر) بھیجا ہے۔"

ہم تبشیر اور انذار کے متعلق ایک مختصر وضاحت کے بعد پیغمبر اکرمؐ کی بعض نصیحتوں کے حوالے سے عرائض پیش کریں گے۔

تبشیر اور انذار

"تبشیر" یعنی بشارت دینا، یہ تشویق کے مفہوم سے تعلق رکھتا ہے۔ مثلاً اگر آپ اپنے بچے کو کسی کام پر آمادہ کرنا چاہتے ہیں، تو اس مقصد کے لئے ان دو میں سے کوئی ایک یا ایک ہی وقت میں یہ دونوں راستے اختیار کرتے ہیں۔ {ان میں سے} ایک تشویق اور نوید کا راستہ ہے۔ مثلاً جب آپ اپنے بچے کو اسکول بھیجنا چاہتے ہیں، تو اُس کے سامنے اسکول جانے کے فوائد، آثار اور نتائج

۱۔ سورۂ احزاب ۳۳۔ آیت ۴۵ اور ۴۶

کا ذکر کرتے ہیں' تا کہ اس کام کے لئے اس میں رغبت پیدا ہو اور اس کی طبیعت اور اس کی روح اس کام کو پسند کرنے لگے اور وہ اس کی طرف مائل ہو اور اس کی طرف کھنچنے لگے۔

{اس سلسلے میں} دوسرا راستہ یہ ہے کہ اسکے سامنے اسکول نہ جانے کا خطرناک انجام بیان کریں' اسے بتائیں کہ اگر انسان اسکول نہ جائے اور جاہل رہ جائے' تو ایسا' ایسا اور ایسا ہوگا اور بچہ اس انجام سے بچنے کے لئے پڑھائی کی جانب راغب ہو جاتا ہے۔

یعنی آپ کے دو کاموں میں سے ایک کام تشویق اور تبشیر بچے کو آگے کی جانب کھینچتا ہے۔ دعوت' تشویق' تحریک اسے آگے بڑھنے پر راغب کرتا ہے' اور آپ کا دوسرا کام' یعنی انذار اور ڈرانا (البتہ انہی معنی میں جو ہم نے عرض کئے: خطرے کا اعلان کرنا) اسے پیچھے سے آگے کی طرف دھکیلتا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ تبشیر قائد ہے اور انذار سائق۔ "قائد" یعنی آگے سے کھینچنے والا۔ ایسا شخص جو مثلاً کسی گھوڑے یا اونٹ کی لگام تھام کر اسکے آگے چلتا ہے اور جانور اس کے پیچھے ہوتا ہے'۔۔ قائد کہتے ہیں۔ اور "سائق" اسے کہتے ہیں' جو جانور کو پیچھے سے ہانکتا ہے۔ تبشیر قائد کے حکم میں ہے' یعنی آگے سے کھینچتی ہے اور انذار سائق کے حکم میں ہے' یعنی پیچھے سے ہانکتی ہے۔ اور یہ دونوں ایک ہی کام انجام دیتے ہیں۔ اب اگر یہ دونوں ایک ساتھ ہوں' قائد بھی ہو اور سائق بھی ہو' ایک آگے سے جانور کو کھینچے اور دوسرا پیچھے سے اُسے ہانکے' تو دونوں عامل ایک ہی وقت میں کارفرما ہوں گے۔ اور یہ دونوں ہی انسان کے لئے ضروری ہیں۔ یعنی تبشیر اور انذار میں سے کوئی بھی اکیلا کافی نہیں ہے۔ تبشیر "شرط لازم" ہے لیکن "شرط کافی" نہیں ہے' انذار بھی "شرط لازم" ہے لیکن "شرط کافی" نہیں ہے۔

یہ جو قرآن کریم کو سبع المثانی کہا جاتا ہے' شاید اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ قرآن میں ہمیشہ تبشیر اور انذار ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہیں۔ یعنی ایک طرف سے بشارت اور نوید ہے' اور دوسری طرف سے انذار اور خطرے کا اعلان۔

دعوت کے دوران' یہ دونوں ہی رکن ہمراہ ہونے چاہئیں۔ داعی اور مبلغ کا صرف تبشیر یا صرف انذار سے کام لینا غلط ہوگا۔ بلکہ تبشیر کا پلڑہ کچھ بھاری ہونا چاہئے۔ شاید اسی وجہ سے قرآن

کریم تبشیر کو مقدم رکھتا ہے: بَشِیْرٌ وَّ نَذِیْرٌ، مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا۔

تنفیر

تبشیر اور انذار کے علاوہ، ہمارے پاس ایک اور عمل بھی ہے، جس کا نام "تنفیر" ہے۔ تنفیر یعنی بھگانے کا کام کرنا۔ کبھی انسان کرنا تو انذار چاہتا ہے، لیکن انذار اور تنفیر کے درمیان غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہے۔ انذار اس وقت انذار ہوتا ہے جب سائق کا کام کرے، یعنی واقعاً انسان کو پیچھے سے آگے کی جانب ہانکے۔ لیکن تنفیر، یعنی ایسا کام کرنا کہ انسان بھاگ کھڑا ہو۔ ایک بار پھر وہی جانور کی مثال دیتے ہیں: یہ ایسے ہی ہے جیسے انسان کسی جانور (اونٹ یا گھوڑے) کو کھینچتا ہے، پھر اسے مزید اپنے پیچھے دوڑانے کی خاطر ایک طرح سے شور مچاتا ہے، یہاں تک کہ ایک مرتبہ وہ جانور زور سے اپنا سر پیچھے کی طرف کھینچ کر، لگام تڑا کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ اسے "تنفیر" کہتے ہیں۔

کبھی کبھی بعض دعوتیں ایسی ہوتی ہیں جو انسان کی روح کے لئے نہ صرف سائق اور قائد نہیں ہوتیں بلکہ تنفیر ہو جاتی ہیں۔ یعنی نفرت پیدا کرنے والی اور فرار کروانے والی ہوتی ہیں۔ یہ ایک نفسیاتی اصول ہے۔ انسان کی روح اور نفسیات اسی قسم کی ہے۔ وہی بچے اور اسکول کی مثال عرض کرتے ہیں: بسا اوقات ماں باپ یا بچوں کے بعض اساتذہ تبشیر اور انذار کی بجائے تنفیر کرتے ہیں، یعنی کوئی ایسا کام کر ڈالتے ہیں کہ بچے کی روح میں اسکول کے لئے نفرت اور گریز کی حالت پیدا ہو جاتی ہے، اور ایسے بچے کی روح کا ردِ عمل اسکول سے گریز ہوتا ہے۔

تاریخ لکھتی ہے کہ (۱) جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یمن (۲) کے لوگوں کو

۱۔ بظاہر ایسا متعدد مرتبہ پیش آیا ہے، ہم اس موقعے کا ذکر کر رہے ہیں جو ہمیں یاد ہے۔

۲۔ یمن ان علاقوں میں سے ایک ہے جہاں کے لوگ بغیر کسی لشکر کشی کے مسلمان ہوئے تھے۔ یمن کے لوگوں کے مسلمان ہونے کا سبب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس خط کا واقعہ ہے جو آنحضرتؐ نے ایران کے بادشاہ خسرو پرویز کو لکھا تھا اور اسے اسلام قبول کر لینے کی دعوت دی تھی۔ آپ نے دنیا کے تمام (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

اسلام کی دعوت دینے اور اسکی تبلیغ کے لئے وہاں مُعاذ بن جبل کو بھیجا تو (سیرتِ ابن ہشام کے مطابق) انہیں یہ تاکید کی کہ:

"یَا مُعاذُ بَشِّرْ وَ لَا تُنَفِّرْ، یَسِّرْ وَ لَا تُعَسِّرْ."

تم اسلام کی تبلیغ کے لئے جارہے ہو۔ تمہارے کام کی بنیاد تبشیر، ترغیب اور خوشخبری پر ہونی

(بقیہ پچھلے صفحے کا حاشیہ) بڑے حکمرانوں کو خطوط لکھے تھے اور انہیں اپنی رسالت سے آگاہ کیا تھا' انہی میں سے ایک ایران کا بادشاہ خسرو پرویز تھا۔ اگرچہ ان میں سے بعض حکمرانوں نے ان خطوط کا کوئی جواب نہیں دیا لیکن بہت سے حکمرانوں نے نہایت احترام اور انکساری کے ساتھ جواب دیئے۔ پیغمبرؐ کے سفیر کے ساتھ احترام سے پیش آئے' اس کے ساتھ حضورؐ کے لئے تحائف بھیجے اور مختصر یہ کہ انتہائی مودبانہ جواب دیئے۔ واحد شخص جس نے بے ادبی کا مظاہرہ کیا وہ خسرو پرویز تھا جس نے آنحضرتؐ کے خط کو پھاڑ دیا۔ کیونکہ یمن کا بادشاہ ایران کا مقرر کردہ تھا اور یمن ایران کے زیر سرپرستی تھا' اس لئے اس نے یمن کے بادشاہ "بازان" کو خط لکھا اور اُس سے پوچھا کہ جزیرۃ العرب میں یہ کون شخص پیدا ہوا ہے جس نے مجھے خط لکھنے اور دعوت دینے کی اور اپنا نام میرے نام سے پہلے لکھنے کی جراَت کی ہے؟!☆ فوراً کسی کو اس شخص کے بارے میں تحقیق کے لئے بھیجو جو اسے دست بستہ یمن لے آئے' پھر اسے میرے پاس بھیج دو تاکہ میں اسے سزا دوں' اُس نے اور بھی اسی قسم کی بیہودہ باتیں تحریر کیں۔ یمن کے بادشاہ نے ایران کے نمائندے کو اپنے ایک نمائندے کے ہمراہ رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں مدینہ بھیج دیا اور بولا: خسرو نے اس طرح کا خط لکھا ہے' آپ اس کا کیا جواب دیتے ہیں؟ پیغمبر اکرمؐ نے انہیں کوئی جواب نہ دیا۔ جب وہ جواب لینے کے لئے آئے تو فرمایا: ٹھیک ہے' ابھی میرے جواب دینے تک یہیں ٹھہرو۔ وہ چند دن بعد دوبارہ حاضر ہوئے۔ فرمایا: پھر کبھی آنا۔ شاید آپ انہیں تقریباً چالیس دن تک یوں ہی ٹالتے رہے۔ ایک دن وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: اب ہم اس سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتے' ہم نے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

☆ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معمول کے مطابق لکھا تھا کہ یہ خط کس کی جانب سے کس کے نام ہے۔ جبکہ اسے توقع تھی کہ یہ لکھا جاتا کہ کس کے نام کس کی جانب سے۔ یعنی آنحضرتؐ اس بات کا اظہار کریں کہ میں تم سے کمتر ہوں' حالانکہ کس کی جانب سے کس کے نام ہونا' بزرگی کی علامت نہیں ہے' کیونکہ یہ ایک فطری قاعدہ ہے لیکن (وہ یہ سمجھتا تھا کہ) اگر یہ لکھیں کہ "کس کے نام کس کی جانب سے" تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ تم ایک بہت بڑے بت ہو۔

چاہئے' ایسا کام کرنا کہ لوگ اسلام کی خوبیوں کو محسوس کریں اور شوق و رغبت کے ساتھ اسلام کی طرف رخ کریں۔ آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ: وَلَا تُنْذِرْ ۔ انذار نہ کرنا' کیونکہ انذار اُس دستور کا حصہ ہے جو قرآن کریم نے فراہم کیا ہے۔ جس بات کی طرف پیغمبر اکرمؐ نے اشارہ فرمایا' وہ یہ تھی

(بقیہ پچھلے صفحے کا حاشیہ) جانے کا فیصلہ کرلیا ہے' آخرکار آپ کا جو بھی جواب ہے وہ دے دیجئے۔ ہمارے بادشاہ خسرو پرویز کو کیا جواب دے رہے ہیں؟ فرمایا: اس کا جواب یہ ہے کہ'' گزشتہ رات ہمارے خدا نے تمہارے بادشاہ خسرو پرویز کا پیٹ اس کے بیٹے'' شیرویہ'' کے ہاتھوں چاک کر دیا ہے اور اب موضوع ہی ختم ہو چکا ہے۔'' ان لوگوں نے واپس جا کر یہ خبر'' بازان'' کو سنائی (ابھی اس واقعے کی اطلاع یمن میں نہیں پہنچی تھی کیونکہ مدائن سے وہاں تک فاصلہ بہت زیادہ تھا)'' بازان'' نے کہا: اگر یہ سچ ہوا' تو یہ اس شخص کی نبوت کی علامت ہے۔ ہم انتظار کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ایران سے کیا خبر آتی ہے۔ چند دن بعد'' شیرویہ'' کا قاصد آیا اور اُس کا یہ پیغام لایا کہ خسرو پرویز مارا گیا ہے اور اب میں اس ملک کا بادشاہ ہوں۔ جس شخص نے عربستان میں نبوت اور رسالت کا دعویٰ کیا ہے' تم اس کے مزاحم نہ ہونا۔ یہیں سے یمن میں اسلام کے لئے زمین ہموار ہوئی۔ اسکے علاوہ یمن میں بڑی تعداد میں ایرانی مقیم تھے۔ ہم نے کتاب'' خدمات متقابل اسلام و ایران'' میں اس موضوع کا ذکر کیا ہے کہ بنیادی طور پر ایرانی پہلی بار یمن ہی میں مشرف بہ اسلام ہوئے تھے اور تبلیغ کے حوالے سے ایرانیوں میں اسلام یمن ہی سے آیا ہے اور جو خلوص یمن میں مقیم ایرانیوں نے دکھایا وہ کسی اور نے نہیں دکھایا۔ اور کیونکہ یمن ایران کے زیر سرپرستی تھا اس لئے ایرانیوں کی بڑی تعداد یمن جا کر وہاں مقیم ہو گئی تھی' انہیں ابناء' احرار اور آزادگان کہا جاتا تھا اور انہوں نے دوسروں سے پہلے اسلام قبول کیا تھا۔ یمن کی نصف آبادی رسول اللہؐ کے زمانے ہی میں مسلمان ہو چکی تھی' اور دوسری نصف آبادی کے لئے جو ابھی مسلمان نہیں ہوئی تھی' پیغمبر اکرمؐ نے ایک مرتبہ معاذ بن جبل کو اور ایک بار حضرت علی علیہ السلام کو تبلیغ اور دعوت کے لئے یمن بھیجا کہ یہ دوسری مرتبہ حجۃ الوداع کے موقع پر تھا' یعنی وصالِ پیغمبرؐ سے دو ماہ قبل' جب حضرت علی علیہ السلام یمن سے واپس لوٹے' تو آپ نے مکہ میں رسول اللہؐ سے ملاقات کی اور جب حضورؐ نے آپؑ سے سوال کیا کہ اے علیؑ! آپ نے کس طرح احرام باندھا؟ یعنی آپ نے کس قسم کے حج کی نیت کی ہے؟ حج تمتع کی نیت کی ہے یا کسی اور کی؟ تو حضرت علیؑ نے فرمایا: میں نے جب میقات میں نیت کی تھی' تو یہی نیت کی تھی کہ جو رسول اللہ کی نیت ہو۔ جو نیت آپؐ نے کی ہے میں نے بھی وہی نیت کی ہے۔ اس پر آنحضرتؐ نے فرمایا تھا: بہت خوب' ہم نے اس طرح سے نیت کی ہے' آپ نے بھی اسی طرح نیت کی ہے اور آپ کی نیت درست ہے۔

کہ بَشِّرُ وَ لَا تُنَفِّرُ. ایسا کوئی کام نہ کرنا جس سے لوگوں کو اسلام سے دور اور متنفر کر دو۔ بات کو اس طرح سے بیان نہ کرنا کہ لوگوں کا باطنی ردِ عمل اسلام سے فرار کی صورت میں سامنے آئے۔

یہ انتہائی اہم نکتہ ہے اور اس کی وضاحت کی ضرورت ہے۔ اس سے پہلے ایک اور نکتہ خود رسولِ اکرمؐ {کی ایک حدیث} اور اسکی توضیح و تشریح اور تائید میں ائمہ اہلِ بیت علیہم السلام کی روایات سے عرض کرتے ہیں۔

روح کی لطافت

انسان کی روح غیر معمولی طور پر لطیف ہے' اور بہت جلد ردِ عمل کا اظہار کرتی ہے۔ اگر انسان کسی عمل کے ذریعے اپنی روح پر دباؤ ڈالے (دوسروں کی روح پر دباؤ کا تو کیا ذکر) تو انسان کی روح گریز اور فرار کی صورت میں اپنے ردِ عمل کا اظہار کرتی ہے۔ مثلاً عبادت کے سلسلے میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو تاکیدیں کی ہیں ان میں ہے کہ عبادت کو اتنی مقدار میں انجام دو کہ تمہاری روح میں عبادت کے لئے تازگی برقرار رہے' یعنی عبادت کو رغبت اور شوق کے ساتھ انجام دے سکو۔ جب کچھ دیر عبادت کرنے' نماز پڑھنے' مستحبات بجا لانے' نوافل ادا کر لینے' قرآنِ مجید کی تلاوت کر لینے اور بیداری کو برداشت کر لینے کے بعد تمہیں یہ محسوس ہونے لگے کہ اب عبادت سخت اور ناگوار گزر رہی ہے' یعنی تم اسے زبردستی برداشت کر رہے ہو' تو فرمایا: اب یہ کافی ہے' عبادت کو خود پر مسلط نہ کرو۔ جس قدر تم مسلط کرو گے' تمہاری روح رفتہ رفتہ عبادت سے گریزاں ہو گی' گویا تم عبادت کو اسے ایک {کڑوی} دوا کی طرح دے رہے ہو گے' اُس وقت عبادت کے بارے میں تمہارے دل میں ایک برا خیال پیدا ہو گا۔ ہمیشہ کوشش کرو کہ عبادت میں بشاشت اور نشاط برقرار رہے اور تمہارا دل عبادت کے بارے میں اچھا تصور رکھے۔ {آنحضرتؐ نے} جابر سے فرمایا:

"یَا جَابِرُ! اِنَّ هٰذَا الدِّیْنَ لَمَتِیْنٌ فَاَوْغِلْ فِیْهِ بِرِفْقٍ فَاِنَّ الْمُنْبَتَّ لَا اَرْضاً قَطَعَ وَ لَا ظَهْراً اَبْقٰی."

اے جابر! دین اسلام دین متین ہے' اپنے ساتھ نرم رویہ رکھو۔ پھر فرماتے ہیں (کیسی زبردست تشبیہ ہے!) جابر! جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اپنی ذات پر دباؤ ڈال کر اور اپنے اوپر سختی کر کے جلد از جلد مقصد تک پہنچ جائیں گے' وہ غلطی پر ہیں' وہ کبھی مقصد تک نہیں پہنچ پائیں گے۔ ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جسے ایک سواری دی گئی ہے' تاکہ وہ ایک شہر سے دوسرے شہر جا سکے' اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ اس سواری کو جتنا زیادہ چابک رسید کرے گا اور اس پر جتنا زیادہ دباؤ ڈالے گا' وہ اتنا ہی جلد پہنچ جائے گا۔ ایسا شخص ابتدائی چند منزلیں تو تیزی کے ساتھ سر کرلے گا' لیکن اچانک اسے معلوم ہوگا کہ اُس نے بے چاری سواری کو زخمی کر دیا ہے' اور اب اسکے لئے راستہ چلنا دوبھر ہو چکا ہے اور وہ جابجا رک رہی ہے' اور وہ منزل پر نہیں پہنچا' جبکہ اس نے اپنی سواری کو بھی ناقص اور زخمی کر دیا ہے۔ فرمایا: جو انسان اپنے آپ پر سختی کرتا ہے اور اپنی استعداد سے بڑھ کر اپنے اوپر بوجھ ڈالتا ہے' اور یہ سمجھتا ہے کہ وہ جلد مقصد تک پہنچ جائے گا' وہ کبھی مقصد تک نہیں پہنچے گا۔ اس کی روح اُس سواری کی مانند ہو جائے گی جو زخمی ہوگئی ہو' وہ راستے میں ٹھہر جائے گی اور قدم اٹھانے کے قابل نہیں رہے گی۔ لوگوں کی صورتحال بھی ایسی ہی ہے۔

ایک مسلمان اور اس کا عیسائی پڑوسی

امام جعفر صادق علیہ السلام ایک داستان نقل کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں: ایک شخص مسلمان اور عبادت گزار تھا' اس کا ایک عیسائی پڑوسی تھا' اس کا اسکے گھر آنا جانا تھا' یہاں تک کہ وہ عیسائی اسلام کی طرف مائل ہوا اور اس کے ہاتھ پر مسلمان ہوگیا۔ عیسائی کے مسلمان ہونے کے بعد اس آدمی نے سوچا کہ اسے زیادہ مسلمان کردے اور اسے بہت ثواب پہنچائے۔ وہ بے چارہ جو ابھی تازہ تازہ مسلمان ہوا تھا اور اگلا دن اس کے اسلام کا پہلا دن تھا' اس نے دیکھا کہ صبح طلوع ہونے سے پہلے ہی کوئی اس کے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ {اس نے پوچھا:} کون ہے؟ {باہر سے آواز آئی:} میں ہوں تمہارا مسلمان ہمسایہ۔ کیوں آئے ہو؟ میں اس لئے آیا ہوں کہ چلو ساتھ چل کر مسجد میں عبادت کرتے ہیں۔ وہ بے چارہ اٹھا' وضو کیا اور مسجد چلا گیا۔ (نافلہ نمازیں پڑھنے کے

بعد) اس نے پوچھا: ختم؟ وہ بولا: نہیں' فجر کی نماز بھی ہے۔ فجر کی نماز بھی پڑھ لی۔ اب ختم؟ نہیں' کچھ نوافل بھی پڑھ لیتے ہیں' مستحب ہے۔ ہمیں اتنی نوافل پڑھنی ہیں کہ طلوعین کے درمیان سورج طلوع ہونے تک بیدار رہ سکیں۔ سورج طلوع ہوگیا۔ کہنے لگا: سورج نکلنے کے بعد بھی کچھ دیر (عبادت کرلیتے ہیں)۔ ظہر کے وقت بھی اسے نماز کے لئے ٹھہرائے رکھا اور عصر تک بھی روکے رکھا اور پھر بولا: تم نے کھانا تو نہیں کھایا ہے' کیوں نہ روزے کی نیت بھی کرلو۔ مختصر یہ کہ اسے رات شروع ہونے کے بعد بھی دو تین گھنٹوں تک نہیں جانے دیا۔ جب اگلی صبح اس نے اسکے دروازے پر دستک دی' اُس نے پوچھا: کون ہے؟ اور اس نے بتایا کہ میں تمہارا مسلمان بھائی ہوں' اُس نے پوچھا: کیوں آئے ہو؟ اس نے کہا میں تمہیں عبادت کے لئے لینے آیا ہوں' تو اُس نے کہا: یہ دین بے کار لوگوں کے لئے ٹھیک ہے۔ میں اسے چھوڑ کر اپنے پہلے دین کی طرف لوٹ گیا ہوں۔

یہ داستان بیان کرنے کے بعد امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ ہمیں ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ اس شخص نے ایک انسان کو مسلمان کیا اور پھر اپنے ہی ہاتھوں اسے مرتد اور کافر بنادیا۔

بہت سے کام ایسے ہیں جو تنفیر پیدا کرتے ہیں۔ یعنی لوگوں کو اسلام سے متنفر کرتے ہیں۔ مثلاً اسلام میں صفائی بے شک سنت اور مستحب موکد ہے۔ صفائی ایمان کا حصہ ہے اور ہمارے نبیؐ اپنے زمانے کے صاف ستھرے ترین انسان تھے۔ اگر آج پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوتے تو ہم دیکھتے کہ آپ غیر معمولی صاف ستھرے انسان ہیں۔ ایک چیز جسے نبی اکرمؐ کبھی نہیں چھوڑتے تھے اور دوسروں کو بھی اسکی تاکید کیا کرتے تھے' وہ عطر اور خوشبو کا استعمال ہے۔ اسکے باوجود صفائی ایک سنت اور مستحب کام ہے' واجب نہیں ہے۔ اب اگر ایک مبلغ کا لباس گندا اور میلا کچیلا ہو اور اسکے بدن سے بدبو اٹھ رہی ہو تو شاید فقہی اعتبار سے تو یہ نہ کہا جاسکے کہ وہ کسی حرام کا مرتکب ہوا ہے' لیکن آپ ذرا یہ سوچئے کہ یہ شخص اس میلی کچیلی اور بدبو دار ذاتی حالت میں ایک انتہائی صاف ستھرے جوان کے پاس آکر یہ کہے کہ میں تمہیں اسلام کی طرف دعوت دینا اور تمہیں دین کی تبلیغ کرنا چاہتا ہوں۔ اگر اسکی باتیں ہیرے جواہرات سی بھی ہوں' تب بھی وہ جوان اس کی باتیں نہیں مانے گا۔

علم کلام کے ماہرین ایک بہت اچھی بات کہتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ نبوت کی ایک شرط یہ ہے کہ پیغمبرؐ کے اندر کوئی ایسی صفت نہیں ہونی چاہئے جو لوگوں کو اُس سے متنفر کر دے خواہ وہ جسمانی نقص ہی کیوں نہ ہو۔ ہم جانتے ہیں جسمانی نقص سے انسانی روح کے کمال کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ فرض کیجئے کوئی انسان ایک آنکھ سے نابینا ہو' کسی کا چہرہ ٹیڑھا ہو اور وہ صرف ایک ہی رخ پر دیکھ سکتا ہو۔ کیا یہ انسانی روح کے لئے کوئی نقص ہے؟ نہیں' ممکن ہے یہ انسان سلمان فارسیؓ کے مرتبے تک پہنچا ہوا ہو' بلکہ شاید اُن سے بھی بلند مرتبہ ہو' لیکن کیا ایسا آدمی اپنی ایسی شکل وصورت کے ساتھ نبی ہو سکتا ہے؟ متکلمین کہتے ہیں کہ نہیں' کیونکہ اس کا چہرہ نفرت انگیز ہے۔ نقص نہیں ہے لیکن نفرت انگیز ہے۔ پیغمبرؐ میں ایسی خصوصیات ہونی چاہئیں کہ اس کی ذات حتیٰ جسمانی اعتبار سے بھی پرکشش ہو اور کم از کم نفرت انگیز نہ ہو۔ حالانکہ جسمانی نقص' روحانی نقص نہیں ہوتا۔ پس جب ایک مبلغ اور خدا کی طرف بلانے والے کا حلیہ نفرت انگیز نہیں ہونا چاہئے' تو اسکی دوسری خصوصیات جیسے رفتار وکردار اور جو باتیں وہ کرتا ہے' انہیں بھی ایسی نہیں ہونا چاہئے جو لوگوں میں نفرت' تنفر اور دوری پیدا کریں۔

زیادہ ملامت

سختیاں' حد سے زیادہ ملامت اور برا بھلا کہنا بھی اسی قسم کی چیز ہے۔ سرزنش اور ڈانٹ ڈپٹ کبھی بہت مفید ہوتی ہے۔ کبھی کبھی ملامت سے انسان کی غیرت جوش میں آجاتی ہے۔ لیکن ملامت کا بھی ایک مقام ہے۔ کبھی کبھی ملامت (ابونواس کے بقول) اشتعال کا سبب بھی بن جاتی ہے:

دَعْ عَنْکَ لَوْمِیْ فَاِنَّ اللَّوْمَ اِغْرَآءٌ
وَدَاوِنِیْ بِالَّتِیْ کَانَتْ هِیَ الدَّآءُ (۱)

۱۔ مجھے ملامت کرنا چھوڑ دو' کیونکہ ملامت جری کر دیتی ہے' اور میری دوا کرو اس چیز سے کہ جو درد ہے۔

یہ ایک کلیہ نہیں ہے' لیکن بہت سے مواقع پر حد سے زیادہ ملامت اکثر نفرت پیدا کرتی ہے۔ مثلاً بہت سے لوگ اپنی اولاد کی تربیت میں اس غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں' بچوں کو مسلسل ڈانٹ ڈپٹ اور لعنت ملامت کرتے رہتے ہیں: { کبھی کہتے ہیں} لعنت ہو تم پر' فلاں بچہ بھی تمہارا ہی ہم عمر ہے' دیکھو اس نے کس طرح ترقی کی ہے' تم انتہائی نالائق ہو' مجھے تو اب تم سے کوئی امید نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان ملامتوں سے بچے کی غیرت جوش میں آ جائے گی۔ حالانکہ ایسے مواقع پر' ملامت اگر حد سے بڑھ جائے' تو برعکس ردِ عمل کا باعث ہوتی ہے' اس کی روح میں اضطراب اور فرار کی حالت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ روحانی اعتبار سے بیمار ہو جاتا ہے اور محال ہے کہ پھر وہ اس کام کے لئے کوشش بھی کرے {جو والدین اس سے کروانا چاہتے ہیں}۔

یہی وجہ ہے جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے احکامات میں نہ صرف معاذ بن جبل سے بلکہ معاذ بن جبل جیسا کام کرنے والے اور حضرات اور تمام ہی لوگوں سے فرمایا ہے کہ: بَشِّرْ وَ لَاتُنَفِّرْ یَسِّرْ وَ لَاتُعَسِّرْ. نرمی برتو' سختی سے کام نہ لو۔ لوگوں سے یہ نہ کہو کہ دینداری کوئی آسان کام نہیں' دینداری مشکل کام ہے' بہت مشکل ہے' غیر معمولی طور پر مشکل ہے' ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے' ہر شخص دیندار نہیں ہو سکتا۔ کارِ ھر بز نیست خرمن کوفتن... گاو نر می خواھد و مردِ کھن (خوشوں سے گندم نکالنا ہر بکری کا کام نہیں ہے' اسکے لئے مضبوط بیل اور تجربہ کار مرد چاہئے) لوگوں کو دینداری کے مشکل ہونے سے خوفزدہ نہ کرو' اس کے نتیجے میں وہ خوفزدہ ہو جائیں گے اور کہیں گے کہ جب یہ اتنی مشکل ہے' تو اسے چھوڑ دیتے ہیں۔ پیغمبر اکرمؐ فرماتے تھے: یَسِّرْ. آسان رکھو۔

اسلام درگزر کرنے والا اور آسان دین ہے

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمایا کرتے تھے:

"بُعِثْتُ عَلَی الشَّرِیْعَةِ السَّمْحَةِ السَّهْلَةِ."

"خدا نے مجھے ایسی شریعت اور دین پر مبعوث کیا ہے جس میں نرمی (درگزر)

اور آسانی ہے۔"

دین اسلام میں نرمی اور درگزر پائی جاتی ہے۔ کسی انسان کو "سماحۃ" کہتے ہیں یعنی درگزر کرنے والا انسان لیکن "دین درگزر کرنے والا ہے" سے کیا مراد ہے؟ کیا دین بھی درگزر کر سکتا ہے؟ دین میں بھی درگزر ہے لیکن اسکے کچھ اصول ہیں۔ کیسے؟ وہ دین جو آپ سے کہتا ہے کہ وضو کیجئے وہی دین آپ سے کہتا ہے کہ اگر آپ کے بدن پر کوئی زخم ہو یا اس میں کوئی بیماری ہو اور آپ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو ضرر کا خوف ہو (یہ نہیں کہتا کہ نقصان کا یقین ہو) تو تیمم کر لیجئے وضو نہ کیجئے۔ یہ ہیں دین میں سماحت (نرمی اور درگزر) کے معنی۔ یعنی دین میں ہٹ دھرمی اور ضد نہیں ہے اپنے مقام پر اس میں نرمی اور لچک بھی پائی جاتی ہے۔ یا دین کہتا ہے کہ روزہ واجب ہے۔ اگر انسان بغیر عذر کے روزہ نہ رکھے تو گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہی دین اپنے مقام پر کس قدر لچک کا مظاہرہ کرتا ہے: يُرِيْدُ اللهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَ لَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ. (۱) روزے کے بارے میں ہے۔ آپ مسافر ہیں آپ کے لئے دوران سفر روزہ رکھنا دشوار ہے اس صورت میں روزہ نہ رکھئے بعد میں اسکی قضا کر لیجئے يُرِيْدُ اللهُ بِكُمُ الْيُسْرَ آپ بیمار ہیں: وَ مَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ يُرِيْدُ اللهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَ لَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ یعنی اسلام ایک نرم اور درگزر کرنے والا دین ہے۔ حتیٰ اگر آپ کو نقصان کا اندیشہ ہو ضروری نہیں کہ نقصان کا سو فیصد یقین ہو اور ممکن ہے آپ کے دل میں یہ خوف کسی فاسق یا کافر طبیب کے کہنے سے پیدا ہوا ہو لیکن بہر حال یہ خوف اور اندیشہ آپ کے دل میں پیدا ہو گیا ہے۔ اور ایک حدیث میں ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ یہ خوف اور اندیشہ کسی اور کے دل میں بھی پیدا ہوا ہو اور دوسرے بھی خوفزدہ ہوں: اِنَّ الْاِنْسَانَ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ. (۲)۔ اگر آپ خود اپنے دل میں یہ محسوس کرتے ہیں کہ آپ کو یہ خوف ہے کہ کہیں روزے سے آپ کی بیماری شدت

۱۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۱۸۵ (خدا تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے زحمت اور مشقت نہیں۔)

۲۔ انسان خود اپنے نفس سے آگاہ ہے۔

اختیار نہ کرے تو یہی کافی ہے اور کسی اور سے پوچھنا ضروری نہیں ہے۔ حتیٰ ایک عمر رسیدہ انسان کے لئے' یا ایک ایسی عورت کے لئے جو حاملہ ہے اور جس کے وضعِ حمل کا وقت نزدیک ہے' ضروری نہیں ہے کہ نقصان کا اندیشہ ہو۔ ایک عمر رسیدہ مرد یا عورت ممکن ہے انہیں ضرر کا خوف بھی نہ ہو لیکن (کیونکہ) عمر رسیدہ ہیں اور بہت بوڑھے ہو چکے ہیں (اس لئے اُن پر روزہ واجب نہیں ہے)۔ یہ ہے نرمی اور درگزر۔

مرحوم آیت اللہ شیخ عبدالکریم حائری اعلی اللہ مقامہ اپنی عمر کے آخر میں بوڑھے ہو چکے تھے اور روزہ ان کے لئے دشوار تھا' پھر بھی روزہ رکھتے تھے۔ ان سے کسی نے کہا: آپ روزہ کیوں رکھتے ہیں؟ آپ نے خود اپنی توضیح المسائل میں لکھا ہے اور خود آپ کا فتویٰ ہے کہ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورت پر روزہ واجب نہیں ہے۔ کیا آپ کا فتویٰ بدل گیا ہے' یا آپ اب بھی اپنے آپ کو بوڑھا نہیں سمجھتے؟ انہوں نے کہا: نہیں' میرا فتویٰ تبدیل نہیں ہوا ہے' اور میں خود بھی جانتا ہوں کہ بوڑھا ہو چکا ہوں۔ {اُس نے پوچھا:} پھر روزہ کیوں رکھتے ہیں؟ کہنے لگے: میری عوامی سوچ مجھے اجازت نہیں دیتی۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بُعِثْتُ عَلَى الشَّرِيعَةِ السَّمْحَةِ السَّهْلَةِ۔ خدا نے مجھے ایک نرم اور خاص موارد میں سہل اور آسان دین و شریعت پر مبعوث کیا ہے۔ یہ ایک عملی دین ہے۔ غیر عملی دین نہیں ہے۔

اتفاقاً جو لوگ اسے باہر سے دیکھتے ہیں' جن چیزوں کی وجہ سے اسلام سب کو جذب کر لیتا ہے' ان میں سے ایک اس دین کی سہولت اور نرمی ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اس دین کی تبلیغ کرنے والے کو اس دین کی نرمی اور سہولت کا مبلغ ہونا چاہئے' ایسا کام کرے جس کی وجہ سے لوگوں میں دینی کاموں کے لئے شوق اور رغبت پیدا ہو۔

خشیتِ الٰہی

دعوت کے حوالے سے ایک اور مسئلہ' وہ چیز ہے جس کے بارے میں قرآن کی آیت فرماتی

ہے: "اَلَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰہِ وَ یَخْشَوْنَہٗ وَ لَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰہَ. (۱) یہ دین و مذہب کے داعیوں اور مبلغوں کے لئے کرتوڑ آیات میں سے ہے: جو لوگ الٰہی پیغامات کی تبلیغ کرتے ہیں، جو لوگ خدائی پیغامات کو لوگوں تک پہنچاتے ہیں اور جن میں دو شرائط پائی جاتی ہیں: ایک یہ کہ وہ خود خدا سے ڈرتے ہیں (اور دوسرے یہ کہ خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے) خود خدا سے ڈرتا ہے اور ایک خدا ترس انسان ہے، اور خوف خدا اور خشیت الٰہی اس کے دل میں گھر کر چکی ہے۔

"اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا." (۲)

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعاؤں میں (اور یہ دعائیں ہماری دعاؤں کی کتابوں میں موجود ہیں) ایک دعا ہے، جسے پندرہویں شعبان کی رات کو پڑھنا چاہئے، لیکن لکھتے ہیں کہ اس دعا کو ہر وقت پڑھا کرو۔ اگرچہ یہ شب نیمۂ شعبان کے لئے ہے لیکن نیمۂ شعبان کے علاوہ بھی اسے پڑھنا بہتر ہے اور پیغمبر اکرم کی دعا ہے:

"اَللّٰھُمَّ اقْسِمْ لَنَا مِنْ خَشْیَتِکَ مَا یَحُوْلُ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ مَعْصِیَتِکَ وَ مِنْ طَاعَتِکَ مَا تُبَلِّغُنَا بِہٖ رِضْوَانَکَ وَ مِنَ الْیَقِیْنِ مَا یَھُوْنُ عَلَیْنَا بِہٖ مُصِیْبَاتُ الدُّنْیَا. اَللّٰھُمَّ اَمْتِعْنَا بِاَسْمَاعِنَا وَ اَبْصَارِنَا وَ قُوَّتِنَا مَا اَحْیَیْتَنَا وَ اجْعَلْہُ الْوَارِثَ مِنَّا وَ اجْعَلْ ثَارَنَا عَلٰی مَنْ ظَلَمَنَا وَ انْصُرْنَا عَلٰی مَنْ عَادَانَا وَ لَاتَجْعَلْ مُصِیْبَتَنَا فِیْ دِیْنِنَا وَ لَاتَجْعَلِ الدُّنْیَا اَکْبَرَ ھَمِّنَا وَ لَامَبْلَغَ عِلْمِنَا وَ لَاتُسَلِّطْ عَلَیْنَا مَنْ لَایَرْحَمُنَا بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ."

یہ وہ دعا ہے جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پڑھا کرتے تھے۔ جو لوگ اسے یاد کرنا

۱۔ سورۂ احزاب ۳۳۔ آیت ۳۹

۲۔ سورہ فاطر ۳۵۔ آیت ۲۸ (اللہ کے عالم بندے اس سے خوف وخشیت رکھتے ہیں۔)

چاہتے ہیں، وہ اسے مفاتیح الجنان یا زاد المعاد میں اعمال شب نیمۂ شعبان میں دیکھ لیں، یہ وہاں موجود ہے۔ یہ ان دعاؤں میں سے ہے جن میں انسان کی دنیا و آخرت کی مصلحتیں جمع ہیں۔ اس کا پہلا جملہ یہ ہے:

"اَللّٰھُمَّ اقْسِمْ لَنَا مِنْ خَشْیَتِکَ مَا یَحُوْلُ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ مَعْصِیَتِکَ."

"پروردگارا! اپنی ہیبت و خشیت میں سے ہمیں اس قدر نصیب فرما کہ ہمیشہ وہ خشیت ہمارے دل میں موجود رہے اور یہ خشیت ہمارے اور گناہوں کے درمیان حائل اور مانع بن جائے۔"

قرآنِ مجید مبلغ کے بارے میں اس {زیرِ بحث} آیت میں جس پہلی شرط کا ذکر کرتا ہے وہ خشیت اللہ ہے یعنی وہ اپنے دل میں خوفِ خدا رکھتا ہے۔ یعنی اسکے دل میں اللہ کی ایسی ہیبت اور عظمت ہوتی ہے کہ جوں ہی اسکے قلب میں کسی گناہ کا تصور پیدا ہوتا ہے، تو یہ خشیت گناہ کو پیچھے دھکیل دیتی ہے۔

"وَ لَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰہَ."

"اور خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔"

وہ خدا سے ڈرتا ہے اور خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔ البتہ خشیت کے ایک خاص معنی ہیں جو خوف سے مختلف ہیں۔ "خوف" یعنی انجام اور مستقبل کا اندیشہ ہونا، کسی کام کے مستقبل اور اس کے انجام کے لئے فکر و تدبیر کرنا۔ لیکن "خشیت" وہ حالت ہے جس میں انسان پر خوف مسلط ہو جاتا ہے اور وہ جرأت کھو بیٹھتا ہے۔ اپنی جرأت کھو بیٹھنا، یعنی شجاعت کا نہ ہونا، دلیری کا نہ پایا جانا۔ لیکن کسی کام کے ممکنہ انجام کے بارے میں تشویش کا شکار ہو کر عاقلانہ تدابیر اختیار کرنا، انسان کے اپنی جرأت اور شجاعت کھو بیٹھنے سے مختلف چیز ہے۔ قرآنِ مجید کہتا ہے: اللہ کی طرف بلانے والے اور حقیقی مبلغین، خدا کے سامنے خشیتِ الٰہی رکھتے ہیں، خدا کے مقابلے میں جرأت اور جسارت ان میں ذرہ برابر نہیں ہوتی، لیکن غیرِ خدا کے مقابلے میں وہ سراپا جرأت ہوتے ہیں اور ذرہ برابر حواس باختہ نہیں ہوتے۔ وَ لَا یَخْشَوْنَ اِلَّا اللّٰہَ.

انبیاؑ اور خصوصاً پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کی ایک اور خصوصیت یہی جرأت‘ یعنی اپنے حواس نہ کھو بیٹھنا اور ثابت قدم رہنا ہے۔ یہ چیز ہمیں پیغمبر اسلام کی زندگی میں بہت زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ ایک فرنگی نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے ’’محمدؐ وہ پیغمبر جسے نئے سرے سے پہچاننا چاہئے‘‘۔ اگرچہ اس کی کتاب میں کچھ عیب بھی ہیں‘ لیکن اس اعتبار سے کہ اس نے اپنی کتاب پر بہت محنت کی ہے اور تاریخ اسلام کا بہت زیادہ مطالعہ کیا ہے‘ حتیٰ برسوں وہ عربستان میں رہا تاکہ تاریخ کو جغرافیائی علاقے کے اعتبار سے بھی تطبیق کرلے۔ اس کتاب میں اچھے نکات بھی ہیں۔ دو نکات کو اس کتاب نے اچھی طرح مجسم کیا ہے‘ شاید کسی اور کتاب نے ان دو نکات کو اتنی اچھی طرح سے مجسم نہ کیا ہو۔ ان میں سے ایک رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا غیر معمولی تدبر ہے کہ اگر ایک غیر مسلم بھی اس کتاب کا مطالعہ کرے تو وہ بھی نبی اکرمؐ کو ایک حکیم‘ مدبر اور غیر معمولی سیاستدان سمجھے بغیر نہیں رہ سکتا‘ اور دوسرے یہ کہ نبی اکرمؐ کسی حالت میں بھی‘ کہ اگر کوئی اور ہو تو حواس باختہ ہو جائے اور اپنی جرأت کھو بیٹھے‘ ذرہ برابر ان کی حالت نہیں بدلتی تھی۔ کبھی حالات اس نہج پر پہنچ جاتے کہ (ظاہری طور پر اور ظاہری حالات کے اعتبار سے) مسلمانوں کے لئے امید کی کوئی کرن باقی نہیں رہ جاتی تھی۔ ان حالات میں بھی جب انسان پیغمبر کو دیکھتا ہے تو دیکھتا ہے کہ کَالْجَبَلِ الرَّاسِخِ پہاڑ کی طرح جمے ہوئے ہیں: وَ لَا یَخْشَوْنَ اِلَّا اللّٰہَ واقعی! آپ تاریخِ پیغمبر کا اس اعتبار سے مطالعہ کیجئے (اور ہر اعتبار سے مطالعہ کرنا چاہئے) تاکہ اَلَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰہِ وَ یَخْشَوْنَہٗ وَ لَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰہَ ۔ کے معنی سمجھ سکیں اور دیکھ سکیں کہ پیغمبر کس طرح اپنے خدا سے خشیت رکھتے تھے اور کس طرح غیر خدا سے خشیت اور خوف نہیں رکھتے تھے اور کسی چیز کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔

تذکر (یاددہانی)

تبلیغ اور دعوت کے حوالے سے ایک اور نکتہ ہے‘ جس کا قرآنِ مجید نے اس بیان اور اسکی مانند دوسرے بیانات کے ذریعے ذکر کیا ہے: ذَکِّرْ. ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

"وَ ذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ." (۱)

اور ایک دوسرے مقام پر فرماتا ہے: فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَ كَفَرَ فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ. (۲) جو استثنا کے بارے میں ہے اور جس پر علیحدہ سے گفتگو کی ضرورت ہے۔ اے پیغمبرؐ! لوگوں کو بیدار کیجئے' متوجہ کیجئے' یاددہانی کرائیے۔

قرآنِ مجید میں دو مفاہیم کا تذکرہ ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک تفکر ہے اور دوسرا تذکر۔ تفکر یعنی کسی ایسی چیز کو کشف (discover) کرنا جسے ہم نہیں جانتے' جس چیز کو ہم نہیں جانتے اسے معلوم کرنے کے لئے غور وخوض کرنا۔ قرآنِ مجید تفکر کی دعوت بھی دیتا ہے۔ لیکن تذکر یعنی یاددہانی۔ تذکار یعنی یاد دلانا۔

انسانی فطرت میں (اور حتیٰ کبھی انسانی تعلیم میں بھی) بہت سے مسائل پائے جاتے ہیں لیکن انسان ان سے غافل رہتا ہے' اسے جھنجھوڑنے اور بیدار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے' تذکر اور یاددہانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر انسان کی دو مختلف حالتیں ہیں۔ ایک جہالت کی حالت اور دوسری نیند کی حالت۔ کبھی ہم اپنے اردگرد سے اپنی جہالت کی وجہ سے بے خبر ہوتے ہیں۔ ہم بیدار ہوتے ہیں لیکن کیونکہ نہیں جانتے اس لئے بے خبر ہوتے ہیں۔ اور کبھی اپنے اردگرد سے بے خبر ہوتے ہیں' اس بے خبری کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ ہمیں علم نہیں ہوتا' ہمیں علم ہوتا ہے لیکن فی الحال عالمِ خواب میں ہوتے ہیں۔ سویا ہوا انسان عالم اور باخبر ہوتا ہے لیکن اُس پر ایک ایسی حالت طاری ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی معلومات سے استفادہ نہیں کر پاتا۔ یہ ظاہری نیند کی بات تھی۔ انسان

۱۔ سورۂ ذاریات ۵۱۔ آیت ۵۵ {اور یاددہانی بہر حال کراتے رہیے کہ یاددہانی صاحبانِ ایمان کے حق میں مفید ہوتی ہے۔}

۲۔ سورۂ غاشیہ ۸۸۔ آیت ۲۱ تا ۲۴ {لہٰذا تم یاددہانی کراتے رہو کہ تم صرف یاددہانی کرانے والے ہو' تم ان پر مسلط اور ان کے ذمے دار نہیں ہو' مگر جو منہ پھیر لے اور کافر ہو جائے' تو خدا اسے بہت بڑے عذاب میں مبتلا کرے گا۔}

کی ایک اور نیند بھی ہے جسے خوابِ غفلت یا غفلت کا نام دیا گیا ہے۔ اے پیغمبر! آپ یہ نہ سمجھئے گا کہ آپ کا سامنا صرف جاہل سے ہے' بلکہ آپ کا سابقہ غافل سے بھی ہے۔ آپ جاہل کو تفکر کی اور غافل کو تذکر کی دعوت دیجئے۔ لوگ جاہل ہونے سے زیادہ غافل اور نیند میں ہوتے ہیں۔ جو سو رہے ہیں آپ انہیں بیدار کیجئے اور جو غافل ہیں انہیں ہوشیار کیجئے۔ جب آپ سوئے ہوئے کو بیدار کریں گے' تو وہ از خود کام کے لئے چل پڑے گا۔ ایک انسان اگر سو رہا ہو اور اسے کوئی خطرہ درپیش ہو' مثلاً قافلہ چل پڑے اور وہ سو رہا ہو' تو آپ اُسے بیدار کیجئے۔ جب آپ نے اسے بیدار کر دیا' تو اب اُسے خطرے کی اطلاع دینا ضروری نہیں ہے! بلکہ جوں ہی وہ بیدار ہو گا خود ہی دیکھ لے گا کہ اسے خطرہ درپیش ہے۔ بالفاظِ دیگر جب وہ بیدار ہو جائے تو ضروری نہیں کہ آپ اُس سے چلنے کے لئے کہیں' بلکہ جب وہ بیدار ہو گا اور دیکھے گا کہ قافلہ چل پڑا ہے' تو وہ از خود قافلے کے پیچھے چل پڑے گا۔ یہی وجہ ہے جو (قرآنِ مجید پیغمبر اکرمؐ سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے) وہ احساسات جو لوگوں میں پائے جاتے ہیں (اور وہ ان سے غافل ہیں) آپ اُن سوئے ہوئے احساسات کو بیدار کیجئے۔ ایمان کا ایک حصہ سوئے ہوئے احساسات کی بیداری ہے۔ اور اسی لئے اسلام میں جبر یعنی ایمان پر مجبور کرنا نہیں ہے۔

"فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ." (۱)

"لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ." (۲)

اسلام میں ایمان کے بارے میں جبر نہیں ہے' یہ خود ایک مسئلہ ہے' جسے تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ انشاء اللہ بعد میں اس نکتے پر مفصل گفتگو کریں گے۔ اس وقت صرف چند جملے عرض کر رہے ہیں۔

ایمان میں جبر نہیں

کیا اسلام میں ایمان کے بارے میں جبر پایا جاتا ہے' جس کے تحت لوگوں کو مومن بننے پر

۱۔ سورۂ غاشیہ ۸۸۔ آیت ۲۱

۲۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۲۵۶

مجبور کیا جائے؟ نہیں، اسلام میں ایسا نہیں ہے۔ کس دلیل کی بنیاد پر؟ بہت سے دلائل کی بنیاد پر۔

اسکی پہلی دلیل یہ ہے کہ ایمان میں جبر کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ جو چیز انبیاؑ چاہتے ہیں وہ ایمان ہے، ظاہری اسلام اور اسلام کا اظہار نہیں، اور ایمان میں جبر کی گنجائش ہی نہیں ہے، کیونکہ ایمان اعتقاد ہے، میلان ہے، لگاؤ ہے۔ اعتقاد کو بالجبر پیدا نہیں کیا جاسکتا۔ لگاؤ اور مہر و محبت طاقت کے زور پر نہیں پیدا کیے جاسکتے، باطنی میلان دباؤ ڈال کر نہیں پیدا کیا جاسکتا۔ کیا کوئی ماں باپ اپنی لڑکی سے ایک ایسے لڑکے کے بارے میں جسے وہ ناپسند کرتی ہے اور وہ اس کا رشتہ لے کر آیا ہے یہ کہہ سکتے ہیں کہ: ابھی ہم ایک ایسا کام کرتے ہیں کہ تم اسے پسند کرنے لگو گی، ذرا ڈنڈا تو لانا ہم تمہیں اس قدر ماریں گے کہ تم اسے پسند کرنے لگو گی؟! جی ہاں، یہ تو ہوسکتا ہے کہ اسے اس قدر مارا جائے کہ وہ کہنے لگے کہ میں اسے پسند کرتی ہوں، یعنی وہ غلط بیانی پر اتر آئے، لیکن اگر دنیا بھر کے سارے ڈنڈے اس پر توڑ دیے جائیں، تو کیا ان ڈنڈوں سے اس کے دل میں محبت پیدا کی جاسکتی ہے؟! ایسا ہونا محال ہے۔ اس کا دوسرا طریقہ ہے۔ اگر ہم لوگوں کے دلوں میں ایمان پیدا کرنا چاہتے ہیں، تو اس کا طریقہ جبر اور طاقت کا استعمال نہیں ہے، اس کا طریقہ حکمت ہے، وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ہے، جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ہے۔ اب ممکن ہے اسلام میں جہاد جیسے مسائل پیش آئیں جن کے بارے میں انشاء اللہ بعد میں گفتگو کریں گے۔ ایک مختصر حدیث آپ کے سامنے بیان کرنے کے بعد تدریجاً اپنی گفتگو ختم کریں گے۔

حدیث میں ہے (بحار میں) کہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام منبر پر تشریف فرما تھے۔ آپ نے لوگوں سے فرمایا (یہ وہ جملہ ہے جو آپ بارہا دہرایا کرتے تھے): اَیُّهَا النَّاسُ سَلُونی قَبْلَ اَنْ تَفْقِدونی. (۱) قبل اسکے کہ مجھے اپنے درمیان نہ پاؤ، تمہارے ذہن میں جو سوال ہو وہ مجھ سے پوچھ لو اور تم جو کچھ پوچھو گے میں اُس کا جواب دوں گا۔ میں زمین کے راستوں سے زیادہ آسمان کی راہوں سے واقف ہوں۔ یعنی چاہو تو زمین کے بارے میں سوال کرو اور چاہو تو آسمان

۱۔ سفینۃ البحار۔ ج ۱۔ ص ۵۸۶

کے بارے میں پوچھو کوئی پابندی نہیں ہے۔ لوگوں نے دیکھا کہ ایک شخص جس کے حلیے سے معلوم دیتا تھا کہ اس کا تعلق صحرائے عرب سے ہے، یعنی وہ یہودی عربوں میں سے ہے (اس کے خط وخال سے معلوم دیتا تھا کہ وہ عرب ہے اور اسکے لباس اور حلیے سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ یہودی ہے۔ اُسکی علامت بیان کی گئی ہے: مثلاً ایک دبلا پتلا، لمبے قد کا، سیاہ پوست انسان جس نے ایک کمان بھی اٹھائی ہوئی تھی) وہ شخص ایک کونے سے اٹھا اور درشت لہجے میں بولنا شروع کیا: اَیُّھَاالْمُدَّعِی مَا لَایَعْلَم. اے بے جانے بوجھے دعویٰ کرنے والے! یہ کیا کہہ رہے ہو کہ جو چاہو مجھ سے پوچھ لو؟! کیا واقعی جو کچھ تم سے پوچھا جائے اُس سب کا تم جواب دے سکتے ہو؟!

وہ شخص حضرت علی علیہ السلام کی توہین کرنے لگا حالانکہ آپ اُس وقت خلیفۂ مسلمین تھے۔ گویا اسے معلوم تھا کہ حضرت علی علیہ السلام کی کیا عادت ہے اور وہ فی الفور کسی ایسے شخص کی گردن اڑا دینے کا حکم بھی نہیں دیتے جو انہیں گالی دے رہا ہو۔ کیونکہ اس نے جسارت کی تھی لہٰذا اصحاب اسے سبق سکھانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ فوراً حضرت علی نے انہیں روکا۔ یہاں آپ کا ایک جملہ ہے جس کی وجہ سے میں نے یہ حدیث نقل کی ہے۔ فرمایا: اَلطَّیْشُ لَایَقُوْمُ بِہٖ حُجَجُ اللّٰہ. (۱) زور زبردستی سے الٰہی حجتوں کو قائم نہیں کیا جاسکتا۔ اس نے ایک بات کہی ہے اور مجھ سے بات کی ہے۔ اس کے ذہن میں ایک سوال ہے، اسے آنے دو، مجھ سے سوال کرنے دو۔ اگر میں نے اس کا جواب دے دیا، تو وہ خود ہی اپنے عمل پر پشیمان ہو جائے گا۔ آپ نے اپنے اصحاب کو سختی سے روکا۔ یہ کیا فضول باتیں کر رہے ہو کہ خاموش ہو جاؤ، دفع ہو جاؤ، ذرا اسے سبق سکھاؤ، تمہاری درگت بنا دیں گے؟! (ان باتوں سے الٰہی حجتیں قائم نہیں ہوتیں)۔ اگر تم حجتِ الٰہی کو قائم کرنا چاہتے ہو، تو اس کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ اس کا طریقہ نرمی اور ملائمت ہے، کیونکہ اس کا تعلق دل سے ہے، فکر سے ہے، روح سے ہے۔ جب اسلام کی دعوت اور اسکی تبلیغ کا مقام ہو، تو بات یہ ہوا کرتی ہے۔

۱۔ سفینۃ البحار۔ ج ۱۔ ص ۵۸۶

حسین ابن علی علیہ السلام جب دشمن کی ضد اور ہٹ دھرمی کا سامنا کرتے ہیں' تو اس انداز سے سر اٹھا کر کھڑے ہوتے ہیں کہ کوئی طاقت انہیں ہراساں نہیں کر سکتی' ان کا سر جھکانا تو دور کی بات ہے۔ لیکن جب آپ ایسے افراد سے ملتے ہیں جن کی رہنمائی اور ہدایت مطلوب ہو' تو آپ ان کی بے اعتنائی سے بھی چشم پوشی کر لیتے ہیں۔

زہیر ابن قین مکہ سے روانہ ہو کر اپنے قافلے کے ساتھ آ رہے ہیں۔ امام حسینؑ بھی تشریف لا رہے ہیں۔ زہیر کی کوشش ہے کہ ان کا امام حسینؑ سے سامنا نہ ہونے پائے' یعنی جب انہیں محسوس ہوتا تھا امام حسینؑ نزدیک ہیں' تو اپنے قافلے کو دوسری طرف لے جاتے تھے۔ اگر امام حسینؑ کسی جگہ پڑاؤ کرتے' خصوصاً کسی چشمے پر' تو زہیر کسی اور جگہ اترتے۔ وہ کہتے تھے کہ میں امام حسینؑ سے نظریں نہیں ملانا چاہتا' اس لئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر تکلفاً مجھے ان کا ساتھ دینا پڑے (یہ ان کی باتوں کا خلاصہ ہے)۔ امام حسینؑ بھی (زہیر کے گریز کی وجہ) جانتے ہیں۔ لیکن کیونکہ امام حسینؑ نے سمجھ لیا تھا کہ زہیر دھوکے کا شکار ایک فرد ہیں' اور عثمانی ہیں' یعنی حضرت عثمان کے مرید ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زہیر ایک ایسے ماحول میں رہے تھے جہاں انہیں عثمانیوں نے اپنے گروہ میں شامل کیا ہوا تھا' لیکن وہ ایک بے لوث انسان تھے (امامؑ اپنے دل میں کہتے ہیں) اس نے ہم سے بے اعتنائی کی ہے' کوئی بات نہیں' ہدایت و رہنمائی ہماری ذمے داری ہے۔ اتفاقاً زہیر ایک ایسے مقام پر پڑاؤ ڈالنے پر مجبور ہوئے جہاں ابا عبداللہ الحسینؑ بھی موجود تھے' کیونکہ ان کا قافلہ اگلی منزل تک سفر جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔ البتہ امام حسینؑ نے اپنا خیمہ ایک طرف لگا رکھا تھا اور زہیر نے دوسری جانب۔ امام حسینؑ جانتے تھے کہ زہیر ان کا سامنا نہیں کرنا چاہتا' لیکن امام انہیں متوجہ کرنا چاہتے تھے: فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ. انہیں بیدار کرنا چاہتے تھے' انہیں خوابِ غفلت سے جگانا چاہتے تھے' انہیں مجبور کرنا نہیں چاہتے۔

آپ نے ایک شخص کو ان کے پاس بھیجا اور فرمایا کہ زہیر سے کہو کہ: اَجِبْ اَبَا عَبْدِ اللّٰهِ. حسین ابن علیؑ تمہیں یاد کر رہے ہیں' تمہیں بلاتے ہیں۔ زہیر اور ان کے ساتھی ایک خیمے میں حلقہ بنائے بیٹھے تھے' دستر خوان بچھا ہوا تھا اور وہ کھانا کھانے میں مشغول تھے۔ اچانک پردہ اٹھا اور وہ

شخص اندر داخل ہوا: یاڑُهَیرُ! اَجِبْ اَبا عَبدِ اللہ. اے زہیر! حسین ابن علیؑ تمہیں یاد کر رہے ہیں۔ (زہیر نے دل میں کہا:) افسوس! وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ ان کے ساتھی بھی (سارے معاملے) سے واقف تھے۔ لکھا ہے کہ گویا ان کے ہاتھ اٹھے کے اٹھے رہ گئے۔ ایک طرف تو زہیر یہ جانتے تھے کہ امام حسینؑ کون ہیں' فرزندِ رسولؐ ہیں اور ان کے بلاوے کو مسترد کرنا درست نہیں ہے۔ عربوں میں ایک کہاوت ہے' کہتے ہیں: کَاَنَّهُ علىٰ رَاْسِهِ الطَّیرُ. (۱)۔ ان کے بارے میں (راوی) کہتا ہے: کَاَنَّهُ علىٰ رُؤُسِهِمُ الطَّیرُ. یعنی وہ اسی طرح ہکا بکا بیٹھے رہ گئے۔ زہیر پریشان تھے کہ کیا جواب دیں۔ (خیمے کی فضا پر سکوت طاری تھا)۔ زہیر کی ایک صاحبِ معرفت بیوی تھی۔ یہ عورت حالات کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ خیمے کے باہر سے اسے محسوس ہو گیا کہ امام حسینؑ کا پیام رساں آیا ہے' اور زہیر کو بلا رہا ہے' اور زہیر نے خاموشی اختیار کی ہوئی ہے' وہ نہ یہ کہہ رہے ہیں کہ میں آرہا ہوں اور نہ ہی آنے سے انکار کر رہے ہیں۔ اس عارف اور مومنہ عورت کی غیرت نے جوش مارا اور اس نے آکر یکایک خیمہ کا پردہ ہٹایا اور سخت لہجے میں بولی: زہیر! تمہیں شرم نہیں آتی؟! فرزندِ فاطمہ تمہیں بلا رہے ہیں اور تم ان کا جواب دینے میں تردد کا شکار ہو؟! اٹھو۔ زہیر فوراً اپنی جگہ سے اٹھے اور امام حسینؑ کی خدمت میں پہنچ گئے۔

تذکر اور توجہ دلانا اس طرح کام کرتا ہے۔ امام حسینؑ اور زہیر ابن قین کے درمیان ہونے والی بات چیت کی پوری تفصیل ہمارے پاس نہیں ہے' نہیں معلوم حضرتؑ نے زہیر سے کیا فرمایا' لیکن جو بات قطعی اور یقینی ہے' وہ یہ ہے کہ جو زہیر امام حسینؑ کی خدمت میں گیا تھا وہ اس زہیر سے بالکل مختلف تھا جو وہاں سے باہر آیا تھا' یعنی دو بالکل مختلف افراد تھے۔ یعنی تھکا ہوا' خستہ حال' اکتایا ہوا' شرمیلا اور منہ بسورا ہوا زہیر' یکایک دیکھتے ہیں کہ ایک ہشاش بشاش' خوش رُو اور خوش حال زہیر کی صورت امام حسینؑ کے پاس سے آرہا ہے۔

مورخین نے صرف اتنا لکھا ہے: امامؑ نے انہیں ایک واقعہ یاد دلایا جو ان کی روح میں

۱۔ گویا اس کے سر پر پرندہ بیٹھا ہوا ہو۔

پیوست تھا' لیکن انہوں نے اسے بھلا دیا تھا اور اس سے غافل ہو گئے تھے۔ یعنی آپ نے ایک خوابیدہ شخص کو بیدار کر دیا۔ جب بشارت دی جاتی ہے' تذکر ہوتا ہے' بیداری ہوتی ہے' تو یہ ایک افسردہ شخص کو طاقت اور توانائی کے ایک ایسے مجسمے میں تبدیل کر دیتی ہے۔ دیکھتے ہیں کہ زہیر کا چہرہ بدل چکا ہے اور اب وہ پہلے والے زہیر نہیں رہے' وہ اپنے خیموں میں آتے ہیں۔ پہنچتے ہی حکم دیتے ہیں: میرا خیمہ ہٹا دو! پھر وصیت کرنا شروع کرتے ہیں: میرے اموال کا یہ ہوگا' میرے بیٹوں کا یہ' میری بیٹیوں کا یہ۔ اپنی بیوی کے بارے میں وصیت کرتے ہیں: فلاں شخص اسے اس کے باپ کے پاس لے جائے۔ انہوں نے اس طرح کی باتیں کیں کہ سب لوگ سمجھ گئے کہ اب زہیر نہیں رہیں گے۔ لوگوں نے دیکھا کہ زہیر اس طرح سے الوداع کہہ رہے ہیں کہ جیسے اب وہ واپس نہیں آئیں گے۔ اس عارفہ خاتون نے اس بات کو سب سے بہتر طور پر محسوس کیا۔ وہ آئی اور زہیر کا دامن تھام کر رونے لگی۔ بولی: زہیر تم تو بلند مقامات کو پا رہے ہو' ایسے مقام جن کی تمنا کرنی چاہیے۔ میں سمجھ گئی' تم فرزندِ فاطمہؑ کے ساتھ شہید ہو جاؤ گے۔ حسینؑ قیامت میں تمہارے شفیع ہوں گے۔ زہیر! ایسا کام نہ کرنا کہ قیامت میں میرے اور تمہارے درمیان جدائی پیدا ہو جائے' میں اس امید پر تمہارا دامن تھام رہی ہوں کہ قیامت میں مادرِ حسینؑ میری بھی شفاعت کریں گی۔

اسی تذکر اور بیداری نے یہ حالت کر دی کہ وہی زہیر جو امام حسینؑ سے ملاقات سے گریز کر رہے تھے' وہ اصحابِ امام حسین میں اعلیٰ مقام پر فائز ہوئے اور روزِ عاشور امامؑ نے میمنہ زہیر کے سپرد کیا۔ یہ عظیم شخص ایسا ابھر کر آیا کہ ہم جانتے ہیں جب روزِ عاشور امامؑ تنہا رہ گئے اور ان کے اصحاب' دوستوں اور اہلِ بیت میں سے کوئی بھی باقی نہ رہ گیا' تو آپ میدان کے درمیان کھڑے ہوئے اور اپنے اصحاب کو صدا دی' جن افراد کا نام امام نے پہلے مرحلے پر لیا ان میں ایک زہیر بھی تھے: یـااَصْحابَ الصَّفا وَ یا فُرْسانَ الْهَیْجاءِ یا مُسْلِمَ بْنَ عَقیلٍ یا هانِیَ بْنَ عُرْوَةَ وَ یـازُهَیْرُ قومـوا عَـنْ نَوْمَتِکُمْ بَنِی الْکِرامِ وَادْفَعوا عَنْ حَرَمِ الرَّسولِ الطُّغاةَ اللِّئامَ.

خلاصہ یہ کہ فرماتے ہیں: اے زہیر! عزیزم! کیوں سوتے ہو؟ اٹھو' اپنے رسول کے حرم کا دفاع کرو۔

ولاحول و لا قوة الا باللّٰہ العلیّ العظیم. باسمک العظیم الاعظم الاجلّ الاکرم یا اللّٰہ...

پروردگار! ہم سب کا انجام بخیر فرما۔ ہم سب کے دلوں میں اپنے خوف اور خشیت کو قرار دے۔ ہم سب کی نیتوں کو خالص فرما۔۔۔

☆☆☆

آٹھویں نشست

سیرتِ نبیؐ اور اسلام کی تیز رفتار ترقی

سیرتِ نبیؐ اور اسلام کی تیز رفتار ترقی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ رب العالمین باری الخلائق اجمعین. والصلوٰۃ والسلام علیٰ عبداللّٰہ ورسولہ و حبیبہ و صفیہ و حافظ سرّہ ومبلّغ رسالاتہ سیّدنا ونبیّنا ومولانا ابی القاسم محمد و آلہ الطیّبین الطاہرین المعصومین.

اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم

"فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَ لَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِى الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ." (۱)

اسلام کا تیز رفتار پھیلاؤ تاریخِ عالم کے اُن اہم ترین مسائل میں سے ایک مسئلہ ہے جن

۱۔ سورۂ آلِ عمران ۳۔ آیت ۱۵۹

کے اسباب ووجوہات پر بحث وگفتگو کی جاتی ہے۔ البتہ عیسائیت اور کسی حد تک بدھ مت بھی دنیا میں پھیلنے والے ادیان میں شامل ہیں' بالخصوص عیسائیت' جس کا گہوارہ اور جائے پیدائش تو بیت المقدس ہے' لیکن یہ دنیائے مشرق کی نسبت دنیائے مغرب میں زیادہ پھیلا ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں یورپ اور امریکا کے لوگوں کی اکثریت عیسائی ہے' اگرچہ حالیہ زمانے میں اکثر وہ صرف نام کی حد تک عیسائی رہ گئے ہیں' باقاعدہ اور حقیقی طور پر نہیں۔ لیکن پھر بھی ان کا خطہ عیسائی خطہ شمار ہوتا ہے۔ بدھ مت کا ظہور بھی ہندوستان میں ہوا ہے' گوتم بدھ ہندوستان میں ظاہر ہوئے لیکن ان کا دین زیادہ تر ہندوستان سے باہر مثلاً جاپان اور چین میں ہے' البتہ اسکے پیروکار خود ہندوستان میں بھی موجود ہیں۔ یہودیت ایک محدود قومی اور نسلی دین ہے' یہ ایک قوم اور نسل سے باہر نہیں نکلا ہے۔ زرتشتی دین بھی تقریباً ایک علاقائی دین ہے' جو ایران کے اندر ظاہر ہوا اور تمام ایرانیوں کو بھی اپنے دائرے میں نہ لا سکا' بہر صورت ایران سے باہر نہ نکل سکا اور اگر آج ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کے اندر بھی کچھ زرتشتی موجود ہیں' جو ہندی پارسیوں کے نام سے مشہور ہیں' تو یہ لوگ ہندوستانی نہیں ہیں بلکہ ایرانی زرتشت ہیں جنہوں نے ایران سے ہندوستان ہجرت کی ہے اور ایران سے ہندوستان ہجرت کر کے جانے والے یہ لوگ بھی ایک زندہ حلقہ قائم نہیں کر سکے ہیں اور اپنا دین دوسروں کے درمیان نہیں پھیلا سکے ہیں۔

اسلام اس اعتبار سے عیسائیت کے مشابہ ہے کہ وہ اپنی سرزمین سے باہر نکل کر نئے علاقوں میں داخل ہوا۔ اسلام کا ظہور جزیرۃ العرب میں ہوا اور آج ہم دیکھتے ہیں کہ ایشیا' افریقہ' یورپ' امریکا اور دنیا کی مختلف نسلوں کے درمیان اس کے پیروکار موجود ہیں' یہاں تک کہ مسلمانوں کی تعداد اگرچہ عیسائیوں کی کوشش ہے کہ اصل سے کم ظاہر کی جائے اور ہماری کتابوں میں بھی اکثر انہی فرنگیوں سے اعداد وشمار لئے جاتے ہیں' لیکن اس بارے میں کی جانے والی تحقیق کے مطابق شاید مسلمانوں کی تعداد عیسائیوں سے زیادہ ہو کم نہ ہو۔

لیکن اسلام میں فروغ اور وسعت اختیار کرنے کے لحاظ سے ایک خاصیت ہے جو عیسائیت میں نہیں پائی جاتی' اور وہ اسلام کا تیز رفتار پھیلاؤ ہے۔ عیسائیت نے بہت سست رفتاری کے ساتھ

ترقی کی ہے' لیکن اسلام نے غیر معمولی تیز رفتار ترقی کی ہے' خواہ وہ سرزمینِ عرب ہو یا اُس سے باہر کے علاقے' ایشیا ہو یا افریقہ' یا دیگر مقامات۔

مسئلہ یہ زیرِ بحث ہے کہ کس طرح اسلام نے اتنی تیز رفتار سے ترقی کی؟ حتیٰ مشہور فرانسیسی شاعر ''لامارٹین'' کہتا ہے: اگر ان تین چیزوں کو مدِ نظر رکھا جائے' تو کوئی بھی پیغمبر اسلام کی برابری نہیں کرسکتا۔ پہلی چیز مادّی وسائل کا فقدان ہے۔ ایک شخص اٹھتا ہے' دعوت دیتا ہے' حالانکہ اسکے پاس کوئی طاقت نہیں ہوتی' حتیٰ اس کے نزدیک ترین افراد اور اس کا خاندان بھی اسکی دشمنی پر کمر بستہ ہو جاتا ہے' وہ تن تنہا اٹھتا ہے' اُس کا کوئی معاون و مددگار نہیں ہوتا' وہ اپنے آپ سے آغاز کرتا ہے' اُسکی شریکِ حیات اس پر ایمان لاتی ہے' جو بچہ اسکے گھر میں ہے اور اس کا چچازاد بھائی ہے (حضرت علی علیہ السلام) وہ اس پر ایمان لاتا ہے' رفتہ رفتہ دوسرے افراد ایمان لاتے ہیں اور وہ بھی کن مشکلات اور مشقتوں کے عالم میں! دوسری چیز' (اسلام کی) تیز رفتار ترقی یا زمانے کا عامل ہے اور تیسری چیز' مقصد کی عظمت ہے۔

اگر مقصد کی اہمیت کو وسائل کے فقدان اور وسائل کے فقدان کے باوجود تیزی سے اس مقصد تک رسائی کو دیکھا جائے' تو پیغمبر اسلامؐ (بقول لامارٹین اور اس نے درست کہا ہے) دنیا میں بے مثل و بے نظیر ہیں۔ اگر عیسائیت نے دنیا میں ترقی اور فروغ حاصل کیا ہے' تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اٹھا لئے جانے کے کئی سو سال بعد اس نے دنیا میں ایک حد تک اپنی جگہ بنائی ہے۔

ہم اپنی گفتگو کی مناسبت سے جو سیرت النبیؐ کے بارے میں ہے' اسلام کی تیز رفتار ترقی کے حوالے سے بات کریں گے۔ قرآنِ مجید نے اس بات کی وضاحت کی ہے' اور تاریخ نے بھی واضح طور پر اس بات کی تائید کی ہے کہ اسلام کی تیز رفتار ترقی کی وجوہات اور اسباب میں سے ایک وجہ اور سبب ''سیرت النبی'' اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریقۂ دعوت ہے۔ یعنی نبی کریم کا اخلاق' عادات' رفتار و کردار اور طرزِ دعوت اور اندازِ تبلیغ۔ البتہ دوسرے اسباب بھی کارفرما رہے ہیں۔ خود قرآنِ مجید جو پیغمبر کا معجزہ ہے' قرآن کی وہ زیبائی' وہ گہرائی' وہ ولولہ آفرینی' وہ جاذبیت' بے شک اوّلین عامل ہے۔ ہر مقام پر اسلام کی اثر انگیزی اور فروغ کا پہلا عامل خود قرآنِ مجید اور

اس کا مواد (content) ہے۔ لیکن اگر ہم قرآن سے صرفِ نظر کریں تو رسالتمآب کی شخصیت، اُن کا اخلاق، اُن کی سیرت، ان کا کردار، اُن کی قیادت اور تدبر اسلام کی ترقی اور اسکی اثرانگیزی کا دوسرا سبب ہے۔ حتیٰ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد آنحضرتؐ کی سوانح حیات، یعنی آپ کی سیرت، جو بعد میں تاریخ میں نقل ہوئی ہے (خود یہ تاریخی سیرت) اسلام کی ترقی کا بڑا سبب رہی ہے۔

آغازِ کلام میں ہم نے جس آیت کی تلاوت کی، اُس میں ارشاد ہوتا ہے:

"فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ."

اللہ اپنے نبیؐ سے خطاب کرتا ہے: اے رسولِ گرامی! آپ پر خدا کی رحمت کی وجہ سے، آپ پر لطفِ الٰہی کے سائے کے سبب آپ مسلمانوں کے ساتھ نرمی سے پیش آتے ہیں، آپ کے اندر نرمی پائی جاتی ہے، آپ خوش خلق ہیں، آپ ایک ایسی شخصیت کے مالک ہیں جو ہمیشہ مسلمانوں کے ساتھ نرمی، حلم، بردباری، حسنِ اخلاق، حسنِ رفتار، تحمل، عفو و درگزر وغیرہ سے پیش آتی ہے۔

"وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ."

اگر آپ اس اخلاق کے مالک نہ ہوتے، اگر آپ اس نرم خوئی کی جگہ، سخت گیر اور بداخلاق ہوتے، تو مسلمان آپ کے گرد سے دور ہو جاتے، یعنی خود آپ کا یہ اخلاق مسلمانوں کو جذب کرنے کا ایک عامل (factor) ہے۔

یہ بات خود اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ قائد، رہنما اور جو شخص لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتا اور اسکی طرف بلاتا ہے، اس کی صفات میں سے ایک صفت یہ ہے کہ وہ ذاتی اخلاق کے حوالے سے نرم مزاج ہو۔ یہاں ہم کچھ وضاحتیں پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ ذہنوں میں پیدا ہونے والے بعض سوالات کا جواب دیا جاسکے۔

ذاتی مسائل میں نرمی اور اصولی مسائل میں سختی

یہ جو ہم نے عرض کیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نرم طبیعت کے مالک تھے، اور ایک

رہبرورہنما کونرم خوہونا چاہئے'اس سے مراد یہ ہے کہ پیغمبر اسلامؐ انفرادی اور ذاتی مسائل میں نرم تھے'اصولی اور کلی مسائل میں نہیں'وہاں پیغمبر سو فیصد سخت تھے۔یعنی کسی لچک کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے۔ایک مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص نبی اکرمؐ کی ذات سے براسلوک کرتا ہے'مثلاً نبی کریمؐ کی ذات کی توہین کرتا ہے۔یہ مسئلہ آنحضرتؐ کی ذات سے متعلق ہے'اور ایک مرتبہ کوئی شخص اسلامی قانون کو توڑتا ہے'مثلاً چوری کرتا ہے۔یہ جو ہم کہتے ہیں کہ نبی اکرمؐ نرم خو تھے'اس سے کیا مراد ہے؟ کیا اسکے معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی شراب پیتا تھا'تو پیغمبر کہا کرتے تھے کہ کوئی بات نہیں'اسے کوڑے نہ لگاؤ'اسے سزا نہ دو؟! یہ باتیں پیغمبر کی ذات سے متعلق نہیں تھیں'ان کا تعلق اسلامی قانون سے تھا۔اگر کوئی چوری کرتا تھا'جب بھی کیا رسالتمآبؐ یہ کہا کرتے تھے کہ کوئی بات نہیں' اسے سزا دینے کی ضرورت نہیں؟ ہرگز ایسا نہ تھا۔پیغمبر اسلامؐ انفرادی اور ذاتی معاملات میں نرم تھے لیکن اجتماعی قواعد وضوابط اور ذمے داریوں کے معاملے میں انتہائی سخت تھے۔

ایک مثال عرض کرتے ہیں:

سرِ راہ ایک شخص آتا ہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا راستہ روک لیتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ آپ میرے مقروض ہیں'ابھی اسی وقت میرا قرض ادا کیجئے۔پیغمبرؐ فرماتے ہیں: پہلی بات تو یہ کہ میں تمہارا مقروض نہیں ہوں'تم بلاوجہ دعویٰ کررہے ہو'اور دوسری بات یہ کہ اس وقت میرے پاس رقم بھی نہیں ہے'مجھے جانے دو۔وہ کہتا ہے: میں آپ کو ایک قدم آگے نہیں بڑھنے دوں گا۔(رسولِ اکرمؐ نماز کے لئے جارہے تھے) آپ یہیں میرے پیسے دیجئے اور میرا قرض ادا کیجئے۔نبی کریمؐ اس سے انتہائی نرمی برت رہے تھے'وہ مزید سختی کرتا جارہا تھا'یہاں تک کہ وہ پیغمبرؐ کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیتا ہے اور آپ کی چادر کی رسی بنا کر آپ کی گردن میں ڈال کر اسے کھینچنا شروع کردیتا ہے'یہاں تک کہ آپ کی گردن پر سرخ نشان نمودار ہونے لگتا ہے۔جب دیر ہوجاتی ہے تو تاخیر کی وجہ جاننے کے لئے مسلمان آنے لگتے ہیں'وہ دیکھتے ہیں کہ ایک یہودی اس قسم کا دعویٰ کررہا ہے۔مسلمان اسکے ساتھ سختی سے نمٹنا چاہتے ہیں'لیکن نبی کریمؐ فرماتے ہیں: تم درمیان میں نہ آؤ'میں خود جانتا ہوں کہ اپنے اس دوست کے ساتھ کیسے نمٹنا ہے۔آپ نے اس قدر نرمی

سے کام لیا کہ وہ یہودی وہیں کہہ اٹھا کہ: اَشْھَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اَشْھَدُ اَنَّکَ رَسُوْلُ اللّٰہِ.
اور کہنے لگا کہ آپ اتنی طاقت رکھنے کے باوجود اتنی برداشت (کا مظاہرہ کرتے ہیں؟!) اتنی برداشت ایک عام انسان کے بس کی بات نہیں ہے' یہ پیغمبرانہ برداشت ہے۔

بظاہر فتحِ مکہ کا موقع ہے: قریش کے کسی بڑے خاندان کی ایک عورت نے چوری کی۔ اسلامی قانون کی رُو سے چور کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔ جب واقعہ ثابت اور قطعی ہوگیا اور عورت نے اقرار کرلیا کہ میں نے چوری کی ہے' تو اس کے بارے میں حکم کا نفاذ ہونا تھا۔ اس موقع پر سفارشیں اور وساطتیں شروع ہوگئیں۔ کسی نے کہا: یارسول اللہؐ! اگر ہوسکے تو سزا سے صرفِ نظر فرمائیں' یہ عورت فلاں شخص کی بیٹی ہے' اور آپ جانتے ہیں کہ وہ کتنا معزز انسان ہے' ایک معزز گھرانے کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ اس عورت کا باپ آیا' اُس کا بھائی آیا' اور لوگ آئے کہ ایک معزز گھرانہ بے عزت ہوجائے گا۔ لوگوں نے بہت کچھ کہا لیکن آپ نے فرمایا: ناممکن اور محال ہے' کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اسلامی قانون کو معطل کردوں؟! اگر یہی عورت کوئی بے کس عورت ہوتی اور کسی بڑے خاندان سے وابستہ نہ ہوتی' تو تم سب کہتے کہ ہاں چور ہے اسے سزا ملنی چاہئے۔ ایک لوٹا چوری کرنے والے کو سزا دی جائے' ایک غریب جس نے مثلاً اپنی غربت کی وجہ سے چوری کی ہو اسے سزا دی جائے' لیکن اس عورت کو اس وجہ سے کہ اس کا تعلق ایک بڑے خاندان سے ہے اور تم لوگوں کے بقول ایک معزز خاندان کی عزت خاک ہوجائے گی' سزا نہ دی جائے؟! خدا کا قانون معطل نہیں ہوسکتا۔ آپ نے کسی صورت سفارشوں اور شفاعتوں کو قبول نہ کیا۔

پس پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اصولی معاملات میں کسی صورت نرمی کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے' حالانکہ آپ ذاتی مسائل میں انتہائی نرم خو اور رحمدل تھے' اور غیر معمولی عفو و درگزر سے کام لیتے تھے۔ لہٰذا ان دونوں باتوں کو ایک دوسرے میں خلط ملط نہیں ہونا چاہئے۔

حضرت علی علیہ السلام انفرادی اور ذاتی مسائل میں انتہائی نرم دل' مہربان اور ہنس مکھ تھے' لیکن اصولی مسائل میں ذرہ برابر لچک نہ دکھاتے تھے۔ ہم دلیل کے طور پر دو نمونے پیش کرتے ہیں۔ حضرت علی علیہ السلام ایک کشادہ رو اور خوش مزاج انسان تھے' ہمارے اُن مقدس مآب لوگوں

کے برخلاف جو ہمیشہ لوگوں سے اپنے تقدس کی قیمت وصول کرنا چاہتے ہیں' ہمیشہ جن کے چہرے پر غصہ اور پیشانی پر بل رہتا ہے اور کبھی لبوں پر تبسم بکھیرنے کو تیار نہیں ہوتے' گویا ترش روئی تقدس اور تقویٰ کا لازمہ ہے۔ کہتے ہیں:

صبا از من بگو یار عبوساً قمطریراً را
نمی چسبی به دل زحمت مده صمغ و کتیرا را

ایسا کیوں ہو حالانکہ: اَلْمُؤمِنُ بِشْرُهُ فِي وَجْهِهِ وَ حُزْنُهُ فِي قَلْبِهِ. (۱) مومن کے چہرے پر بشاشت اور اسکے دل میں غم واندوہ ہوتا ہے۔ مومن اپنے غم واندوہ کو (ہر معاملے میں: غمِ دنیا' غمِ آخرت' انفرادی زندگی سے تعلق رکھنے والا غم' عالمِ آخرت سے متعلق غم' جو کچھ ہو) اپنے دل میں رکھتا ہے اور جب لوگوں کے سامنے آتا ہے تو اپنے چہرے سے خوشی کا اظہار کرتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح حضرت علی علیہ السلام بھی ہمیشہ لوگوں سے مسکراتے چہرے کے ساتھ ملا کرتے۔ آپ باطل کی حدود کا خیال رکھتے ہوئے لوگوں کے ساتھ مزاح کیا کرتے تھے' جیسا کہ پیغمبر اکرمؐ مزاح کرتے تھے۔ مولاؑ کے مخالفین نے آپ کو منصبِ خلافت سے دور رکھنے کے لئے آپ کا جو واحد عیب بیان کیا تھا (وہ کوئی واقعی عیب تو نکال نہیں سکتے تھے) وہ یہ تھا کہ ان لوگوں نے کہا: علیؑ کی برائی یہ ہے کہ وہ ہنستے مسکراتے اور مزاح کرنے والے انسان ہیں' خلیفہ ایسے شخص کو بنانا چاہئے جس کا چہرہ غصیلہ ہو اور لوگ اس سے خوفزدہ رہیں' جب اسے دیکھیں تو بلا وجہ ہی اس سے ڈرتے رہیں۔ پس پیغمبرؐ ایسے کیوں نہیں تھے؟ خداوند عالم پیغمبرؐ کے بارے میں فرماتا ہے:

"فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللهِ لِنْتَ لَهُمْ وَ لَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ."

اگر آپ سخت گیر' غصیلے اور سنگدل ہوتے' تو مسلمانوں کو جذب نہیں کرسکتے تھے اور وہ آپ سے دور ہو جاتے۔ لہٰذا اسلام قیادت اور رہبری کے لئے جس روش کو' جس انداز کو اور جس منطق کو

۱۔ نہج البلاغہ۔ کلمات حکمت ۳۳۳

پسند کرتا ہے وہ نرم ہونا' خوش اخلاق ہونا اور پرکشش ہونا ہے' نہ کہ غصیلہ اور سخت مزاج ہونا' جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام خلیفۂ دوم کے بارے میں فرماتے ہیں:

"فَصَيَّرَهَا فِيْ حَوْزَةٍ خَشْنَآءَ يَغْلُظُ كُلَامُهَا وَ يَخْشُنُ مَسُّهَا وَ يَكْثُرُ الْعِثَارُ فِيْهَا. وَالْاِعْتِذَارُ مِنْهَا." (۱)

ابوبکر نے خلافت ایک ایسے شخص کے سپرد کردی جس کا مزاج سخت تھا' لوگ اس سے ڈرتے تھے' سخت گیر (ہمارے مقدس مآب لوگوں کی طرح) اور تند خو ایسے کہ ابن عباس کہتے ہیں' جب تک عمر زندہ رہے میں فلاں مسئلے کے ذکر اور اس پر گفتگو کی جرأت نہ کر سکا' اور میں نے کہا: دِرَّةُ عُمَرَ اَهْيَبُ مِنْ سَيْفِ حَجَّاج. عمر کے کوڑے کی ہیبت حجاج کی تلوار سے زیادہ تھی۔ ایسا کیوں ہونا چاہیے؟! علیؑ ذاتی معاملات میں خندہ رو تھے' مزاح کیا کرتے تھے' لیکن اصولی مسائل میں بے لچک تھے۔ ان کے بھائی عقیل چند دنوں تک اپنے بچوں کو بھوکا رکھتے ہیں' تا کہ ماحول بنا سکیں' ان بے چارے بچوں کو اس قدر بھوکا رکھتے ہیں کہ بھوک سے ان کے چہرے سیاہ پڑ جاتے ہیں كَالْعِظْلِم. (۲) اسکے بعد حضرت علیؑ کو دعوت دیتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ آپ اپنے بھائی کے ان بھوکے بچوں کو دیکھئے' میں مقروض ہوں' بھوکا ہوں' میرے پاس کچھ نہیں' میری مدد کیجئے۔ آپ فرماتے ہیں: "ٹھیک ہے' مجھے بیت المال سے جو حصہ ملتا ہے' میں اس میں سے تمہیں دے دوں گا۔" {عقیل کہتے ہیں} بھائی جان! آپ کو ملتا ہی کیا ہے؟! کتنا آپ خرچ کریں گے اور کتنا مجھے ملے گا؟! آپ حکم دیجئے کہ مجھے بیت المال میں سے کچھ دیا جائے۔ حضرت علیؑ حکم دیتے ہیں کہ لوہے کو گرم اور سرخ کریں' پھر آپ یہ گرم اور سرخ لوہا عقیل کے سامنے کر دیتے ہیں جو نابینا تھے' اور فرماتے ہیں: بھائی اٹھالو! عقیل سمجھتے ہیں کہ رقم کی تھیلی ہے۔ جوں ہی ہاتھ آگے بڑھاتے ہیں وہ جل جاتا ہے۔ خود عقیل کہتے ہیں کہ میں ایک گائے کی طرح چلا اٹھا۔ جب وہ چلائے

۱۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۳۔ شقشقیہ

۲۔ جیسے نیل پڑے ہوں۔

تو آپ نے فرمایا:

"ثَکِلَتْکَ الثَّوَاکِلُ یَا عَقِیْلُ، اَتَئِنُّ مِنْ حَدِیْدَةٍ اَحْمَاهَا اِنْسَانُهَا لِلَعِبَهٖ، وَ تَجُرُّنِیْ اِلٰی نَارٍ سَجَرَهَا جَبَّارُهَا لِغَضَبِهٖ." (۱)

وہی علیؑ جو ذاتی اور انفرادی مسائل میں اس قدر نرم ہیں، اصولی مسائل میں، اُن مسائل میں جن کا تعلق قوانینِ الٰہی اور حقوقِ اجتماعی سے ہے اس حد تک سخت گیر ہیں۔ اور وہی عمر جو انفرادی مسائل میں اتنے سخت گیر تھے اور اپنی بیوی کے ساتھ بھی سخت رویہ رکھتے تھے، اپنے بیٹے کے ساتھ بھی سخت طرزِ عمل رکھتے تھے، اپنے ملنے والوں کے ساتھ سختی سے پیش آتے تھے، وہ اصولی مسائل میں نرم رو تھے۔ بیت المال میں امتیاز برتنے کا سلسلہ حضرت عمر ہی کے دور سے شروع ہوا۔ ایک قسم کی مصلحت اور سیاست کو پیش نظر رکھتے ہوئے مسلمانوں کے مختلف حصے مقرر کیے گئے۔ یعنی سیرتِ رسولؐ کے برخلاف۔ وہ اصولی مسائل میں لچکدار اور انفرادی مسائل میں سخت رویہ اختیار کرتے تھے، حالانکہ نبی اکرمؐ اور حضرت علیؑ انفرادی مسائل میں نرم مزاج اور اصولی مسائل میں سخت گیر تھے۔ قرآن مجید کہتا ہے: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللهِ لِنْتَ لَهُمْ پروردگار کے لطف کی وجہ سے مسلمانوں کے ذاتی اور انفرادی مسائل میں آپ کا رویہ نرم ہے اور اسی لئے آپ نے مسلمانوں کو جذب کیا ہوا ہے اور اگر آپ ایک سخت اور سنگدل انسان ہوتے، تو مسلمان آپ کے گرد سے چھٹ جاتے۔ فَاعْفُ عَنْهُمْ. عفو و درگزر سے کام لیجئے (عفو و درگزر سے کام لینا بھی ایک قسم کی نرمی ہے) وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ. مسلمانوں کے لئے استغفار اور مغفرت طلب کیجئے۔ جب وہ کوئی لغزش کر کے آپ کے پاس آئیں، تو آپ ان کے لئے دعا کیجئے، مغفرت طلب کیجئے۔

۱۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۲۲۱۔ (اے عقیل! رونے والیاں تم پر روئیں، کیا تم اس لوہے کے ٹکڑے سے چیخ اٹھے ہو جسے ایک انسان نے ہنسی مذاق میں تپایا ہے، اور مجھے تم اُس آگ کی طرف کھینچ رہے ہو جسے خداوند جبار نے اپنے غضب سے بھڑکایا ہے؟!)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلمانوں کے ساتھ اس قدر نرم رویہ رکھتے تھے کہ تعجب ہوتا ہے۔ مسلمان غیر معمولی طور پر پیغمبر اکرم پر فریفتہ اور ان کے دلدادہ تھے۔ پیغمبر اکرمؐ مسلمانوں کے ساتھ اس قدر گھل مل کر رہتے تھے کہ مثلاً کسی عورت کے یہاں بچے کی ولادت ہوتی' تو وہ دوڑی دوڑی آتی اور کہتی: یا رسول اللہؐ! میرا دل چاہتا ہے کہ آپ میرے بچے کے کان میں اذان اور اقامت کہیں' یا ایک دوسری عورت آتی اور اپنے سال بھر کے بچے کو آنحضرتؐ کی خدمت میں لاکر کہتی: یا رسول اللہؐ! میرا دل چاہتا ہے کہ کچھ دیر میرے بچے کو اپنے زانو پر بٹھالیں اور اس پر نظر ڈالیں تاکہ برکت ہو' یا میرے بچے کے لئے دعا کیجئے۔ اور آپؐ فرماتے: اچھا' ٹھیک ہے۔

حدیث ہے' شیعہ اور سنی دونوں نے روایت کی ہے کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کوئی بچہ پیغمبر اکرمؐ کی گود میں پیشاب کر دیتا۔ جب وہ پیشاب کرنا شروع کرتا تو اسکے ماں باپ پریشان اور غضبناک ہو کر دوڑتے تاکہ بچے کو رسول اللہ کی گود سے لے لیں۔ آپ فرماتے: لَا تُزْرِمُوا۔ نہیں' نہیں' ایسا نہ کرو' بچہ ہے' اس کو پیشاب آرہا ہے' ایسا نہ کرو جس سے وہ پیشاب روک لے' یہ بیماری کا سبب ہو سکتا ہے۔ یہ وہ مسئلہ ہے جو آج کے علمِ طب اور نفسیات میں ثابت ہو چکا ہے کہ یہ عمل بہت بڑی غلطی ہے۔ کبھی ماں باپ اپنے بچے کو کسی جگہ بٹھائے ہوئے ہوتے ہیں' یہ بچہ پیشاب کر دیتا ہے' اپنے بچے کا پیشاب روکنے کے لئے فوراً اسے غصے سے دور پھینک دیتے ہیں' یا اس کو برا بھلا کہنے لگتے ہیں' {ایسا کرنے سے} بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس بچے کو ایسی بیماری لاحق ہو جاتی ہے جس کا اثر پوری زندگی نہیں جاتا' کیونکہ اس میں ایک ہیجان اور گمراہی کی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ بچے کے اعتبار سے پیشاب کرنا ایک طبیعی امر ہے' لیکن اس پر اس کے ماں یا باپ شدید ردِ عمل کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کی طبیعت کہتی ہے کہ پیشاب کرو' باپ یا ماں کا حکم کہتا ہے کہ پیشاب نہ کرو' جس کے نتیجے میں وہ ہیجان' اضطراب اور نفسیاتی عدمِ توازن کا شکار ہو جاتا ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس حد تک (نرم خو تھے)۔

مشاورت

وَشَاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ ۔ یہ بھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نرم اخلاق کا ایک انداز تھا۔ (قرآن کہتا ہے) اے ہمارے نبیؐ اے ہمارے عزیز! کاموں کے دوران مسلمانوں سے مشورہ کیجئے۔

کس قدر عجیب بات ہے! وہ پیغمبر ہیں' اُنہیں مشورے کی ضرورت نہیں' ایسا قائد مشورہ کرتا ہے جسے مشورے کی ضرورت ہو۔ اُنہیں تو مشورے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ لیکن اس لئے کہ اس اصول کی بنیاد نہ پڑ جائے کہ بعد میں جو بھی حکمراں اور قائد بنے (اسکے بارے میں کہیں کہ) وہ دوسروں سے بالاتر ہے' اس کا کام حکم صادر کرنا اور دوسروں کا کام اس حکم کی تعمیل کرنا ہے' مشورہ بے معنی ہے' (لہٰذا آپ مشورہ کیا کرتے تھے)۔ حضرت علیؑ بھی مشورہ کیا کرتے تھے' پیغمبر بھی مشورہ کیا کرتے تھے۔ انہیں مشورے کی کوئی ضرورت نہیں تھی' لیکن پھر بھی مشورہ کیا کرتے تھے' اس لئے تاکہ اوّلاً دوسرے سیکھیں اور ثانیاً مشورہ لے کر اپنے ساتھیوں اور پیروکاروں کو اہمیت دیتے تھے۔ جو قائد مشورہ کئے بغیر (اگرچہ اسے اپنی رائے کے صحیح ہونے کا سو فیصد یقین ہو) فیصلہ کرتا ہے' اس کے پیروکاروں کے کیا احساسات ہوتے ہیں؟ وہ کہتے ہیں: معلوم ہوتا ہے ہماری حیثیت ایک آلۂ کار کی سی ہے' بے روح اور بے جان آلۂ کار۔ لیکن جب خود انہیں بھی معاملات میں شریک کیا جائے' اُن پر واضح کیا جائے' اور فیصلے میں شامل کیا جائے' تو انہیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اُن کی بھی حیثیت ہے' جس کے نتیجے میں وہ بہتر طور پر پیروی کرتے ہیں۔

"وَشَاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ "(۱)

اے رسول! ایسا نہ ہو کہ تمہارے مشورے کی نوعیت ایسی ہو جائے کہ تم تردد کا شکار انسانوں کی طرح ہو جاؤ' فیصلہ کرنے سے پہلے مشورہ کرو' لیکن قائد جب فیصلہ کر لے' تو پھر اس کا فیصلہ اٹل

۱۔ سورۂ آل عمران ۳۔ آیت ۱۵۹ {اور ان سے مشورہ کرو اور جب فیصلہ کر لو تو اللہ پر بھروسہ کرو۔}

ہونا چاہئے۔ فیصلہ کر لینے کے بعد ایک شخص اٹھ کر کہے کہ اگر ایسا کیا جائے تو کیسا ہے؟ دوسرا کہے اس طرح کریں تو کیسا ہے؟ تو ان کے جواب میں کہنا چاہئے: نہیں' فیصلہ ہو چکا ہے' بات ختم ہو چکی ہے۔ فیصلے سے پہلے مشورہ اور فیصلے کے بعد اس پر جمے رہنا۔ فیصلہ کر لینے کے بعد خدا پر توکل کرو اور اپنا کام شروع کر دو اور خدائے متعال سے مدد طلب کرو۔

یہ نکتہ جو ہم نے عرض کیا' دعوت اور تبلیغ کی بحث کے حوالے سے تھا۔ دعوت اور تبلیغ کا ایک اصول نرمی' ملائمت اور ہر قسم کی بے جا سختی' زبردستی اور جبر سے پرہیز ہے۔

خود قیادت اور رہبری کا مسئلہ سیرتِ نبویؐ میں ایک مستقل اور جداگانہ مسئلہ ہے۔ اگر ہم علیحدہ علیحدہ کر کے سیرتِ نبوی بیان کرنا چاہیں' تو اس کا ایک موضوع معاشرے کی قیادت اور رہبری کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریقہ کار ہے۔ اس کے بارے میں ہم نسبتاً عرض کر چکے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ کی رہنمائی کا انداز کیا تھا اور اسی طرح حضرت علی علیہ السلام کس انداز سے یہ عمل انجام دیتے تھے۔ بہر صورت قیادت و رہنمائی کے سلسلے میں پیغمبر اکرمؐ کی روش خود ایک جداگانہ موضوعِ بحث ہے اور ان شاء اللہ شاید سیرتِ نبوی کی کسی اور مجلس میں ہم اس پر گفتگو کریں اور قیادت و رہبری کے باب میں سیرتِ نبوی کے دوسرے پہلو عرض کریں۔ فی الحال ہماری گفتگو دعوت اور تبلیغ کے حوالے سے ہے۔

دعوت و تبلیغ میں سختی اور دُرشتی سے پرہیز

دعوت کو سختی اور دُرشتی کے ساتھ نہیں ہونا چاہئے' بالفاظِ دیگر دعوت و تبلیغ جبر اور زبردستی کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ ایک مسئلہ جو بہت پوچھا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ کیا اسلامی دعوت کی بنیاد زور اور زبردستی پر ہے؟ یعنی اسلام پر ایمان کی بنیاد زبردستی پر استوار ہے؟ یہ وہ بات ہے جس کا عیسائی پادریوں نے دنیا میں غیر معمولی پروپیگنڈہ کیا ہے۔ انہوں نے اسلام کا نام دینِ شمشیر رکھ دیا ہے۔ یعنی ایسا دین جو صرف تلوار سے کام لیتا ہے۔ بے شک اسلام تلوار کا دین بھی ہے اور یہ اسلام کی خوبی ہے کمزوری نہیں۔ لیکن جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ "اسلام تلوار کا دین ہے" وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ

اسلام نے اپنی دعوت میں جس چیز سے استفادہ کیا وہ تلوار ہے یعنی جیسا کہ قرآنِ مجید فرماتا ہے:

"اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَ الْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَ جَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ." (۱)

وہ لوگ اس طرح یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں جیسے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم یہ تھا کہ: اُدْعُ بِالسَّیْفِ. {تلوار کے ذریعے دعوت دیں} اب کوئی نہیں ہے جو ان سے یہ کہے کہ پھر قرآنِ مجید یہ کیوں کہتا ہے کہ: اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَ الْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَ جَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ. اور نبی اکرمؐ بھی اپنے عمل میں ایسے ہی تھے۔ یہ لوگ غیر متعلقہ باتوں کو گڈمڈ کر کے کہتے ہیں کہ اسلام اُدْعُ بِالسَّیْفِ. کا دین ہے' تلوار سے دعوت و تبلیغ کرنے کا حکم دیتا ہے۔ حتیٰ وہ اپنی بعض کتابوں میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توہین بھی کرتے ہیں' ایک ایسے شخص کا کارٹون بناتے ہیں جس کے ایک ہاتھ میں قرآن ہے اور دوسرے ہاتھ میں تلوار' اور وہ لوگوں کے سروں پر کھڑا کہہ رہا ہے کہ اس قرآن پر ایمان لے آؤ ورنہ میں تمہاری گردن اڑا دوں گا۔ پادریوں نے دنیا میں یہ کام بہت کیا ہے۔

خدیجہؓ کا مال اور علیؑ کی تلوار

آپ کی خدمت میں یہ بات بھی عرض کردوں: کبھی ہم مسلمان خود ایسی باتیں کر جاتے ہیں جو نہ تاریخ سے مطابقت رکھتی ہیں اور نہ قرآنِ مجید سے' بلکہ وہ دشمنوں کی باتوں سے مطابقت رکھتی ہیں۔ یعنی ایک ایسی بات کو جس کا ایک پہلو درست ہے' ہم اس طرح بیان کرتے ہیں کہ دشمن کو موقع مل جاتا ہے' جیسے بعض لوگ کہتے ہیں: اسلام دو چیزوں سے پھیلا ہے' خدیجہؓ کے مال سے اور علیؑ کی تلوار سے' یعنی زور اور زر سے۔ اگر کوئی دین زور اور زر سے آگے بڑھا ہو' تو وہ کیسا دین

۱۔ سورۂ نحل ۱۶۔ آیت ۱۲۵ {آپ اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعے دعوت دیں اور ان سے اس طریقے سے بحث کریں جو بہترین طریقہ ہے۔}

ہوگا؟! کیا قرآنِ مجید میں کسی مقام پر ہے کہ دین اسلام نے مال اور طاقت کی بنیاد پر ترقی کی ہے؟! کیا حضرت علی علیہ السلام نے کسی مقام پر کہا ہے کہ دین نے مال اور طاقت کے بل بوتے پر ترقی کی ہے؟! بے شک خدیجہؓ کا مال مسلمانوں کے کام آیا' لیکن کیا خدیجہؓ کا مال دعوتِ اسلام میں صرف ہوا؟ یعنی خدیجہؓ کے پاس بہت پیسہ تھا' لوگوں کو خدیجہؓ کا پیسہ دیا گیا اور اُن سے کہا گیا کہ آؤ مسلمان ہو جاؤ؟ کیا انسان کو تاریخ میں کسی مقام پر ایسی بات نظر آتی ہے؟ یا نہیں' جن حالات میں مسلمان اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انتہائی تنگدستی اور سخت دباؤ میں تھے' ان حالات میں جناب خدیجہؓ نے اپنا مال و دولت حضورؐ کے حوالے کر دیا لیکن اس لئے نہیں کہ العیاذ باللہ پیغمبر کسی کو رشوت دیں' اور تاریخ بھی کسی جگہ کسی ایسی بات کی نشاندہی نہیں کرتی۔ وہ مال اتنا زیادہ تھا بھی نہیں' اور اُس زمانے میں اتنی زیادہ دولت ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ بی بی خدیجہؓ کے پاس بہت دولت تھی' یہ دولت اس دولت کے مقابلے میں زیادہ تھی جو اس زمانے میں اس علاقے میں ہوا کرتی تھی' نہ کہ مثلاً تہران کے کسی ارب پتی کی دولت کے مقابلے میں کہ ہم کہیں کہ وہ کسی تہرانی سرمایہ دار کی طرح تھیں۔ مکہ ایک چھوٹا سا شہر تھا' البتہ وہاں کچھ تاجر اور سوداگر ہوا کرتے تھے' سرمایہ دار بھی تھے' لیکن مکہ کے سرمایہ دار مثلاً نیشاپور کے سرمایہ داروں کی طرح تھے نہ کہ تہران یا اصفہان یا مشہد وغیرہ کے سرمایہ داروں کی طرح۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر خدیجہؓ کا مال نہ ہوتا تو شاید غربت اور تنگدستی مسلمانوں کو بے بس کر دیتی۔ خدیجہؓ کے مال نے خدمت کی لیکن رشوت دہی کے کام نہیں آیا کہ کسی کو پیسے دے کر مسلمان کیا ہو' بلکہ اس معنی میں خدمت کی کہ بھوک سے مسلمانوں کو نجات دلائی اور خدیجہؓ کے پیسوں سے مسلمانوں نے اپنے آپ کو بے دست و پا ہو جانے سے بچایا۔

بے شک حضرت علی علیہ السلام کی تلوار نے اسلام کی خدمت کی ہے' اور اگر اُن کی تلوار نہ ہوتی' تو اسلام کا مقدر کچھ اور ہوتا' لیکن ایسا نہیں تھا کہ علیؑ کی تلوار جا کر کسی کے سر پر کھڑی ہو جاتی ہو اور کہتی ہو کہ یا تو مسلمان ہو جاؤ ورنہ تمہاری گردن اڑا دوں گی' بلکہ جب دشمن کی تلوار اسلام کے خاتمے کے لئے اٹھتی تھی تو ایسے حالات میں علیؑ ہی تھے جو دشمن کے مقابلے میں ڈٹ جاتے تھے۔

کن مواقع پر علیؑ کی تلوار کام آئی' یہ جاننے کے لئے اتنا ہی کافی ہوگا کہ ہم بدر' احد یا خندق کی جنگوں کو مدِنظر رکھیں۔

جنگِ خندق میں مسلمان کفارِ قریش اور ان کے حلیف قبیلوں کے ذریعے گھیر لئے جاتے ہیں' دس ہزار مسلح افراد مدینہ کا محاصرہ کر لیتے ہیں' مسلمان معاشرتی اور اقتصادی اعتبار سے سنگین حالات کا شکار ہو جاتے ہیں اور بظاہر ان کے لئے امید کی کوئی راہ باقی نہیں رہتی۔ بات یہاں تک جا پہنچتی ہے کہ عمرو بن عبدود وہ خندق بھی عبور کر لیتا ہے جو مسلمانوں نے اپنے گرد کھودی ہوتی ہے۔ البتہ یہ خندق مدینے کے چاروں طرف نہیں تھی' کیونکہ مدینہ کے اطراف میں اتنے پہاڑ ہیں کہ کئی مقامات پر خندق کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ مدینہ کے شمال میں اسی احد کے راستے میں ایک خم دار گڑھا تھا جسے مسلمانوں نے دو پہاڑیوں کے درمیان کھودا تھا' کیونکہ قریش بھی مدینہ کے شمال کی جانب سے آئے تھے اور اس طرف سے آنے کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ خندق کے ایک طرف مسلمان تھے اور دوسری جانب کفار۔ عمرو بن عبدود ایک ایسا مقام تلاش کر لیتا ہے جہاں سے خندق کی چوڑائی کچھ کم تھی' اس کے پاس ایک طاقتور گھوڑا تھا' خود وہ اور اس کے چند ساتھی خندق عبور کر کے اس طرف آ جاتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کے سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور ھَلْ مِنْ مُبَارِز کی صدا بلند کرتا ہے۔ کسی مسلمان میں باہر نکلنے کی جرأت نہیں ہوتی' کیونکہ ہر ایک کو یقین تھا کہ وہ اگر اس کے سامنے گیا تو مارا جائے گا۔ حضرت علیؑ جن کی عمر اس وقت بیس برس سے کچھ زیادہ تھی' اپنی جگہ سے اٹھتے ہیں: اے اللہ کے رسولؐ! مجھے اجازت دیجئے۔ فرمایا: علیؑ بیٹھ جاؤ۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چاہتے تھے کہ تمام اصحاب پر اتمامِ حجت ہو جائے' عمرو نے گھوڑے کو ادھر اُدھر گھمایا' دوڑایا اور دوبارہ آ کر کہا: ھَلْ مِنْ مُبَارِزٍ؟ کسی ایک فرد نے بھی نے جواب نہ دیا۔ کسی میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی' کیونکہ وہ ایک غیر معمولی انسان تھا۔ حضرت علیؑ اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے: اے اللہ کے رسولؐ! میں۔ فرمایا: علیؑ بیٹھ جاؤ۔ تیسری یا چوتھی مرتبہ میں عمرو نے ایک ایسا رجز پڑھا جس نے مسلمانوں کے تن بدن میں آگ لگا دی' اور سب کو تکلیف پہنچائی۔ بولا:

وَلَقَدْ بَحَحْتُ مِنَ النِّدَاءِ بِجَمْعِكُمْ هَلْ مِنْ مُبَارِزٍ
وَوَقَفْتُ اِذْ جَبُنَ الْمُشَجِّعُ مَوْقِفَ الْقِرْنِ الْمُنَاجِزِ
اِنَّ السَّمَاحَةَ وَالشَّجَا
عَةَ فِي الْفَتَىٰ خَيْرُ الْغَرَائِزِ. (۱)

اس نے کہا: ہل من مبارز کہتے کہتے اب تو میرا حلق خشک ہو گیا ہے' کیا یہاں ایک بھی مرد نہیں ہے؟! اے مسلمانو! تمہارا دعویٰ تو یہ ہے کہ تمہارے مقتول جنت میں جاتے ہیں اور ہمارے مارے جانے والے جہنم میں' تم میں سے کوئی ایک مرد تو سامنے آئے جو یا تو قتل کر کے جہنم میں بھیج دے یا قتل ہو کر جنت میں چلا جائے۔ حضرت علیؑ اپنی جگہ سے اٹھے اور آگے بڑھے۔ حضرت عمر نے مسلمانوں کی طرف سے عذر پیش کرنے کی غرض سے کہا: یا رسول اللہ! اگر کوئی نہیں اٹھا تو حق بجانب ہے' کیونکہ یہ شخص ایک ہزار افراد کے برابر ہے' جو کوئی اس کا سامنا کرے گا وہ مارا جائے گا۔ بات یہاں تک پہنچی کہ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا: بَرَزَ الْاِسْلَامُ كُلُّهُ اِلَى الشِّرْكِ كُلِّهِ. (۲) کُل اسلام کُل کفر کے مقابل آ گیا ہے۔ یہ وہ موقع ہے جب حضرت علی علیہ السلام عمرو بن عبدود کو ڈھیر کر کے' اسلام کو نجات دلاتے ہیں۔

پس جب ہم کہتے ہیں کہ اگر علیؑ کی تلوار نہ ہوتی' تو اسلام نہ ہوتا' تو اسکے معنی یہ نہیں ہوتے کہ علیؑ کی تلوار نے لوگوں کو زبردستی مسلمان بنایا۔ بلکہ اسکے معنی یہ ہیں کہ اگر اسلام کے دفاع کے لئے علیؑ کی تلوار نہ ہوتی' تو دشمن اسلام کی جڑیں اکھاڑ پھینکتا' اسی طرح اگر بی بی خدیجہؑ کا مال نہ ہوتا' تو فقر وافلاس مسلمانوں کو نابود کر دیتا۔ یہ بات کہاں اور وہ بیہودہ باتیں کہاں؟!

توحید کا دفاع

اسلام تلوار کا دین ہے' لیکن اس کی تلوار ہمیشہ مسلمانوں کی جان' یا اُن کے مال' یا اُن کی

۱۔ بحار الانوار۔ ج ۲۰۔ ص ۲۰۳
۲۔ بحار الانوار۔ ج ۲۰۔ ص ۲۱۵

سرزمین' یا اگر توحید خطرے میں پڑ جائے تو اسکے دفاع کے لئے تیار رہتی ہے۔ علامہ طباطبائی علیہ الرحمہ نے اس (توحید کے دفاع) کے بارے میں تفسیر المیزان میں سورۂ بقرہ کی قتال سے متعلق آیات میں بھی اور آیت لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ. کے ذیل میں بھی گفتگو کی ہے۔

جی ہاں' اسلام ایک بات کو انسانیت کا حق سمجھتا ہے' جس مقام پر بھی توحید کو خطرہ لاحق ہو' وہاں اسلام توحید کو اس خطرے سے نجات دلانے کی کوشش کرتا ہے۔ کیونکہ توحید گرانقدر ترین انسانی حقیقت ہے۔ وہ حضرات جو آزادی کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں' انہیں یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ توحید اگر آزادی سے بڑھ کر نہیں تو کم از کم اس کی حد میں تو ہے اور یقیناً اس سے بڑھ کر ہی ہے۔ اس بات کو ہم نے بارہا مجالس میں بیان کیا ہے کہ: اگر کوئی اپنی جان کا دفاع کرتا ہے' تو کیا آپ اس دفاع کو درست مانتے ہیں یا غلط؟ اگر آپ کی جان پر حملہ کیا جائے' تو کیا آپ یہ کہیں گے کہ چھوڑو جو کرتا ہے کرنے دو' مجھے طاقت کا سہارا نہیں لینا چاہئے' چھوڑو اسے مجھے قتل کرنے دو؟ نہیں۔ اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ اگر کسی کی عزت کو خطرہ لاحق ہو تو اسے دفاع کرنا چاہئے' اگر کسی کا مال و دولت حملے کی زد پر ہو' تو اسے دفاع کرنا چاہئے' اگر کچھ لوگوں کی سرزمین پر حملہ ہو جائے' تو انہیں دفاع کرنا چاہئے۔

یہاں تک کسی کو اعتراض نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر کسی مظلوم کی جان' یا مال' یا سرزمین پر کسی ظالم کی جانب سے حملہ ہو جائے' تو کیا ایسی صورت میں مظلوم کے دفاع میں کسی تیسرے شخص کی شرکت درست ہے یا نہیں؟ نہ صرف درست ہے بلکہ اپنی ذات کے دفاع سے بڑھ کر ہے' کیونکہ اگر انسان اپنی آزادی کا دفاع کرتا ہے' تو اس نے اپنا دفاع کیا ہے' لیکن اگر وہ دوسرے کی آزادی کا دفاع کرے' تو اس نے آزادی کا دفاع کیا ہے' جو کہیں زیادہ مقدس عمل ہے۔

مثلاً اگر ایک شخص یورپ سے نکلے اور ویت نامیوں کے دفاع لئے جائے اور امریکیوں سے جنگ کرے' تو آپ اسے ایک ویتنامی سے ہزار درجہ زیادہ عزت دیں گے' اور کہیں گے کہ دیکھئے یہ کتنا عظیم انسان ہے! باوجود یہ کہ خود اسے کوئی خطرہ نہیں ہے' وہ اپنے ملک سے نکل کر دوسروں کی

آزادی' دوسروں کی جان' دوسروں کے مال' دوسروں کی سرزمین کا دفاع کرنے کے لئے وہاں جا رہا ہے۔ یہ ہزار درجہ عظیم تر ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ آزادی مقدس چیز ہے۔

اگر کوئی علم کے دفاع کے لئے لڑے' تو کیسا ہے؟ اُسی طرح ہے۔ (کسی مقام پر علم خطرے میں پڑ جائے' کوئی انسان اس لئے علم کو نجات دلانے کے لئے جنگ کرے کہ علم جو انسانیت کے لئے ایک مقدس چیز ہے وہ خطرے سے دوچار ہے)

صلح کی حفاظت کے لئے جنگ کرنا کیسا ہے؟ وہ بھی اسی طرح ہے۔

توحید ایک ایسی حقیقت ہے جو میری یا آپ کی نہیں' بلکہ انسانیت کی ملکیت ہے۔ اگر کسی جگہ توحید کو خطرہ لاحق ہو (کیونکہ توحید انسانی فطرت کا حصہ ہے اور انسانی فکر کبھی بھی اسے توحید کے خلاف نہیں لے جاتی' بلکہ ایسے موقع پر کوئی اور عامل کارفرما ہوتا ہے) تو اسلام توحید کی نجات کے لئے اقدام کا حکم دیتا ہے' لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ توحید کو طاقت کے زور پر لوگوں کے دلوں میں داخل کرنا چاہتا ہے' بلکہ وہ عوامل جو توحید کے خاتمے کا سبب بنے ہیں' انہیں ختم کرنا چاہتا ہے۔ جب وہ عوامل دور ہو جائیں گے' تو انسانی فطرت توحید کی جانب مائل ہو جائے گی۔ مثلاً جب تقلیدیں' تلقینیں' بت خانے' بت کدے اور ایسی چیزیں جن کی وجہ سے انسان توحید کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا دور کر دی جائیں' تو لوگوں کی فکر آزاد ہو جاتی ہے۔ وہ تعبیر جو قرآن نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں بیان کی ہے' اس میں قرآن مجید کہتا ہے کہ جس دن لوگ شہر سے نکل گئے اور شہر کو خالی کر گئے اور بت کدہ بھی خالی تھا' تو ابراہیم گئے اور بتوں کو توڑ دیا اور کلہاڑی کو سب سے بڑے بت کی گردن میں ڈال دیا۔ لوگ جب رات کو لوٹے اور دعائیں مانگنے اور اظہار اخلاص کے لئے بتوں کے پاس آئے' تو دیکھا کہ وہاں کوئی بھی بت نہیں' سب ٹکڑے ٹکڑے' چورہ چورہ ہو چکے ہیں' صرف بڑا بت ایک کلہاڑی کے ساتھ موجود ہے۔ بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس بڑے بت نے ان چھوٹے بتوں کو مار پیٹ کر ختم کر دیا ہے۔ لیکن انسانی فطرت اس بات کو قبول نہیں کرتی۔ یہ سب کس نے کیا ہے؟ **قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ.** وہ لوگ حضرت ابراہیمؑ کے پاس آتے ہیں۔ **ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا**

یَآاِبْرَاهِیمُ ہمارے ان محبوب بتوں کے ساتھ تم نے یہ سلوک کیا ہے؟ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ کَبِیْرُهُمْ هٰذَا فَاسْئَلُوْهُمْ اِنْ کَانُوْا یَنْطِقُوْنَ. یہ اس بڑے بت کی حرکت ہے' اُسی سے پوچھو۔ وہ کہنے لگے: وہ تو بول نہیں سکتا۔ حضرت ابراہیمؑ نے کہا: اگر وہ بول نہیں سکتا تو پھر تم کس چیز کی پرستش کرتے ہو؟! قرآنِ مجید کہتا ہے: فَرَجَعُوْآ اِلٰی اَنْفُسِهِمْ (۱) یہ جواب سن کر انہوں نے اپنے دلوں کی طرف رجوع کیا۔

عقیدے کی آزادی

ہم نے بارہا یہ بات کہی ہے کہ جو لوگ عقیدے کی آزادی کے نام پر بت خانوں میں جاتے ہیں اور وہاں کچھ نہیں بولتے (درحقیقت یہ لوگ اسیری کا احترام کرتے ہیں)۔ برطانیہ کی ملکہ ہندوستان گئی' تو ہندوؤں کے عقائد کے احترام کی خاطر اگر خود ہندو اپنے مندر کے دروازے پر جوتے اتارتے تھے' تو ملکہ نے گلی میں داخل ہوتے ہی بتوں کے احترام میں جوتے اتار دیئے (تاکہ وہ) تعجب کا اظہار کریں اور کہیں کہ یہ لوگ لوگوں کے عقائد کا کس قدر احترام کرتے ہیں!

جو عقیدہ انسان کو فکر نہ دے' وہ عقیدہ جمود ہے' تقلید ہے' رسم ہے' یعنی ایسی زنجیر ہے جو وہم (بے بنیاد تصورات) نے انسان کے ہاتھوں پیروں میں ڈال دی ہے۔ انسان کو ایسے عقائد میں آزاد چھوڑ دینے کے معنی یہ ہیں کہ انسان کو وہم کی انہی زنجیروں کا اسیر رہنے دیا جائے جن سے اُس نے خود اپنے ہاتھوں پیروں کو باندھا ہے۔ اسے اسیری کا احترام تو کہا جا سکتا ہے' آزادی کا احترام نہیں۔ آزادی کا احترام یہ ہے کہ یہ عقائد جو فکر نہیں بلکہ عقیدہ ہیں' یعنی صرف جمود ہیں' ان کے خلاف جنگ کی جائے۔ ممکن ہے عقیدہ کسی فکر کی بنیاد پر ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ تقلید' یا وہم' یا رسم' یا ہزار ہا دوسری چیزوں سے پیدا ہوا ہو۔ ایسے عقائد جن کی بنیاد عقل و فکر پر نہیں ہوتی' وہ صرف روحانی جمود ہیں۔ یعنی روحانی اسیری اور زنجیر ہیں۔ اسلام ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ

۱۔ سورۂ انبیا ۲۱۔ آیات ۶۰ اور ۶۲ تا ۶۴

کسی کے ہاتھوں پیروں پر زنجیر بندھی ہو' چاہے وہ زنجیر خود اس نے اپنے ''دستِ مبارک'' سے باندھی ہو۔

پس عقیدے کی آزادی اپنے عمومی معنی میں ایک علیحدہ بات ہے اور آزادی فکر اور آزادیٔ ایمان یعنی ہر شخص تحقیق اور غور و فکر کے ساتھ اپنے ایمان کا انتخاب کرے' ایک علیحدہ بات ہے۔ قرآن مجید کی جنگ اجتماعی اور فکری آزادی کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے ہے۔

پوچھا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے فلاں ملک پر حملہ کیوں کیا تھا؟ حتیٰ خلفا کے زمانے میں بھی (ہمیں اس سے مطلب نہیں کہ ان کا کام اپنے اعتبار سے صحیح تھا یا نہیں) جب مسلمانوں نے حملہ کیا' تو وہ وہاں لوگوں سے یہ کہنے کے لئے نہیں گئے تھے کہ تم مسلمان ہو جاؤ۔ ظالم حکومتوں نے لوگوں کے ہاتھ پیروں کو زنجیروں سے جکڑ رکھا تھا' مسلمانوں نے حکومتوں کے ساتھ جنگ کر کے قوموں کو آزادی دلائی۔ ان دو مختلف باتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ گڈ مڈ کر دیا جاتا ہے۔ مسلمانوں نے اگر ایران یا روم کے ساتھ جنگ کی تھی' تو وہ دراصل ظالم حکومتوں کے خلاف لڑے تھے۔ قوموں کو آزادی دلائی تھی اور اسی لئے وہاں کی عوام نے رضا و رغبت کے ساتھ مسلمانوں کا استقبال کیا تھا۔ تاریخ کیوں لکھتی ہے کہ جب مسلمانوں کی فوج داخل ہوتی تھی' تو لوگ پھولوں کے گلدستے لے کر ان کا استقبال کرتے تھے؟ اس لئے کہ وہ مسلمانوں کو فرشتۂ نجات سمجھتے تھے۔ بعض لوگ ان دونوں باتوں کے درمیان غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں' {کہتے ہیں:} ''بہت خوب! مسلمانوں نے ایران پر حملہ کیا' جب انہوں نے ایران پر حملہ کیا ہوگا' تو یقیناً عوام کے پاس گئے ہوں گے اور ان سے کہا ہوگا کہ تمہیں لازماً اسلام قبول کرنا ہے''۔ {نہیں جناب} انہیں عوام سے کوئی غرض نہ تھی' اُن کا نشانہ ظالم حکومتیں تھیں۔ انہوں نے حکومتوں کو توڑا' اسکے بعد عوام کو جن میں اسی قدر توحید کا شائبہ تھا' اپنے ایمان میں آزاد چھوڑ دیا کہ اگر تم اسلام قبول کر لو تو ہماری ہی طرح ہو اور اگر اسلام قبول نہ کرو' تو تمہارے ساتھ علیحدہ شرائط کے تحت معاہدہ کریں گے' ان شرائط کو ''ذمہ'' کی شرائط کہا جاتا ہے اور مسلمانوں کی شرائط ذمہ انتہائی آسان اور سادہ تھیں۔

پس خود ایمان کے معاملے میں (نہ کہ ایمان کی راہ میں حائل فکری اور اجتماعی رکاوٹوں کے

معاملے میں' کیونکہ ان کا معاملہ مختلف ہے) نرمی' ملائمت کا استعمال اور جبر و زبردستی سے پرہیز کا اصول دعوتِ اسلامی کے بنیادی اصولوں میں سے ہے:

" لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى. "(۱)

قرآنِ مجید کی منطق کا خلاصہ یہ ہے کہ دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں' کیونکہ حقیقت روشن ہے' رشد و ہدایت کا راستہ واضح ہے اور ضلالت و گمراہی کا راستہ بھی عیاں ہے۔ جو چاہے اس راہ کا انتخاب کرے اور جو چاہے اُس راستے کو منتخب کرے۔

اس آیت کی شانِ نزول میں چند باتیں تحریر کی گئی ہیں' جو ایک دوسرے سے قریب قریب ہیں اور ممکن ہے ایک ہی وقت میں وہ سب کی سب درست ہوں۔ جب بنی نضیر نے' جو مسلمانوں کے حلیف تھے' غداری کی' تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں جلاوطنی کا حکم دیا' اور ان سے کہا کہ یہاں سے نکل جاؤ۔ بعض مسلمانوں کے بچے ان کے درمیان موجود تھے' جو یہودی تھے۔

وہ کیوں یہودی تھے؟

(ظہورِ اسلام سے قبل) یہودیوں کی تہذیب و تعلیم حجاز کے رہنے والے عربوں سے بہتر تھی۔ حجاز کے عرب غیر معمولی جاہل اور بے پڑھے لکھے لوگ تھے۔ یہودی' جو اہلِ کتاب تھے' لکھنا پڑھنا بھی جانتے تھے اور بکثرت معلومات بھی رکھتے تھے' لہٰذا وہ ان پر اپنی فکر تھوپتے تھے۔ یہاں تک کہ بت پرست بھی ان کا عقیدہ اختیار کر لیتے تھے۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ کبھی کبھی مدینہ کی بے اولاد عورتوں میں ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ نذر کرتی تھیں کہ اگر ان کے یہاں بچے کی ولادت ہوئی' تو وہ اُسے یہودیوں کے یہاں بھیج دیں گی تاکہ وہ یہودی ہو جائے۔ اُن کا یہ اعتقاد تھا' کیونکہ وہ محسوس کرتے تھے کہ یہودیوں کا مذہب' ان کے مذہب سے جو کہ بت پرستی تھا' بہتر ہے۔ اور کبھی

۱۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۲۵۶ (دین میں کسی قسم کا جبر نہیں ہے' ہدایت گمراہی سے الگ اور واضح ہو چکی ہے اب جو شخص بھی طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آئے وہ اسکی مضبوط رسی سے متمسک ہو گیا ہے۔)

وہ اپنے شیر خوار بچوں کو دودھ پلانے کے لئے یہودیوں کے پاس بھیج دیا کرتی تھیں۔ جن بچوں کے لئے وہ نذر کرتی تھیں کہ وہ یہودی ہو جائیں' واضح ہے کہ وہ یہودی ہو جاتے تھے اور یہودیوں کے یہاں چلے جاتے تھے۔ اور وہ بچے جن کو یہودی عورتیں دودھ پلاتی تھیں' وہ بھی یہودیوں کی عادات اپنا لیتے تھے' اُن کے رضاعی ماں' بھائی اور بہن ہو جایا کرتے تھے' اُن میں آپس میں ایک دوسرے سے آشنائی ہو جاتی تھی اور ان میں سے بعض یہودی ہو جاتے تھے۔ بہر صورت کچھ ایسے یہودی بچے موجود تھے جن کے ماں باپ کا تعلق انصار یا اوس و خزرج سے تھا۔

جب یہ بات طے ہوئی کہ بنی نضیر یہاں سے چلے جائیں' تو مسلمانوں نے کہا کہ ہم اپنے بچوں کو نہیں جانے دیں گے۔ کچھ بچے جو یہودیوں کے دین پر تھے' وہ کہنے لگے کہ ہم اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ جائیں گے۔ مسلمانوں کے لئے ایک مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ مسلمان کہتے تھے کہ ہم ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیں گے کہ یہ ہمارے بچوں کو اپنے ساتھ لے جائیں' اور وہ یہودی رہیں' لیکن کچھ بچے خود کہتے تھے کہ ہم اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ جانا چاہتے ہیں۔

{مسلمان} رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: یا رسول اللہؐ! ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے بچے جائیں۔ (بظاہر یہیں پر یہ آیت نازل ہوئی) پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: جبر اور زبردستی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ تمہارے بچوں کا دل چاہے تو اسلام اختیار کریں' اگر وہ نہیں چاہتے' تو ان کی مرضی' اگر وہ جانا چاہتے ہیں تو چلے جائیں' دین زبردستی کرنے والا معاملہ نہیں ہے:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْ بِاللهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى کیونکہ ایمان کا مزاج جبر زبردستی اور سختی قبول نہیں کرتا۔

"فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَ كَفَرَ فَيُعَذِّبُهُ اللهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ." (۱)

اے نبی! لوگوں کو تذکر دیجئے (تذکر کے معنی ہم پہلے بیان کر چکے ہیں) لوگوں کو خواب

۱۔ سورۂ غاشیہ ۸۸۔ آیت ۲۳ تا ۲۵

غفلت سے بیدار کیجئے' لوگوں کو جگائیے' لوگوں کو شعور دیجئے' لوگوں کو آگہی اور بیداری کے راستے سے دین کی طرف بلائیے۔ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ. آپ تذکر دلانے والے کے سوا کچھ نہیں ہیں' آپ مصیطر نہیں ہیں' یعنی خدا نے آپ کو ایسا نہیں بنایا کہ آپ زبردستی کوئی کام کریں۔

اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَ كَفَرَ

کیا '' اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَ كَفَرَ '' استثناء ہے '' لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ '' سے' یا یہ '' فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ '' سے استثناء ہے؟

تفسیر المیزان میں فرماتے ہیں (اور دلائل بیان کرتے ہیں) کہ یہ '' فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ '' سے استثناء ہے: تذکر دیجئے' اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَ كَفَرَ سوائے ان افراد کے جنہیں آپ نے تذکر دیا ہے' اور آپ کے تذکر دینے کے باوجود انہوں نے روگردانی کی ہے' اور اب تذکر کے بعد تذکر کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ. (پس خدا اس پر عذاب کرے گا' بڑا عذاب) جو عذاب جہنم ہے۔

حضرت علیؑ اور جنابِ زہراؑ کی وفات

آخری شب ہے اور آج خصوصی طور پر مصائب کا ذکر ہونا چاہئے۔ معمول کے مطابق اور خصوصاً ایام کی مناسبت سے حضرت زہرا سلام اللہ علیہا کے مصائب بیان ہونے چاہئیں۔

حضرت علی علیہ السلام پر حضرت زہرا سلام اللہ علیہا کا غم غیر معمولی طور پر سخت اور دشوار تھا۔ حضرت زہراؑ کی طبیعت ناساز تھی اور وہ بستر پر دراز تھیں۔ حضرت علیؑ حضرت زہراؑ کے سرہانے تشریف فرما تھے۔ حضرت زہراؑ نے کلام کرنا شروع کیا۔ آپ نے انکساری اور عاجزی کے ساتھ چند جملے فرمائے' حضرت علیؑ پر حضرت زہراؑ کی اس غیر معمولی انکساری سے رقت طاری ہوگئی' اور آپ رونے لگے۔ بی بی کے جملوں کا مضمون یہ ہے: اے علیؑ! میری زندگی کا چراغ گل ہوا چاہتا ہے' میں دنیا سے رخصت ہو رہی ہوں' میں نے آپ کے گھر میں ہمیشہ اچھی طرح رہنے کی کوشش کی ہے' کوشش کی ہے کہ کبھی آپ کی حکم عدولی نہ کروں' میں نے ہرگز آپ کے کسی حکم کی مخالفت

نہیں کی۔ حضرت زہراؑ نے اسی قسم کی مزید باتیں کیں۔ یہ باتیں حضرت علیؑ پر اس قدر اثر انداز ہوئیں کہ آپؑ نے حضرت زہراؑ کا سر اپنے سینے سے لگالیا اور رونے لگے: اے دخترِ رسولؐ! آپ ان باتوں سے کہیں بڑھ کر ہیں آپ اس سے کہیں عظیم تر ہیں کہ ان باتوں کا فرمانا آپ کے لئے درست ہو یعنی آپ اس قدر انکساری کیوں کر رہی ہیں؟! میں آپ کی اس بہت زیادہ انکساری سے پریشان ہوں۔

علیؑ اور زہراؑ کے درمیان ایسی غیر معمولی محبت پائی جاتی ہے جو نا قابلِ بیان ہے لہٰذا ہم سمجھ سکتے ہیں کہ زہراؑ کے بعد تنہائی نے علیؑ کے ساتھ کیا کیا ہوگا۔ ہم صرف چند جملے عرض کرتے ہیں جو مولائے متقیان حضرت علی علیہ السلام نے حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام کی قبر پر فرمائے اور جو نہج البلاغہ میں موجود ہیں۔

حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام نے وصیت کی تھی: ''اے علی! مجھے آپ خود غسل دیجئے گا' خود میری تجہیز و تدفین کیجئے گا۔ مجھے رات میں دفن کیجئے گا' میں نہیں چاہتی کہ جن لوگوں نے مجھ پر ظلم کیا ہے وہ میرے جنازے میں شرکت کریں۔''

تاریخ ہمیشہ آلودہ رہی ہے۔ کچھ لوگ ظلم کا ارتکاب کرتے ہیں اور پھر تاریخ کو مسخ کرنے کی خاطر خود ہی ہمدرد بن کر سامنے آتے ہیں۔ وہی عمل جو مامون نے انجام دیا: وہ امام رضا علیہ السلام کو شہید کرتا ہے اور پھر خود ہی سب سے زیادہ سر پیٹتا ہے' نالہ و فغاں بلند کرتا ہے' نوحہ و مرثیہ پڑھتا ہے۔ لہٰذا وہ تاریخ میں یہ ابہام چھوڑ گیا جس کی وجہ سے بعض لوگ یہ یقین نہیں کرتے کہ مامون نے امام رضاؑ کو شہید کیا تھا۔ یہ ہے تاریخ کا مسخ ہونا۔

جنابِ زہراؑ نے تاریخ کو مسخ ہونے سے بچانے کے لئے فرمایا کہ مجھے رات میں دفن کیجئے گا۔ تاکہ تاریخ میں کم از کم یہ سوالیہ نشان باقی رہ جائے کہ پیغمبرؐ جن کی صرف ایک بیٹی تھی' اس ایک بیٹی کو رات میں کیوں دفن کیا گیا؟ اور کیوں اس کی قبر نا معلوم ہے؟! یہ زہرائے مرضیہؑ کی عظیم ترین سیاست تھی' جس کے ذریعے آپ تاریخ میں یہ باب کھلا چھوڑ گئیں کہ ہزار سال بعد ہی سہی لوگ آئیں اور کہیں:

وَ لِاَیِّ الْاُمُورِ تُدْفَنُ لَیْلاً
بِضْعَۃُ الْمُصْطَفٰی وَ یُعْفٰی ثَراھا

تاریخ کہے کہ: سبحان اللہ! کیوں دختر رسول کو رات میں دفنایا گیا؟! کیا جنازے میں شرکت ایک مستحب عمل نہیں ہے اور وہ بھی مستحبِ موکد اور وہ بھی دختر رسول کا جنازہ؟! آخر کیوں صرف گنتی کے چند افراد نے اُن کی نماز جنازہ پڑھی؟! اور کیوں ان کی قبر کا مقام پوشیدہ رہے اور کسی کو معلوم نہ ہو سکے کہ زہرا کو کہاں دفن کیا گیا ہے؟!

حضرت علیؑ نے زہراؑ کو دفن کیا۔ زہراؑ نے یہ وصیت بھی کی تھی: اے علیؑ! جب آپ مجھے دفن کر دیں اور میری قبر کو چھپا دیں تو چند لمحے میری قبر پر کھڑے رہئے گا دور نہ ہوئیے گا کیونکہ یہ وہ لمحہ ہے جس میں مجھے آپ کی ضرورت ہے۔

حضرت علیؑ نے اس تاریک رات میں جناب زہراؑ کی تمام وصیتوں پر پورا پورا عمل کیا۔ اب علی پر کیا گزر رہی ہے یہ میں بیان نہیں کر سکتا: آپ نے اپنی زہراؑ کو اپنے ہاتھوں سے دفن کیا اور اپنے ہاتھوں سے اُن کی قبر کو چھپا دیا لیکن ہم اتنا جانتے ہیں کہ تاریخ کہتی ہے:

"فَلَمَّا نَفَضَ یَدَهُ مِنْ تُرَابِ الْقَبْرِ هَاجَ بِهِ الْحُزْنُ۔"

حضرت علی علیہ السلام نے جنابِ زہرا سلام اللہ علیہا کی قبر کو چھپایا اور اپنے لباس کی گرد اور خاک کو جھاڑا۔ وہ اس وقت تک کام میں مشغول تھے اور کسی کام میں مشغول ہونے سے انسان کا ذہن کسی حد تک ہٹ جاتا ہے۔ آپ کا کام ختم ہو گیا۔ اب آپ حضرت زہرا کی وصیت پر عمل کرنا چاہتے ہیں یعنی وہیں موجود رہنا چاہتے ہیں۔ جب آپ اس مقام پر پہنچے تو دنیا جہاں کا غم واندوہ علیؑ کے دل میں امڈ آیا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ دردِ دل کے اظہار کی ضرورت ہے۔ کبھی علیؑ اپنا دردِ دل کنویں سے بیان کیا کرتے تھے اپنا سر کنویں میں ڈال دیتے تھے لیکن جو دردِ دل زہراؑ کے حوالے سے ہے اسکے اظہار کے بارے میں سوچتے ہیں کہ پیغمبرؐ سے بہتر اور کوئی نہیں ہے لہٰذا پیغمبر اکرمؐ کی قبرِ مقدس کی طرف رُخ کر کے فرماتے ہیں:

"اَلسَّلامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ عَنِّیْ وَ عَنِ ابْنَتِکَ النَّازِلَةِ فِیْ

جِوَارِکَ وَالسَّرِیْعَةِ اللِّحَاقِ بِکَ قَلَّ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ عَنْ صَفِیَّتِکَ صَبْرِیْ."(۱)

ولا حول ولا قوّة الّا باللّٰه العلیّ العظیم و صلّی اللّٰه علی محمد و آله الطاهرین.

☆☆☆

۱۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ ۲۰۰ {اے اللہ کے رسول! آپ کو میری جانب سے اور آپ کے پڑوس میں اترنے والی اور آپ سے جلد مل جانے والی آپ کی بیٹی کی طرف سے سلام ہو۔ اے رسول اللہ! آپ کی برگزیدہ (بیٹی کی رحلت) سے میرا صبر وضبط جاتا رہا۔۔۔}

ضمیمہ: ۱

پیغمبر کی مختصر سوانح حیات اور آنحضورؐ کے چند کلمات کا تجزیہ

پیغمبر اسلامؐ کی مختصر سوانح حیات اور آنحضورؐ کے چند کلمات کا تجزیہ

ین باریٔ الخلائق اجمعین. والصلوۃ والسلام علیٰ عبداللّٰہ ورسولہ وحبیبہ و صفیہ و حافظ سرّہ ومبلّغ رسالاتہ سیّدناونبیّنا ومولانابی القاسم محمدوآلہ الطیّبین الطاھرین المعصومین.

اعوذباللّٰہ من الشیطان الرجیم

"لَقَدْ جَائَکُمْ رَسُولٌ مِنْ اَنْفُسِکُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْہِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَؤُفٌ رَحِیْمٌ." (۱)

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اسی طرح چھٹے امام امام جعفر صادق علیہ السلام کی ولادت کا دن ہے۔ آج ہم شیعوں کے لئے دوہری خوشی کا دن ہے کیونکہ دو عیدیں ہیں اس دن میں دو عظیم ولادتیں واقع ہوئی ہیں۔ لیکن ہمیں اپنے آپ سے ایک شکوہ ضرور کرنا چاہئے اور وہ یہ

۱۔ سورۂ توبہ ۹۔ آیت ۱۲۸ (یقیناً تمہارے پاس وہ پیغمبر آیا جو تم ہی میں سے ہے اور اس پر تمہاری ہر مصیبت شاق ہوتی ہے وہ تمہاری ہدایت کے بارے میں فرض رکھتا ہے اور مومنین کے دل پر شفیق اور مہربان ہے۔)

کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے آج کا دن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کا دن ہے اور شیعہ مسلمان ہونے کے اعتبار سے آج امام جعفر صادق علیہ السلام کی ولادت کا دن ہے' لیکن آج کے دن ہم شیعہ جن احساسات کا اظہار کرتے ہیں' نہ وہ عیسائیوں کی جانب سے حضرت عیسیٰ کی ولادت کے دن کیے جانے والے جذبات کے اظہار کی برابری کرتے ہیں (بلکہ موازنے کے قابل ہی نہیں ہیں) اور نہ اس دن ولادتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے سے اہلِ تسنن کی جانب سے کیے جانے والے جذبات کے اظہار کی برابری کرتے ہیں۔

آپ جانتے ہیں کہ عیسائی دنیا' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے موقع پر' کئی دن باقاعدہ طور پر اس طرح عید مناتی ہے کہ اس کے اثرات ہم مسلمانوں کے اندر بھی ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اور دنیائے تسنن بھی جو طویل ترین عید مناتے ہیں' جو ہم ایرانیوں کی عید نوروز کے برابر ہو جاتی ہے' وہ یہی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت ہے' جس میں چند دن تعطیل کا اعلان کرتے ہیں اور کئی دن عید مناتے ہیں۔ البتہ وہ لوگ ۱۲ ربیع الاوّل کو رسولِ اکرمؐ کی ولادت کا دن مانتے ہیں' یعنی ۱۷ ربیع الاوّل' جس دن ہم عید مناتے ہیں' اُس سے پانچ دن پہلے۔ لیکن ان کی عید ۱۲ ربیع الاوّل سے شروع ہوتی ہے اور بظاہر ۱۷ ربیع الاوّل کے بعد پانچ دن تک جاری رہتی ہے۔ جو چیز ہمارے یہاں عید نوروز یعنی ایک طویل اور عمومی عید ہے' وہ اہلِ تسنن کے یہاں یہی ولادتِ رسولِ خداؐ کے ایام ہیں۔ لیکن ہم شیعوں کے یہاں (جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہے کہ ہمیں اپنے آپ سے یہ گلہ کرنا چاہیے) رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کا دن آتا ہے اور چلا جاتا ہے اور ہمارے بہت سے لوگوں کو اس دن کے آنے اور چلے جانے کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ اگر عام تعطیل' بینکوں کی چھٹی اور دفتروں میں کام کرنے والوں کا کام پر نہ جانا نہ ہوتا' تو ہمارے معاشرے میں معمولی سا احساس بھی ظاہر نہ ہوتا' جب کہ یہ دوہری عید ہے۔ اب ہم اس حالت کو کیا نام دیں' ہمیں نہیں معلوم۔

آج ہم رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے بارے میں ایک انتہائی مختصر گفتگو کرنا چاہتے ہیں' جو اسکول کے طلبا اور یونیورسٹی کے بعض ایسے طالب علموں کے لئے مفید ہو جو اس

بارے میں بہت کم معلومات رکھتے ہیں۔ بعدازآں ہم اپنی گفتگو کا کچھ حصہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعض کلمات اور آنحضرتؐ کے بعض فرامین کی تشریح کے لئے مختص کریں گے۔

آنحضرتؐ کی ولادت اور بچپن کا دور

شیعہ اور سنی دونوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت ربیع الاوّل کے مہینے میں ہوئی ہے' اگرچہ اہلِ سنت زیادہ تر بارہ ربیع الاوّل کے قائل ہیں اور کتاب کافی کے مؤلف شیخ کلینیؒ کے سوا جو بارہ ربیع الاوّل ہی کو نبی کریم کا روزِ ولادت سمجھتے ہیں زیادہ تر شیعہ آنحضرتؐ کا روزِ ولادت سترہ ربیع الاوّل قرار دیتے ہیں۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت سال کے کس موسم میں ہوئی؟

موسم بہار میں۔ سیرہ حلبیہ میں تحریر ہے کہ: وُلِدَ فِی فَصْلِ الرَّبِیع. آپ کی ولادت موسم بہار میں ہوئی۔ موجودہ دور کے بعض دانشوروں نے یہ جاننے کے لئے کہ رسولِ کریمؐ کی ولادت شمسی کیلنڈر کے حساب سے کس دن واقع ہوئی تھی' حساب لگایا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اُس سال کی بارہ ربیع الاوّل {عیسوی کیلنڈر کی} ۲۰ اپریل بنتی ہے اور ۲۰ اپریل (ایرانی کیلنڈر کے مطابق) ۳۱ فروردین ہے' اور ظاہر ہے کہ ۱۷ ربیع الاوّل (ایرانی کیلنڈر) کے مطابق ۵ اردیبھشت ہوگی۔ لہٰذا قدرِ یقینی یہ ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم موسمِ بہار میں دنیا میں تشریف لائے۔ اب چاہے یہ ۳۱ فروردین ہو یا ۵ اردیبھشت۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت ہفتے کے کس دن واقع ہوئی؟

شیعوں کا اعتقاد ہے کہ آپ جمعے کے دن دنیا میں تشریف لائے' اہلِ سنت نے بیشتر پیر کا دن کہا ہے۔

آپ دن رات کے کس حصے میں متولد ہوئے؟

شاید اس بارے میں سب متفق ہوں کہ آپ نے طلوعِ فجر کے بعد دنیا میں قدم رکھا' طلوعِ فجر اور طلوعِ شمس کے درمیان۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تاریخِ حیات انتہائی عجیب ہے۔ آپ کے والدِ بزرگوار عبداللہ بن عبدالمطلب تھے۔ حضرت عبداللہ بہت سمجھدار اور لائق جوان تھے انہیں ذبح کیے جانے کی نذر کے واقعے کو یہیں چھوڑ کر ہم آگے بڑھتے ہیں۔ اپنے دورِ جوانی میں حضرت عبداللہ پورے مکہ میں منفرد اور ممتاز تھے۔ انتہائی خوبصورت' انتہائی سمجھدار' انتہائی مہذب' انتہائی عقلمند کہ مکہ کی دوشیزائیں ان کی رفیقِ حیات بننے کی آرزو کیا کرتی تھیں۔ انہوں نے آمنہ بنتِ وہب سے شادی کی جو ان کے قریبی رشتے داروں میں سے تھیں۔ ان کی شادی کو چالیس دن بھی نہیں گزرے تھے کہ وہ مکہ سے شام جانے کے لئے روانہ ہوئے۔ بظاہر ان کا یہ سفر ایک تجارتی سفر تھا۔ واپسی پر وہ مدینہ تشریف لے جاتے ہیں' جہاں اُن کے ننھیالی رشتے دار رہا کرتے تھے' اور پھر وہیں مدینہ میں اُن کی وفات ہو جاتی ہے۔

حضرت عبداللہ کی وفات کے وقت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی والدہ کے شکم میں تھے۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب دنیا میں تشریف لائے تو آپ یتیم تھے' یعنی آپ کے سر سے والد کا سایہ اٹھ چکا تھا۔

اُس دور کے دستور کے مطابق عرب اپنے بچوں کی تربیت کے لئے انہیں کسی دایہ کے سپرد کرنا ضروری سمجھتے تھے' تاکہ وہ انہیں اپنے ساتھ دیہات میں لے جائے اور وہاں انہیں دودھ پلائے۔ حلیمۂ سعدیہ (جن کا تعلق بنی سعد سے تھا) دیہات سے مدینہ آتی ہیں' یہ بھی ایک تفصیلی داستان ہے' اور یہ بچہ اُن کے حصے میں آتا ہے۔

خود حلیمہ اور اُن کے شوہر کئی قصے نقل کرتے ہیں' اُن کے بقول جس روز سے اس بچے نے ہمارے گھر میں قدم رکھا ہے' ایسے ہے جیسے ہمارے یہاں زمین اور آسمان سے برکتوں کی برسات ہو رہی ہو۔

یہ بچہ چار سال تک اپنی ماں' اپنے دادا' اپنے رشتے داروں اور مکہ سے دور دیہات میں بادیہ نشینوں کے درمیان' دایہ کے پاس زندگی بسر کرتا ہے۔ چار سال کی عمر میں اسے دایہ سے لے لیا جاتا ہے۔ اُس کی مہربان ماں اُسے اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔

اب آپ ذرا حضرت آمنہ کی حالت کا تصور کیجئے' وہ عورت جو ایک محبوب اور اصطلاحا آئیڈیل شوہر کی شریک حیات تھی' جس دن ان کی شادی ہوئی ہے' اس دن یہ عظیم افتخار نصیب ہونے پر وہ مکہ کی تمام دوشیزاؤں کے سامنے فخر محسوس کرتی ہوں گی۔ ابھی اُن کا بچہ اُن کے شکم ہی میں ہوتا ہے کہ وہ اپنے شوہر کو کھو بیٹھتی ہیں۔ ایک ایسی عورت جو اپنے شوہر سے بے انتہا محبت کرتی ہو ظاہر ہے اُس کے لئے اُس کا بچہ اُس کے عزیز اور محبوب شوہر کی ایک عظیم یادگار کی حیثیت رکھتا ہے۔ خصوصاً اگر یہ بچہ بیٹا ہو۔ حضرت آمنہ حضرت عبداللہ کے بارے میں اپنی تمام آرزوئں کو اس کم سن بچے میں مجسم دیکھتی ہیں۔ وہ پھر شادی بھی نہیں کرتی ہیں۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دادا حضرت عبدالمطلب' حضرت آمنہ کے علاوہ اس کم سن بچے کے بھی کفیل ہیں۔ حضرت آمنہ کے عزیز ورشتے دار مدینہ میں رہائش پذیر تھے۔ حضرت عبدالمطلب کی اجازت سے حضرت آمنہ اپنے اعزہ سے ملاقات کے لئے اپنے بچے کے ہمراہ مدینہ جاتی ہیں۔ آپ اپنی ایک کنیز ام ایمن کے ساتھ ایک قافلے کے ہمراہ روانہ ہوتی ہیں۔ مدینہ پہنچتی ہیں' عزیزوں سے ملاقات کرتی ہیں۔ (پیغمبر اکرمؐ نے اپنے بچپن میں جو سفر کیا' وہ یہی سفر تھا' جس میں آپ پانچ برس کی عمر میں مکہ سے مدینہ تشریف لے گئے تھے)

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی والدہ اور اُن کی کنیز کے ہمراہ واپس تشریف لا رہے تھے کہ مکہ اور مدینہ کے درمیان ''ابواء'' نامی مقام پر' جو آج بھی موجود ہے' اُن کی والدۂ گرامی علیل ہو جاتی ہیں' آہستہ آہستہ اتنی کمزور ہو جاتی ہیں کہ اُن میں ہلنے جلنے کی سکت بھی نہیں رہتی' اور آخر کار وہیں اُن کی وفات ہو جاتی ہے۔

یہ ننھا بچہ اپنی آنکھوں سے' دورانِ سفر اپنی ماں کی موت واقع ہوتے دیکھتا ہے۔ حضرت آمنہ کو وہیں دفن کر دیتے ہیں' اور رسول مقبولؐ ام ایمن' اس انتہائی باوفا کنیز (ام ایمن کو بعد میں آزاد کر دیا گیا تھا اور وہ اپنی آخر عمر تک رسول خدا' حضرت علیؑ' حضرت فاطمہؑ' امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی خدمت میں مشغول رہتی ہیں۔ حضرت زینبؑ نے وہ مشہور روایت انہی ام ایمن سے روایت کی ہے اور آپ اہل بیت رسولؐ کے یہاں ایک جلیل القدر سن رسیدہ خاتون کے بطور رہی

ہیں) کے ساتھ مکہ واپس آ جاتے ہیں۔

اس واقعے پر تقریباً پچاس سال گزر چکے تھے' ہجرت کا قریب تیسرا سال تھا۔ پیغمبر اکرمؐ کا ایک سفر کے دوران اسی ''ابواء'' کے مقام سے گزر ہوا۔ آپ سواری سے نیچے اتر گئے۔ اصحاب نے دیکھا کہ آپ کسی سے کچھ کہے بغیر ایک طرف روانہ ہو گئے ہیں۔ بعض لوگ آپ کے پیچھے ہو لئے' تا کہ دیکھیں کہ آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں۔ انہوں نے دیکھا کہ آپ بہت دور تک چلنے کے بعد ایک خاص مقام پر پہنچے' وہاں بیٹھ گئے اور دعا' حمد اور قل ہو اللہ وغیرہ پڑھنے لگے۔ پھر ان لوگوں نے دیکھا کہ آپ گہری سوچ میں ڈوب گئے ہیں اور آپ کی پوری توجہ کا مرکز زمین کا وہی خاص مقام ہے۔ اس حال میں آپ زیرِ لب کچھ پڑھ رہے ہیں اور آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ اصحاب نے پوچھا: اے اللہ کے رسولؐ! آپ کیوں رو رہے ہیں؟ فرمایا: یہاں میری ماں کی قبر ہے' پچاس سال پہلے' میں نے اپنی والدہ کو اسی مقام پر دفن کیا تھا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی والدہ کے انتقال کے بعد' آنحضرتؐ اپنے دادا عبدالمطلب کی تمام تر توجہ کا مرکز بن گئے۔ عبدالمطلب اپنے بیٹے عبداللہ اور اپنی بہو آمنہ کے انتقال کے بعد اس بچے کو غیر معمولی طور پر عزیز رکھنے لگے تھے' اور اپنے بیٹوں سے کہا کرتے تھے کہ وہ دوسروں سے بہت مختلف ہے' خدا کی طرف سے اس کا ایک مستقبل ہے' جس کا تم لوگوں کو علم نہیں ہے۔

جب حضرت عبدالمطلب دنیا سے رخصت ہونے لگے' تو حضرت ابو طالب نے (جو ان کے بڑے بیٹے اور تمام بیٹوں سے زیادہ بزرگ اور معزز شخصیت کے مالک تھے) دیکھا کہ ان کے والد ایک اضطرابی کیفیت کا شکار ہیں۔ اسی حالت میں انہوں نے حضرت ابو طالب سے فرمایا: مجھے موت کی کوئی گھبراہٹ نہیں ہے' بس ایک چیز مجھے پریشان کیے ہوئے ہے' اور وہ اس بچے کا مستقبل ہے۔ میں فکر مند ہوں کہ اس بچے کو کس کے سپرد کروں؟ کیا تم اس کی ذمے داری اٹھاؤ گے؟ کیا تم مجھ سے وعدہ کرتے ہو کہ اس بچے کی کفالت کی ذمے داری لو گے؟ عرض کیا: ہاں بابا جان! میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں' اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔ حضرت عبدالمطلب کے بعد امیر المومنین حضرت علیؑ کے والد' حضرت ابو طالب پیغمبر اکرمؐ کی نگہداشت اور پرورش کے

ذمے دار ہے۔

آنحضرتؐ کے سفر

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عربستان سے باہر صرف دو سفر کیے ہیں' یہ دونوں ہی سفر عہد رسالت سے پہلے اور شام کے سفر تھے۔ ایک سفر بارہ برس کی عمر میں اپنے چچا حضرت ابوطالب کے ہمراہ کیا تھا' اور دوسرا پچیس برس کی عمر میں ایک بیوہ خدیجہ نامی خاتون کے تجارتی نمائندے کی حیثیت سے' جو آپ سے پندرہ برس بڑی تھیں اور جن سے بعد میں آپ نے شادی کرلی تھی۔

البتہ رسالت کے بعد آپ نے خود عربستان کے اندر کئی سفر کیے ہیں' مثلاً آپ طائف گئے' خیبر گئے' جو مکہ کے شمال میں ساٹھ فرسخ (۱) کے فاصلے پر واقع ہے' تبوک گئے' جو تقریباً شام کی سرحد پر واقع اور مدینہ سے سو فرسخ کے فاصلے پر ہے' لیکن عہد رسالت میں آپ کبھی جزیرۃ العرب سے باہر تشریف نہیں لے گئے۔

آنحضرتؐ کے پیشے

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کون کون سے پیشے اختیار کیے؟ چرواہے اور تجارت کے سوا ہمیں پیغمبر اسلامؐ کے کسی اور پیشے کا علم نہیں۔ متعدد انبیاؑ اپنی رسالت سے پہلے چرواہے رہے ہیں مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام (اب اس میں خدا کی کیا حکمت ہے' ہمیں درست طور پر معلوم نہیں) قدر یقینی بات یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ بھی چرواہے رہے ہیں۔ آپ بھیڑوں کو اپنے ساتھ صحرا لے جاتے' ان کی حفاظت کرتے اور انہیں چرا کر واپس لاتے تھے۔

آپ نے تجارت بھی کی ہے۔ باوجود یہ کہ آپ کا یہ سفر' آپ کا پہلا ہی تجارتی سفر تھا (آپ

۱۔ {فرسخ: تین میل سے کچھ زائد فاصلہ۔}

صرف ایک مرتبہ بارہ برس کی عمر میں اپنے چچا کے ہمراہ سفر پر گئے تھے) لیکن اس سفر میں آپ نے ایسی مہارت کا مظاہرہ کیا کہ سب لوگوں کے لئے حیرانگی کا سبب بنا۔

آنحضرتؐ کا ماضی

رسالت سے پہلے' پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ماضی کیا رہا تھا؟

دنیا کے تمام انبیا میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم' وہ واحد نبی ہیں جن کی واضح تاریخ موجود ہے۔ پیغمبر اکرمؐ کا ایک بہت واضح ماضی یہ ہے کہ آپ اُمی تھے' یعنی آپ کسی مدرسے میں نہیں گئے تھے اور نہ کسی سے کچھ پڑھا تھا۔ قرآنِ مجید میں بھی اس بات کا ذکر موجود ہے۔ اس علاقے کے اکثر لوگ' اس زمانے میں اُمی تھے۔

ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ' بعثت سے قبل' پورے چالیس برس تک' ایک ایسے ماحول میں زندگی بسر کرنے کے باوجود جہاں صرف اور صرف بت پرستی کا ماحول تھا' آپ نے کبھی کسی بت کو سجدہ نہ کیا۔ البتہ {اس دور میں} بہت کم تعداد میں لوگوں کا ایک ایسا گروہ موجود تھا جو ''حنفا'' کے نام سے معروف تھا' یہ گروہ بھی بتوں کو سجدہ کرنے سے پرہیز کرتا تھا۔ لیکن ایسا نہیں تھا کہ اپنی زندگی کی ابتدا سے آخر تک {ان لوگوں نے کسی بت کو سجدہ نہ کیا ہو} ' بلکہ یہ سوچ بعد میں ان کے ذہن میں پیدا ہوتی تھی' کہ یہ ایک غلط کام ہے' اور پھر وہ بتوں کو سجدہ کرنے سے پرہیز کرنے لگتے تھے۔ ان میں سے بعض لوگ عیسائی ہو گئے۔ لیکن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی پوری زندگی میں' اپنے بچپنے سے آخر عمر تک' نہ کبھی کسی بت کو خاطر میں لائے' اور نہ ہی کسی بت کو سجدہ کیا۔ یہ' آپ کا ایک خاص امتیاز ہے۔ اگر آپ نے کسی بت کے سامنے معمولی سا بھی سر جھکایا ہوتا' تو جس دور میں آپ بت پرستی کے خلاف برسرِ پیکار تھے' اُس زمانے میں لوگ آپ سے کہتے کہ: کل تک تم خود یہاں آ کر ''لات'' اور ''ھُبل'' کو سجدے کیا کرتے تھے۔

آپ نے نہ صرف کسی بت کو سجدہ نہیں کیا' بلکہ مکہ میں' جو عیش ونوش اور گناہ و بدکاریوں سے بھرپور شہر تھا' آپ اپنے بچپن اور جوانی کے پورے دور میں کبھی ان برائیوں سے آلودہ نہ ہوئے۔

مکہ کو دو خصوصیات حاصل تھیں: ایک یہ کہ مکہ عرب میں بت پرستی کا مرکز تھا اور دوسری یہ کہ اسے تجارتی اور کاروباری مرکزیت بھی حاصل تھی۔ عرب سرمایہ دار یہیں رہا کرتے تھے' عرب کے غلاموں کے مالک بھی مکہ ہی میں رہائش پذیر تھے۔ یہ لوگ غلاموں اور کنیزوں کی خرید و فروخت کیا کرتے تھے۔ جس کے نتیجے میں یہ شہر مالداروں اور بڑے لوگوں کی عیاشی کا مرکز بنا ہوا تھا۔ شراب نوشی' گانا بجانا' رقص و سرور اور عیش و عشرت کے طرح طرح کے سامان یہاں میسر تھے۔ یہ لوگ روم (موجودہ شام) سے گوری چٹی' خوبصورت کنیزیں خرید کر لاتے اور مکہ میں عشرت کدے تعمیر کرتے' اور ان سے مال و دولت کماتے۔ وہ اعمال جن کی بنا پر قرآن کریم ان کی سخت مذمت کرتا ہے' ان میں سے ایک انکا یہی عمل ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"وَ لَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا." (۱)

وہ بے چاری بدنصیب (کنیزیں) اپنی عزت کی حفاظت کرنا چاہتی تھیں' لیکن یہ ان بے چاریوں کو زبردستی زنا پر مجبور کرتے تھے اور اسکے عوض پیسے کماتے تھے۔

مکہ کی آبادی دو حصوں میں تقسیم تھی' شہر بالائی اور زیریں دو حصوں میں منقسم تھا۔ بالائی حصے میں اعیان و اشراف رہا کرتے تھے اور زیریں حصے میں ان کے علاوہ دوسرے لوگ۔ اعیان و اشراف کے گھروں سے ہمیشہ گانے بجانے' رقص و سرور' عیش و نوش اور ہاؤ ہُو کی آوازیں بلند رہا کرتی تھیں۔ پیغمبر اکرمؐ نے اپنی پوری زندگی' کبھی بھی' مکہ میں رائج ان محفلوں میں سے کسی محفل میں شرکت نہیں کی۔

عہدِ رسالت سے قبل' آپ اپنی صداقت و امانت اور دانائی و زیرکی کی وجہ سے معروف اور مشہور تھے۔ آپ کو محمد امین کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ آپ کی سچائی اور امانتداری پر لوگ بہت زیادہ اعتماد کیا کرتے تھے۔ بہت سے کاموں میں آپ کی رائے پر بھروسہ کرتے تھے۔ عقلمندی اور دانائی' صداقت و امانت' وہ صفات ہیں جن کی بنا پر پیغمبر اکرمؐ بہت مشہور تھے۔ یہی وجہ ہے کہ

۱۔ سورہ نور ۲۴۔ آیت ۳۳ (اور خبردار اپنی کنیزوں کو اگر وہ پاکدامنی کی خواہشمند ہیں تو زنا پر مجبور نہ کرنا۔)

جب آپ نے اپنی رسالت کے زمانے میں لوگوں سے پوچھا کہ کیا تم نے آج تک مجھ سے کوئی غلط بات سنی ہے' تو سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ: نہیں' کبھی نہیں' ہم آپ کو صادق اور امین سمجھتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عقل' دانائی اور زیرکی واضح کرنے والا ایک واقعہ یہ ہے کہ جب خانۂ کعبہ کی از سرِ نو تعمیر کے لئے توڑا گیا (اس کی دیواریں گرائی گئیں)' تو حجر اسود کو بھی وہاں سے نکال لیا گیا تھا۔ جب دوبارہ اسے نصب کیا جانے لگا' تو ایک قبیلہ کہتا تھا کہ ہم اسے نصب کریں گے اور دوسرا کہتا تھا کہ ہم اسے لگائیں گے۔ قریب تھا کہ اس مسئلے پر قبائل میں آپس میں زبردست جنگ چھڑ جائے۔ پیغمبر اکرمؐ نے آ کر معاملے کو نہایت سادہ انداز میں حل کر دیا۔ یہ معروف واقعہ ہے' اس لئے مزید اسکے لئے آپ کا وقت نہیں لینا چاہتا۔

ایک اور مسئلہ جس کا تعلق آنحضرتؐ کے اعلانِ رسالت سے پہلے کے زمانے سے ہے' وہ {آپ کو حاصل} تائیدات الٰہی کا مسئلہ ہے۔ پیغمبر اکرمؐ نے بعد میں' اپنی رسالت کے زمانے میں' اپنے بچپن کے بارے میں بتایا' اس میں یہ بھی فرمایا کہ: میں ان کے کاموں میں شریک نہیں ہوا کرتا تھا۔۔۔ کبھی کبھی میں یہ بھی محسوس کرتا تھا کہ گویا ایک غیبی طاقت میری تائید کر رہی ہے۔ آپ فرماتے ہیں: میری عمر سات برس سے زیادہ نہیں ہوئی تھی' مکہ کے اشراف میں سے ایک شخص' عبد اللہ بن جدعان' ایک عمارت تعمیر کر رہا تھا۔ مکہ کے بچے شوقیہ کام کرنے اور اسکی مدد کی غرض سے وہاں جاتے اور پتھر اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجاتے۔ میں بھی جاتا اور اُن کے ساتھ یہ کام کیا کرتا۔ یہ لوگ پتھروں کو اپنے دامن میں ڈالتے' اپنے دامنوں کو اوپر اٹھاتے' اور کیونکہ وہ شلوار (یا پاجامہ) نہیں پہنے ہوتے تھے' اس لئے اُن کی شرمگاہ عیاں ہو جاتی تھی۔ ایک مرتبہ میں نے پتھر رکھنے کے بعد جوں ہی اپنا دامن اٹھایا' تو مجھے یوں محسوس ہوا گویا ایک ہاتھ آیا اور میرے ہاتھ سے میرا دامن چھڑا کر اسے نیچے گرا دیا' اس طرح مجھے احساس ہو گیا کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے' حالانکہ اس وقت میں صرف سات برس کا ایک بچہ تھا۔ ایک روایت میں امام محمد باقر علیہ السلام' نیز امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام (نہج البلاغہ) میں اس بات کی مکمل تائید کرتے ہیں:

"وَلَقَدْ قَرَنَ اللّٰهُ بِهٖ مِنْ لَدُنْ اَنْ کَانَ فَطِیماً اَعْظَمَ مَلَکٍ مِنْ مَلَائِکَتِهٖ، یَسْلُکُ بِهٖ طَرِیقَ الْمَکَارِمِ وَ مَحَاسِنَ اَخْلَاقِ الْعَالَمِ." (۱)

امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں: بچپنے ہی سے خدا کے بعض فرشتے آپ کے ساتھ ساتھ رہا کرتے تھے۔ پیغمبر اکرمؐ فرماتے ہیں: کبھی کبھی مجھے کسی کے سلام کرنے کی آواز سنائی دیتی' کوئی مجھ سے کہتا تھا السلام علیک یا محمد! میں ادھر اُدھر دیکھتا تو مجھے کوئی نظر نہ آتا تھا۔ کبھی میں سوچتا تھا شاید یہ پتھر یا درخت مجھے سلام کرتے ہیں۔ بعد میں مجھے سمجھ آئی کہ وہ فرشتۂ الٰہی تھا جو مجھے سلام کیا کرتا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت سے پہلے کے مسائل میں سے ایک' متکلمین کی اصطلاح میں "ارھاصات" کا مسئلہ ہے۔ فرشتے کی یہ داستان بھی ارھاصات ہی میں شمار ہوتی ہے۔

خاص طور پر آغازِ رسالت کے بالکل نزدیک کے ایام میں پیغمبر اکرمؐ کو غیر معمولی عجیب وغریب خواب دکھائی دیتے تھے۔ فرماتے ہیں کہ میں خواب دیکھا کرتا تھا جو: یَاْتِی مِثْلَ فَلَقِ الصُّبْحِ. فجر کی مانند صبحِ صادق کی طرح سچے اور مطابق ہوا کرتے تھے۔ میں ایسے واضح خواب دیکھا کرتا تھا۔ کیونکہ بعض خواب وحی والہام کی قسم سے تعلق رکھتے ہیں' البتہ تمام خواب نہیں' اور نہ وہ خواب جو انسان کا معدہ خراب ہونے کی وجہ سے نظر آتے ہیں' نہ وہ خواب جو نفسیاتی پیچیدگیوں' سابقہ توہمات اور خیالات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

رسالت سے پہلے آنحضرتؐ الہام اور وحی کے لئے جو ابتدائی مراحل طے کر رہے تھے' یہ سچے خواب اُن کا ایک حصہ تھے' جن کے متعلق خود آنحضرتؐ کے الفاظ ہیں کہ یہ خواب صبح صادق کی

۱۔ نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۰ خطبۂ قاصعہ: (اللہ نے آپ کی دودھ بڑھائی کے وقت ہی سے فرشتوں میں سے ایک عظیم المرتبت فرشتے کو آپ کے ساتھ لگا دیا تھا' جو آپ کو شب وروز بزرگ خصلتوں اور پاکیزہ سیرتوں کی راہ پر لے چلتا تھا۔)

مانند ظاہر ہوتے تھے۔ کیونکہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کے لئے خواب واضح نہیں ہوتا' پراکندہ ہوتا ہے' اور کبھی خواب واضح ہوتا ہے' لیکن اسکی تعبیر سچی نہیں ہوتی۔ لیکن کبھی کبھی خواب انتہائی واضح ہوتا ہے' اس میں کوئی ابہام' تاریک گوشہ اور اصطلاحاً آشفتگی نہیں پائی جاتی اور پھر اسکی تعبیر بھی انتہائی واضح اور روشن ہوتی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت سے پہلے کی زندگی' یعنی آپ کی ولادت سے بعثت کے درمیانی عرصے میں (جیسا کہ ہم نے عرض کیا تھا) ایک چیز یہ ہے کہ آپ نے اپنی اس پچیس سالہ زندگی میں عربستان سے باہر کے دو سفر کئے تھے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تنگ دست تھے' آپ مال و دولت کے مالک نہ تھے۔ یعنی معروف معنوں میں آپ کوئی سرمایہ دار نہ تھے۔ آپ یتیم بھی تھے' غریب بھی تھے اور تنہا بھی تھے۔ آپ کا یتیم ہونا تو واضح ہے' بقول "نصاب" آپ لطیم بھی تھے۔ یعنی ماں اور باپ' دونوں کے سائے سے محروم تھے۔ غریب تھے' کیونکہ آپ کوئی سرمایہ دار نہ تھے' خود کام کاج کر کے اپنی معاش کا بندوبست کرتے تھے۔ اور تنہا تھے۔

جب انسان میں ایک روح جنم لیتی ہے' اور وہ نظریئے' فکری افق' روحانی جذبات اور معنویات کے اعتبار سے کسی مرحلے پر پہنچ جاتا ہے' تو لامحالہ وہ اپنے زمانے کے دوسرے لوگوں سے بے جوڑ ہو جاتا ہے' تنہا رہ جاتا ہے۔ روحانی تنہائی' جسمانی تنہائی سے سوگنا بدتر ہے۔ اگرچہ یہ مثال بہت مکمل نہیں ہے' لیکن بات کو واضح کر دیتی ہے: آپ ایک بہت زیادہ علم رکھنے والے اور انتہائی باایمان عالم کو' جاہل اور بے ایمان لوگوں کے درمیان چھوڑ دیجئے۔ چاہے وہ افراد اسکے ماں باپ' بھائی بند اور اسکے قریبی رشتے دار ہی کیوں نہ ہوں' اسکے باوجود وہ ان کے درمیان اپنے آپ کو تنہا محسوس کرے گا۔ یعنی صرف جسمانی تعلق' اسے ان لوگوں سے نہیں جوڑ سکتا۔ وہ روحانی اعتبار سے ایک دنیا میں رہتا ہے اور وہ لوگ دوسری دنیا میں۔ کہتے ہیں:

"جتنی جاہل کو عالم سے وحشت ہوتی ہے' اس سے سوگنا زیادہ دانا شخص نادان سے گریزاں رہتا ہے"۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی قوم کے درمیان تنہا تھے' ان کا کوئی ہم فکر نہ تھا۔ تمیں سال کی عمر میں' جب آپ نے حضرت خدیجہؓ سے شادی کے بعد گھریلو زندگی کی بنیاد رکھی' تو آپ ایک دو سالہ بچے کو اس کے والد سے حاصل کر کے اپنے گھر لے آتے ہیں۔ یہ بچہ' علی ابن ابیطالبؑ ہیں۔ آپ کے رسالت کے لئے مبعوث ہونے اور روحِ الٰہی کی صحبت کی وجہ سے آپ کی تنہائی تقریباً دور ہونے تک' یعنی اس بچے کی عمر قریب قریب بارہ سال ہونے تک' آپ کا ساتھی اور ہم نشین صرف یہی بچہ تھا۔ یعنی مکہ کے لوگوں میں' اس بچے کے سوا کوئی اور نہ تھا جو آنحضرتؐ سے ہم فکری' ہم روحی اور ہم افقی کی اہلیت کا حامل ہوتا۔ خود حضرت علی علیہ السلام نقل فرماتے ہیں کہ: میں چھوٹا سا تھا' جب پیغمبر اکرمؐ صحرا میں جاتے' تو مجھے کاندھے پر بٹھا کر اپنے ہمراہ لے جاتے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر پچیس برس تھی' حقیقتاً حضرت خدیجہؓ کی طرف سے آپ کو شادی کی پیش کش ہوتی ہے۔ البتہ شادی کی پیش کش مرد کو کرنی چاہئے' لیکن یہ خاتون آنحضرتؐ کے اخلاق واطوار' معنویت اور زیبائی' الغرض آپ کی پوری شخصیت کی ایسی شیفتہ ہوئیں کہ خود انہوں نے کچھ افراد سے کہا کہ وہ آنحضرتؐ کو اس بات پر تیار کریں کہ وہ آکر مجھے شادی کی پیشکش کریں۔ وہ لوگ آتے ہیں' آپؐ ان سے فرماتے ہیں کہ میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ وہ لوگ آپؐ سے کہتے ہیں کہ آپؐ ان باتوں کی فکر نہ کریں۔ وہ لوگ آپ کو سمجھاتے ہیں کہ وہ خدیجہؓ جن کے بارے میں آپؐ فرما رہے ہیں کہ اشراف واعیان اور بڑے بڑے لوگوں نے انہیں شادی کے پیغام دیئے ہیں' لیکن وہ تیار نہیں ہوئی ہیں' وہی خود آپؐ سے شادی کرنا چاہتی ہیں۔ مختصر یہ کہ رشتہ بھیجا جاتا ہے اور شادی ہو جاتی ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ اب جبکہ آپ ایک دولت مند اور تاجر خاتون کے شوہر ہو چکے ہیں' لیکن تجارت کے لئے نہیں جاتے۔ بلکہ عہد تنہائی' یعنی گوشہ نشینی' خلوت' یکسوئی اور عبادت کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ وہ حالت تنہائی' یعنی وہ روحانی فاصلہ جو آپ نے اپنے اور اپنی قوم کے درمیان قائم کیا تھا' وہ روز بروز بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اب مکہ اور وہاں کی بھیڑ بھاڑ گویا آپ کے

لئے سوہانِ روح بن جاتی ہے۔ لہٰذا آپ تن تنہا مکہ کے نواح میں واقع پہاڑوں (۱) کی طرف نکل جاتے ہیں' تفکر و تدبر کرتے ہیں۔ ہم نہیں سمجھ سکتے' خدا ہی جانتا ہے کہ آپ پر وہاں کیا عالم طاری ہوتا تھا۔ یہی وہ وقت ہے جب اس بچے یعنی علیؑ کے سوا کوئی اور آپ کے ہمراہ اور ہم نشین نہیں۔

جب ماہِ رمضان آتا ہے' تو آپ مکہ کے نواح میں واقع انہی پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ "کوہِ حرا" کو گوشہ نشینی کے لئے منتخب کرتے ہیں (کوہِ حرا مکہ کے شمال مشرق میں واقع ہے' یہ مکہ کے پہاڑی سلسلے سے جدا اور مخروطی شکل کا ہے) جسے اس کے بعد جبل النور (کوہِ نور) کا نام دیا گیا۔ شاید آپ میں سے حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کر چکنے والے اکثر لوگوں نے "کوہِ حرا" اور "غارِ حرا" کی زیارت کا شرف بھی حاصل کیا ہوگا؟ مجھے دو مرتبہ یہ شرف حاصل ہوا ہے' اور میری آرزوؤں میں سے ایک آرزو یہ بھی ہے کہ میں بار بار یہ شرف حاصل کروں۔ ایک اوسط درجے کے آدمی کو اس پہاڑ کے دامن سے اسکی چوٹی پر پہنچنے میں کم از کم ایک گھنٹہ لگتا ہے' اور اس سے نیچے اترنے میں تقریباً پون گھنٹہ صرف ہوتا ہے۔

جب ماہِ رمضان آتا' تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کلی طور پر مکہ چھوڑ دیتے تھے۔ حتیٰ حضرت خدیجہؑ سے بھی دور رہتے تھے۔ انتہائی مختصر غذا' کچھ پانی' تھوڑی سی روٹی' اپنے ساتھ لے کر کوہِ حرا کی طرف نکل جاتے تھے۔ ظاہراً ایسا لگتا ہے کہ بعد میں حضرت خدیجہؑ تھوڑے تھوڑے دنوں کے وقفے سے آپ کے لئے کچھ پانی اور روٹیاں دے کر کسی کو بھیجا کرتی تھیں۔ یہ پورا مہینہ آپ تنہائی میں بسر کرتے تھے۔ البتہ کبھی کبھی صرف حضرت علیؑ وہاں موجود ہوتے تھے' اور ممکن ہے ہمیشہ ہی حضرت علیؑ آپؐ کے ساتھ ہوتے ہوں' یہ بات سر دست ہمارے علم میں نہیں ہے۔ تقریباً ثابت شدہ بات یہ ہے کہ کبھی کبھی حضرت علیؑ وہاں آپؐ کے ساتھ ہوا کرتے تھے' کیونکہ انہوں نے فرمایا ہے:

"وَلَقَدْ جاوَرْتُ رَسولَ اللّٰهِ بِحِراءَ حينَ نُزولِ الْوَحْيِ."

۱۔ جن لوگوں نے مکہ کی زیارت کا شرف حاصل کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ مکہ کے ارد گرد پہاڑ ہی پہاڑ ہیں۔

''غارِ حرا میں نزولِ وحی کے وقت میں رسول اللہ کے ہمراہ تھا۔''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُس پہاڑ سے نیچے تشریف نہیں لاتے تھے' وہیں اپنے خدا کی عبادت میں مشغول رہتے تھے۔

آپ کس انداز سے غور وفکر کیا کرتے تھے؟ کیسے اپنے رب سے اظہارِ عشق وولا کرتے تھے؟ کونسے عوالم وہاں طے کیا کرتے تھے؟ یہ باتیں ہمارے لئے قابلِ تصور نہیں ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام اس زمانے میں کم سن تھے' زیادہ سے زیادہ آپ کی عمر اس وقت بارہ برس ہوگی۔ جس وقت پیغمبر اکرمؐ پر وحی نازل ہوئی' آپ وہاں موجود تھے۔ {اس وقت یوں محسوس ہوتا تھا جیسے} پیغمبر کسی اور ہی عالم میں بسر کر رہے ہیں۔ ہم جیسے ہزار ہا لوگ بھی اگر وہاں موجود ہوتے' تو اپنے اطراف کچھ محسوس نہ کر پاتے۔ لیکن حضرت علیؑ رونما ہونے والے تغیرات کو محسوس کرتے ہیں' پیغمبر اسلامؐ کے عوالم کے اکثر حصوں کو درک کرتے ہیں' کیونکہ فرماتے ہیں:

''وَلَقَدْ سَمِعْتُ رَنَّةَ الشَّيْطَانِ حِينَ نُزُولِ الْوَحْيِ.''

''میں نے نزولِ وحی کے وقت شیطان کی آہ وزاری کی آواز سنی تھی۔''

ایک روحانی شاگرد کی طرح' جو اپنے استاد کے سامنے اپنی روحانی کیفیت کا اظہار کرتا ہے' حضرت علیؑ نے پیغمبر اکرمؐ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! جس وقت آپ پر وحی نازل ہو رہی تھی' میں نے اس ملعون کے آہ وبکا کرنے کی آواز سنی تھی۔ آنحضرتؐ نے جواب دیا: ہاں' علیؑ! بے شک سنی ہوگی' کیونکہ:

''اِنَّکَ تَسْمَعُ مَا اَسْمَعُ وَتَرٰی مَا اَرٰی وَلٰکِنَّکَ لَسْتَ بِنَبِیٍّ.''

''جو میں سنتا ہوں وہ تم سنتے ہو اور جو میں دیکھتا ہوں وہ تم دیکھتے ہو' لیکن تم پیغمبر نہیں ہو۔''

یہ' پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رسالت کے لئے مبعوث ہونے سے پہلے کے کچھ حالات تھے' جنہیں ہم نے آپ کی خدمت میں بیان کرنا ضروری سمجھا۔

رسولِ اکرمؐ کے فرمودات پر ایک نظر

اس عظیم شخصیت کے چند فرامین ہم آپ کی خدمت میں نقل کرتے ہیں۔ پیغمبر اسلامؐ کے فرمودات بھی معجزہ ہیں (قرآنِ مجید جو کلامِ الٰہی ہے وہ اپنی جگہ پر) بالخصوص اُس ماضی کو پیش نظر رکھتے ہوئے جسے ہم نے عرض کیا۔

وہ بچہ جسے قسمت نے اُسی وقت یتیم کردیا ہو جب وہ ابھی اپنی ماں کے شکم ہی میں تھا۔ اور پانچ سال کی عمر میں وہ لطیم {یعنی جس کے ماں باپ دونوں نہ ہوں} بھی ہو گیا ہو جس کی شیر خوارگی کا زمانہ بادیہ نشینوں کے ساتھ گزرا ہو جو اُمیوں اور ناخواندہ لوگوں کی سرزمین مکہ میں پل کر بڑا ہوا ہو جس نے کسی معلم اور مربی کی شاگردی اختیار نہ کی ہو جس نے سوائے دو مختصر سفروں کے اور وہ بھی جزیرۃ العرب سے باہر کے تجارتی سفر تھے {سفر نہ کیا ہو} جو کسی فلسفی، حکیم، دانشور سے نہ ملا ہو سکے باوجود اُس کی زبان سے قرآن جاری ہوتا ہے اور اُس کے قلبِ مقدس پر نازل ہوتا ہے۔ اور بعد میں وہ خود ایسا کلام کرتا ہے اور یہ کلام اتنا حکیمانہ ہوتا ہے کہ جو نہ صرف دنیا بھر کے تمام حکما کے کلام کی برابری کرتا ہے بلکہ ان پر برتر ہوتا ہے۔

اب یہ بات دوسری ہے کہ ہم اتنے سارے مسلمان، اپنے پیغمبرؐ کے کلام کو جمع کرنے اور درست طریقے سے اسکی تشریح اور تبلیغ کے سلسلے میں کسی اہلیت کا مظاہرہ نہ کر سکے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کلمات کو مختلف جگہوں پر نقل کیا گیا ہے۔ ہم بالخصوص قدیم ترین کتابوں سے کچھ کلمات نقل کر رہے ہیں۔ قدیم ترین کتاب جو دسترس میں ہے یا کم از کم مجھے میسر ہے وہ جاحظ کی ''البیان والتبیین'' ہے۔ ''جاحظ'' کا تعلق تیسری صدی کے دوسرے نصف سے ہے۔ یعنی یہ کلمات تقریباً تیسری صدی کے پہلے نصف میں لکھے گئے ہیں۔ یہ کتاب فرنگیوں اور مستشرقین کی نظر میں بھی معتبر کتابوں میں شامل ہے۔ یہ ایسے کلمات نہیں ہیں، جن کے متعلق آپ یہ کہیں کہ انہیں بعد میں لوگوں نے نقل کیا ہے۔ نہیں یہ تیسری صدی میں ایک کتاب کی صورت اختیار کر چکے تھے البتہ یہ تیسری صدی سے پہلے بھی موجود تھے کیونکہ جاحظ نے انہیں

سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔ مثلاً آپ دیکھئے کہ سماج کے حوالے سے ذمے داریوں کے بارے میں اس عظیم شخصیت نے کس طرح کلام فرمایا ہے؟ فرماتے ہیں: کچھ لوگ ایک کشتی میں سوار ہو کر ایک وسیع و عریض سمندر کو عبور کر رہے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے ہم سفر ایک شخص کو دیکھا جو اپنی نشست کے نیچے کھرچ رہا ہے' یعنی سوراخ کر رہا ہے۔ ان میں سے کوئی شخص اپنی جگہ سے اُٹھ کر اس کا ہاتھ نہیں روکتا۔ کیونکہ کسی نے اسے نہیں روکا اس لئے کشتی میں پانی بھر گیا اور وہ سب لوگ سمندر میں ڈوب گئے۔ {معاشرے میں رونما ہونے والی} برائیاں بھی اسی طرح ہوتی ہیں۔

اسکی وضاحت یوں ہے کہ: ایک شخص معاشرے میں برائیوں میں مشغول ہوتا ہے' منکرات کا مرتکب ہوتا ہے۔ ایک دوسرا شخص اُسے دیکھتا ہے اور کہتا ہے: مجھے اس سے کیا سروکار۔ دوسرا کہتا ہے: مجھے کونسا اسکی قبر میں جا کر حساب دینا ہے۔ وہ لوگ یہ نہیں سوچتے کہ معاشرہ ایک کشتی کی مانند ہوتا ہے۔ اگر کسی کشتی میں پانی داخل ہو جائے' چاہے وہ کسی ایک شخص کے بیٹھنے کی جگہ سے داخل ہو وہ صرف اسی شخص کو غرق نہیں کرتا' بلکہ تمام مسافروں کو ایک ساتھ لے ڈوبتا ہے۔

کیا بنی نوع انسان کے درمیان برابری اور مساوات کے بارے میں اس سے اعلیٰ درجے کی بات کہی جاسکتی ہے کہ: اَلنَّاسُ سَوَاءٌ كَاَسْنَانِ الْمُشْطِ۔ (۱) (اب مجھے نہیں معلوم کہ آپ نے کنگھی نکال کر دکھائی تھی یا نہیں؟) کنگھی پر نگاہ ڈالئے' اسکے دندانوں کو دیکھئے۔ دیکھئے' کیا ان میں سے کوئی ایک دندانہ بھی دوسرے سے بڑا ہے؟ نہیں۔ انسان بھی کنگھی کے دندانوں کی طرح ایک دوسرے کے برابر ہیں۔ غور کیجئے' اُس ماحول میں' اُس زمانے میں' ایک انسان انسانی مساوات کے بارے میں ایک ایسا جملہ کہتا ہے کہ آج چودہ سو سال بعد بھی' کوئی اتنا عالی جملہ نہیں کہہ سکا ہے!

حجۃ الوداع کے موقع پر فرماتے ہیں:

۱۔ تحف العقول۔ ص ۳۶۸ میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے۔ {تمام انسان کنگھی کے دندانوں کی طرح برابر ہیں۔}

"اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّ رَبَّکُمْ واحِدٌ وَ اِنَّ اَباکُمْ واحِدٌ کُلُّکُمْ لآدَمَ وَ آدَمُ مِنْ تُرابٍ' لافَضْلَ لِعَرَبِیٍّ عَلیٰ عَجَمِیٍّ اِلَّا بِالتَّقْویٰ." (۱)

اے لوگو! تمام افراد بشر کا پروردگار ایک ہے' تمام انسان ایک ہی باپ کی اولاد ہیں' تم سب فرزند آدم ہو' آدم کو خاک سے پیدا کیا گیا ہے۔ لہٰذا کسی کے پاس اس بات کی گنجائش نہیں رہتی کہ وہ نسل ونژاد' اپنے حسب ونسب' اپنی ذات اور قومیت اور ان جیسی دوسری باتوں پر فخر کرے۔ ہم سب کے سب مٹی سے خلق ہوئے ہیں' اور خاک سے خلق ہونا کسی صورت باعث افتخار نہیں۔ پس روحانی اور معنوی فضائل اور تقویٰ پر افتخار کرنا چاہئے۔ فضیلت کا معیار صرف تقویٰ ہے' اس کے سوا کوئی اور چیز نہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک اور حدیث ہم یہاں "کافی" سے نقل کر رہے ہیں:

"ثَلاثٌ لایُغِلُّ عَلَیْھِنَّ قَلْبُ امْرِءٍ مُسْلِمٍ: اِخْلاصُ الْعَمَلِ لِلّٰہِ وَ النَّصِیحَۃُ لِاَئِمَّۃِ الْمُسْلِمِینَ' وَاللُّزُومُ لِجَماعَتِھِمْ." (۲)

تین چیزیں ایسی ہیں جن کے بارے میں مومن کے دل میں اخلاص کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا ہے۔ یعنی محال ہے کہ کوئی مومن ان تین چیزوں کے بارے میں خیانت کا مرتکب ہو۔ ان میں سے ایک چیز' اللہ رب العزت کے لئے عمل میں اخلاص ہے' مومن اپنے عمل میں ریا نہیں کرتا۔ دوسری چیز' مسلمانوں کے حقیقی رہنماؤں کے لئے خیر خواہی رکھنا ہے' یعنی مسلمانوں کی بھلائی کے امور میں خیر خواہی' اور مسلمانوں کی فلاح وبہبود کے سلسلے میں ان رہنماؤں کو ہدایت ونصیحت۔ تیسری چیز' مسلمانوں کے درمیان اتحاد واتفاق کا مسئلہ ہے' یعنی نفاق کا مرتکب نہ ہونا' مسلمانوں کی صفوں میں شگاف نہ ڈالنا' مسلمانوں کی جماعت میں تفرقہ نہ ڈالنا۔

یہ جملے آپ نے بارہا سنے ہوں گے:

۱۔ تاریخ یعقوبی۔ ج ۲۔ ص ۱۱۰۔ معمولی فرق کے ساتھ۔

۲۔ اصول کافی۔ ج ۱۔ ص ۴۰۳

''كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْؤلٌ عَنْ رَعِيَّتِه.''(۱)

''اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسانِهِ وَ يَدِهِ.''(۲)

''لَنْ تُقَدَّسَ اُمَّةٌ حَتّٰى يُؤْخَذَ لِلضَّعِيفِ فِيها حَقُّهُ مِنَ الْقَوِىِّ غَيْرَ مُتَعْتِعٍ.''(۳)

''کوئی قوم مقامِ قداست نہیں پا سکتی' جب تک اسکے ضعیف اور کمزور افراد کو اپنی قوم کے قوی اور طاقتور افراد سے بلا جھجک اپنے حق کے مطالبے کی قدرت حاصل نہ ہو۔''

دیکھئے عملی کردار کیا ہوتا ہے اور کیا تاثیر رکھتا ہے؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب نقل کرتے ہیں کہ عہدِ رسالت میں' ایک سفر کے دوران' ہم آپ کے ہمراہ تھے۔ ہم نے ایک منزل پر پڑاؤ کیا اور طے پایا کہ یہاں کھانا پکایا جائے گا۔ ایک مویشی کا انتظام کیا گیا' تاکہ کچھ لوگ اسے ذبح کریں اور اس سے مثلاً آب گوشت تیار کر کے کھایا جائے۔ ایک صحابی نے دوسروں سے کہا اس کا سر میں کاٹوں گا' دوسرے نے کہا اسکی کھال میں اتاروں گا' تیسرے نے کہا مثلاً اسے پکاؤں گا میں اور اسی طرح اصحاب نے ذمے داریاں بانٹ لیں' پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: صحرا سے لکڑیاں جمع کر کے میں لاؤں گا۔ اصحاب نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! ہم اس خدمت پر افتخار محسوس کرتے ہیں' آپ آرام سے اپنی جگہ تشریف رکھئے' ہم خود سارے کام کرلیں گے۔ آپؐ نے فرمایا: ہاں' مجھے معلوم ہے' میں یہ نہیں کہتا کہ آپ لوگ یہ امور انجام نہ دیں' لیکن بات کچھ اور ہے۔ اسکے بعد آپ نے ایک جملہ فرمایا' کہا:

''اِنَّ اللّٰهَ يَكْرَهُ مِنْ عَبْدِهِ اَنْ يَراهُ مُتَمَيِّزاً بَيْنَ اَصْحابِهِ.''(۴)

۱۔ الجامع الصغیر۔ ص۹۵ {تم میں سے ہر ایک گلّے بان ہے اور اس سے اسکے گلّے کے بارے میں سوال کیا جائے گا}

۲۔ اصول کافی۔ ج ۲۔ ص ۲۳۴ {مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں۔}

۳۔ نہج البلاغہ۔ مکتوب ۵۳

۴۔ ہدیۃ الاحباب۔ ص ۷۷

خدا اپنے بندوں میں ایسے بندے کو دیکھنا پسند نہیں کرتا جو دوسرے بندوں کے درمیان اپنے لئے کسی امتیاز کا قائل ہو۔ میں اگر یہاں بیٹھا رہوں اور صرف آپ لوگ جا کر کام کریں' تو اس صورت میں' میں آپ کے مقابل اپنے لئے امتیاز کا قائل ہوں گا۔اور خداوند عالم پسند نہیں کرتا کہ کوئی بندہ اپنے لئے یہ حالت اختیار کرے۔(۱) دیکھ لیجئے کتنی گہری بات ہے!

آج کی اصطلاح میں دوسروں پر بھروسہ کرنے کی بجائے ''اپنی ذات پر بھروسہ'' ایک صحیح بات ہے' البتہ یہ خدا پر بھروسے کے مقابل نہیں ہے۔ اپنے اوپر اعتماد بالکل صحیح بات ہے' یعنی دوسرے انسانوں پر تکیہ نہ کرنا' جہاں تک ممکن ہو اپنا کام خود کرنا' کسی سے تقاضا نہ کرنا۔

دیکھئے یہ تربیت کا کیسا عالی شان انداز ہے! یہ {جو فرمایا ہے}: بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ. اسکے کیا معنی ہیں؟

یہ بھی اصحاب نے نقل کیا ہے (۲) کہ ایک سفر کے دوران ہم نے ایک منزل پر پڑاؤ کیا۔ سب لوگ وضو کی تجدید اور نماز کی تیاری کے لئے مصروف ہو گئے۔ ہم نے دیکھا کہ پیغمبر اکرمؐ اپنی سواری سے اترنے کے بعد ایک سمت روانہ ہو گئے۔ کچھ دور جانے کے بعد اچانک واپس پلٹے۔ اصحاب سوچنے لگے پیغمبرؐ نہ جانے کیوں واپس آ رہے ہیں؟ کیا آپ نے آج یہاں پڑاؤ کا ارادہ بدل دیا ہے؟ سب انتظار کرنے لگے' شاید آپ یہاں سے چلنے کا حکم دیں گے؟ لیکن انہوں نے دیکھا کہ پیغمبرؐ نے کچھ نہ کہا' اپنی سواری کے پاس تشریف لائے' اور تھیلے میں سے اونٹ کا زانو باندھنے کی رسی نکالی' اپنے اونٹ کا زانو باندھا اور دوبارہ اسی طرف روانہ ہو گئے۔ اصحاب تعجب سے کہنے لگے: پیغمبرؐ اتنے سے کام کے لئے آئے تھے؟! یہ تو بہت معمولی سا کام تھا! اگر وہیں سے کسی کو آواز دے دیتے کہ ذرا میرے اونٹ کا زانو باندھ دینا' تو یہ کام کرنے کے لئے ہم میں سے ہر کوئی سر کے بل دوڑ پڑتا۔ اصحاب نے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! آپ ہمیں حکم دیتے' ہم میں

۱۔ یہ داستان شیعہ کتابوں میں موجود ہے۔ مرحوم شیخ عباس قمی رضوان اللہ علیہ نے اپنی متعدد کتب میں اسے نقل کیا ہے۔

۲۔ اسے بھی شیخ عباس قمی رضوان اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔ البتہ دوسروں نے بھی اسے نقل کیا ہے۔

ے جس سے بھی کہتے وہ کمال افتخار کے ساتھ یہ کام کر دیتا۔

دیکھیے آنحضرتؐ کس موقع، کس محل پر کس قدر عالی شان سخن فرماتے ہیں! کہتے ہیں:

لایستعن احدکم من غیرہ ولو بقضمۃ من سواک۔ جس قدر ممکن ہو اپنے کاموں میں دوسروں کی مدد نہ لو چاہے ایک مسواک مانگنے کی حد تک ہی کیوں نہ ہو۔ جو کام خود کر سکتے ہو اسے خود انجام دو۔

آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ مدد نہ لو اور جن کاموں کو خود نہیں کر سکتے اُن میں دوسروں سے تعاون طلب نہ کرو۔ نہیں، وہ تعاون طلب کرنے کا مقام ہے۔

اگر کسی کو معتبر کتب میں سے رسول اکرمؐ کے کلمات جمع کرنے کی توفیق نصیب ہو اور یہ توفیق بھی ملے کہ وہ قابل اعتبار ماخذ (sources) سے سیرت رسول کو تحلیلی انداز سے جمع کرے اور اس کا تجزیہ و تحلیل کرے تو اس وقت معلوم ہوگا کہ پوری دنیا میں اس عظیم الشان شخصیت سے بلند مرتبہ کوئی شخصیت پیدا نہیں ہوئی۔ پیغمبر اکرمؐ کا پورا وجود معجزہ ہے۔ نہ فقط آپ کا لایا ہوا قرآن معجزہ ہے بلکہ آپ سرتاپا معجزہ ہیں۔ ہم اپنی گزارشات کو دعا کے چند کلمات پر ختم کریں گے:

باسمک العظیم الاعظم الاعز الاجل الاکرم یا اللہ...

پروردگارا! ہمارے دلوں کو نور ایمان سے منور فرما۔ اپنی معرفت اور محبت کے انوار کو ہمارے قلوب پر تاباں فرما۔ ہمیں اپنی مقدس ذات کی معرفت عطا فرما۔

ہمیں اپنے عظیم المرتبت پیغمبر کی معرفت عطا فرما۔ ہم سب کے دلوں میں اپنی نبی اکرمؐ کی محبت قرار دے۔ اہل بیت رسولؐ کی محبت اور معرفت کا نور ہم سب کے دلوں میں ڈال دے۔ ہمیں اپنے پیغمبرؐ اور ائمہ اطہارؑ کی سیرت سے آشنائی عطا فرما۔ ہمیں اسلام، قرآن اور ان مقدس ہستیوں کا قدردان بنا۔ ہمارے مرحومین کو اپنی عنایات اور رحمت میں شامل فرما۔

و عجل فی فرج مولانا صاحب الزمان۔

☆☆☆

ضمیمہ ۲:

سو کلماتِ پیغمبرؐ

سو کلماتِ پیغمبرؐ

۱۔ انسان جتنا جتنا بوڑھا ہوتا جاتا ہے' اس کے اندر دو صفات جوان ہوتی جاتی ہیں: ایک حرص اور دوسری آرزو۔

۲۔ میری امت کے دو گروہ ایسے ہیں' کہ اگر وہ ٹھیک ہو جائیں' تو میری امت درست ہو جائے گی اور اگر وہ بگڑ جائیں' تو میری امت بگڑ جائے گی: ایک علما اور دوسرے حکام۔

۳۔ تم سب گلے بان ہو اور ایک دوسرے کی نگرانی کے ذمے دار ہو۔

۴۔ ہر ایک کو مال سے راضی نہیں کیا جا سکتا' لیکن حسنِ اخلاق سے راضی کیا جا سکتا ہے۔

۵۔ غربت و ناداری بلا ہے' اس سے بدتر جسمانی بیماری' اور جسم کی بیماری سے زیادہ دشوار دل کی بیماری ہے۔

۶۔ مومن ہمیشہ حکمت کی تلاش میں رہتا ہے۔

۷۔ علم کو پھیلنے سے نہیں روکا جا سکتا۔

۸۔ انسان کا دل اس پَر کی مانند ہے جو جنگل میں کسی درخت پر اٹکا ہوا ہو اور ہوا کے چلنے سے ہر وقت متغیر اور اوپر نیچے ہوتا رہتا ہو۔

۹۔ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں۔

۱۰۔ نیک کاموں کی ہدایت' خود وہ کام کرنے کی مانند ہے۔

۱۱۔ ہر سوختہ دل کے لئے آخر کار ایک اجر ہے۔

۱۲۔ جنت ماؤں کے قدموں تلے ہے۔

۱۳۔ عورتوں کے ساتھ سلوک میں اللہ سے ڈرو' اور جتنا ہو سکے ان کے ساتھ نیکی سے پیش آؤ۔

۱۴۔ سب کا پروردگار ایک ہے اور سب ایک ہی باپ کی اولاد ہیں۔ تم سب فرزندِ آدم ہو اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے ہیں۔ خدا کی نظر میں تم میں سب سے زیادہ باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔

۱۵۔ ضد سے پرہیز کرو کہ اس کا سبب جہالت اور اس کا نتیجہ شرمندگی ہے۔

۱۶۔ بدترین انسان وہ ہے' جو خطا کو معاف نہ کرے اور لغزش سے چشم پوشی نہ کرے اور اس سے بھی زیادہ بدتر وہ ہے جس کے شر سے لوگ محفوظ نہ ہوں اور اس کی طرف سے انہیں نیکی کی امید نہ ہو۔

۱۷۔ غصہ نہ کرو' اور اگر غصہ آ جائے' تو لمحے بھر کے لئے خالق کی قدرت کے بارے میں سوچو۔

۱۸۔ جب تمہاری تعریف کی جائے' تو تم کہو: اے خدا مجھے اس سے بہتر بنا دے جتنا یہ مجھے سمجھتے ہیں اور میرے بارے میں جو باتیں یہ نہیں جانتے' انہیں تو معاف فرما دے اور جو کچھ یہ کہتے ہیں مجھے اس کا ذمے دار نہ ٹھہرا۔

۱۹۔ خوش آمد کرنے والوں کے چہروں پر مٹی ڈال دو۔

۲۰۔ اگر خدا کسی بندے کے ساتھ نیکی کرنا چاہتا ہے' تو اس کے نفس کو اس کے لئے واعظ اور رہنما بنا دیتا ہے۔

۲۱۔ مومن صبح و شام اپنے آپ کو خطاکار سمجھتے ہوئے بسر کرتا ہے۔

۲۲۔ تمہارا سخت ترین دشمن وہ نفسِ امارہ ہے جو تمہارے دو پہلوؤں کے درمیان واقع ہے۔

۲۳۔ بہادر ترین انسان وہ ہے جو اپنے نفس پر غلبہ پا لے۔

۲۴۔ اپنی نفسانی خواہشات کا مقابلہ کرو' تا کہ اپنے مالک بن جاؤ۔

۲۵۔ اس انسان کا بھلا ہو جو اپنے عیوب پر توجہ کی وجہ سے دوسروں کے عیوب پر توجہ سے باز رہے۔

۲۶۔ سچائی دل کو سکون پہنچاتی ہے اور جھوٹ شک اور پریشانی پیدا کرتا ہے۔

۲۷۔ مومن آسانی سے انس حاصل کر لیتا ہے اور دوسروں کے ساتھ مانوس ہو جاتا ہے۔

۲۸۔ مومنین عمارت کے اجزا کی مانند ایک دوسرے کی حفاظت کرتے ہیں۔

۲۹۔ مومنین کی آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور دوستی اس بدن کی مانند ہے کہ جب اس کا ایک عضو تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے تو دوسرے اعضا بخار اور بے خوابی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

۳۰۔ انسان کنگھی کے دندانوں کی طرح برابر ہیں۔

۳۱۔ حصول علم ہر مسلمان پر واجب ہے۔

۳۲۔ جہالت سے بڑھ کر کوئی فقر نہیں، عقل سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں اور غور و فکر سے بڑھ کر کوئی عبادت نہیں۔

۳۳۔ گہوارے سے گور تک علم حاصل کرو۔

۳۴۔ علم حاصل کرو چاہے چین جانا پڑے۔

۳۵۔ مومن کی عظمت شب بیداری میں ہے اور اس کی عزت دوسروں سے بے نیازی میں ہے۔

۳۶۔ علما علم کے پیاسے ہوتے ہیں۔

۳۷۔ محبت، بہرہ اور اندھا کر دیتی ہے۔

۳۸۔ خدا کا ہاتھ جماعت کے ساتھ ہے۔

۳۹۔ پرہیزگاری، روح اور جسم کو آرام بخشتی ہے۔

۴۰۔ جو کوئی چالیس دن خدا کی خاطر زندگی گزارے تو حکمت کے چشمے اس کے دل سے زبان پر جاری ہو جاتے ہیں۔

۴۱۔ خدا کی نظر میں اپنے گھرانے کے ساتھ رہنا، مسجد میں ڈیرا ڈال دینے سے زیادہ پسندیدہ ہے۔

۴۲۔ تمہارا بہترین دوست وہ ہے، جو تمہیں تمہارے عیب دکھائے۔

۴۳۔ علم کو لکھ کر قید کر لو۔

۴۴۔ جب تک دل ٹھیک نہ ہو' ایمان ٹھیک نہ ہوگا' اور جب تک زبان درست نہ ہو' دل درست نہ ہوگا۔
۴۵۔ جب تک کسی کی عقل کا امتحان نہ لے لو' اس کے اسلام لانے کو اہمیت نہ دو۔
۴۶۔ صرف عقل کے ذریعے سے نیکیوں تک پہنچا جا سکتا ہے۔ جس کے پاس عقل نہ ہو وہ دین سے محروم ہے۔
۴۷۔ دین کو جتنا نقصان دشمن پہنچاتے ہیں' اس سے زیادہ نقصان جاہل کی زبان پہنچاتی ہے۔
۴۸۔ میری امت کے ہر صاحب عقل کے لئے چار چیزیں ضروری ہیں: علم کو سننا' اسے یاد رکھنا' اسے پھیلانا اور اس پر عمل کرنا۔
۴۹۔ مومن کو ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جا سکتا۔
۵۰۔ مجھے اپنی امت کی غربت کا نہیں بے تدبیری کا خوف ہے۔
۵۱۔ خدا خود جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔
۵۲۔ اللہ ہنرمند مومن کو پسند کرتا ہے۔
۵۳۔ خوش آمد مومن کی عادت نہیں ہوتی۔
۵۴۔ طاقت کا تعلق زور بازو سے نہیں ہے' بلکہ طاقتور وہ ہے جو اپنے غصے پر قابو پالے۔
۵۵۔ بہترین انسان وہ ہے جو دوسرے انسانوں کے لئے سب سے زیادہ مفید ہو۔
۵۶۔ تمہارے گھروں میں سے بہترین گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم عزت سے زندگی گزارتا ہو۔
۵۷۔ کتنی اچھی ہے وہ حلال دولت جو کسی نیک انسان کے ہاتھ میں ہو۔
۵۸۔ عمل کا سلسلہ موت پر ختم ہو جاتا ہے' سوائے ان تین ذرائع کے: ایسی نیکی جو جاری رہنے والی ہو' ایسا علم جو مسلسل فائدہ پہنچاتا رہے' ایسی نیک اولاد جو والدین کے لئے دعائے خیر کرے۔
۵۹۔ خدا کی عبادت کرنے والے تین قسم کے ہیں: ایک وہ جو خوف کی وجہ سے عبادت کرتے ہیں' اور یہ غلاموں کی عبادت ہے۔ دوسرے وہ جو اجر کے لالچ میں عبادت کرتے ہیں' اور یہ مزدوروں کی عبادت ہے۔ تیسرے وہ جو عشق و محبت کی وجہ سے عبادت کرتے ہیں' اور یہ آزاد مردوں کی عبادت ہے۔
۶۰۔ تین چیزیں ایمان کی علامت ہیں: تنگدستی کے باوجود دوسرے کی مدد کرنا' کسی کے فائدے

کے لئے اپنے حق سے دستبردار ہو جانا' طالب علم کو علم سکھانا۔

۶۱۔دوست سے اپنی دوستی کا اظہار کرو تا کہ محبت کا تعلق مضبوط تر ہو۔

۶۲۔تین چیزیں دین کے لئے نقصاندہ ہیں: بدکار فقیہ' ظالم رہنما' جاہل عابد۔

۶۳۔لوگوں کو ان کے دوستوں کے ذریعے پہچانو' کیونکہ انسان اپنے جیسا اخلاق رکھنے والے کو دوست بناتا ہے۔

۶۴۔چھپ کر گناہ گناہگار کو نقصان پہنچاتا ہے' اور کھلم کھلا گناہ کرنا معاشرے کو۔

۶۵۔دنیا کے کاموں کی بہتری کے لئے کوشش کرو' لیکن اُمورِ آخرت کے لئے اس طرح کام کرو گویا کل ہی اس دنیا سے جا رہے ہو۔

۶۶۔روزی کو زمین کی گہرائیوں میں تلاش کرو۔

۶۷۔کبھی کبھی لوگ خودستائی سے اپنی قدر گھٹا دیتے ہیں' اور انکساری سے اپنا مقام بڑھا لیتے ہیں۔

۶۸۔خدایا! میرے بڑھاپے اور زندگی کے آخری ایام میں فراخ ترین روزی عطا فرما۔

۶۹۔اولاد کے باپ پر حقوق میں سے یہ بھی ہیں کہ اس کا اچھا نام رکھے' اسے لکھنا سکھائے اور جب بالغ ہو جائے تو اسکی شادی کرے۔

۷۰۔صاحب اقتدار طاقت کو اپنے مفاد میں استعمال کرتا ہے۔

۷۱۔اعمال کے ترازو میں رکھی جانے والی بھاری ترین چیز خوش اخلاقی ہے۔

۷۲۔تین چیزیں عقلمند انسان کی توجہ کے قابل ہیں: زندگی کی بہبودی' زادِ آخرت' حلال مسرت۔

۷۳۔ایسے انسان کی کیا بات جو فالتو مال دوسروں کو دیدے اور فالتو باتیں اپنے پاس رکھ لے۔

۷۴۔موت ہمیں ہر نصیحت کرنے والے سے بے نیاز کر دیتی ہے۔

۷۵۔حکومت اور اقتدار کی اتنی ہوس اور آخر میں اتنا غم اور پشیمانی!

۷۶۔بدکار عالم بدترین انسان ہے۔

۷۷۔جس جگہ بدکار حکمران اور احمق معزز ہو جائیں' وہاں کسی بلا کی توقع رکھو۔

۷۸۔لعنت ہو اس پر جو اپنا بار دوسروں کے دوش پر ڈال دے۔

۷۹۔ انسان کی خوبصورتی اس کی گفتار میں ہے۔

۸۰۔ عبادت کی سات قسمیں ہیں اور ان میں سے سب سے عظیم حلال روزی طلب کرنا ہے۔

۸۱۔ لوگوں سے خدا کے خوش ہونے کی علامت اُن کے یہاں قیمتوں میں کمی اور ان پر عادلانہ حکومت ہے۔

۸۲۔ ہر قوم اسی حکومت کے لائق ہے جو اس پر ہوتی ہے۔

۸۳۔ گالیاں دے کر لوگوں کی عداوت کے سوا کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے۔

۸۴۔ بت پرستی کے بعد جس چیز سے مجھے روکا گیا ہے وہ لوگوں کے ساتھ جھگڑا کرنا ہے۔

۸۵۔ جو کام سوچے سمجھے بغیر انجام دیا جائے اس میں بسا اوقات نقصان کا امکان ہوتا ہے۔

۸۶۔ جو شخص لوگوں کے ساتھ اتفاق سے رہنے کی نعمت سے محروم ہے وہ نیکیوں سے یکسر محروم رہے گا۔

۸۷۔ دوسروں سے کوئی چیز نہ مانگو چاہے مسواک کی ایک لکڑی ہی کیوں نہ ہو۔

۸۸۔ خدا کو یہ بات پسند نہیں ہے کہ وہ اپنے بندے کو اس کے ساتھیوں کے درمیان خاص امتیاز کے ساتھ دیکھے۔

۸۹۔ مومن خوش رو اور شوخ ہوتا ہے اور منافق ترش رو اور غصیلہ۔

۹۰۔ اگر فال بد لو تو اپنا کام جاری رکھو اور برا خیال کرو تو بھول جاؤ اور اگر حسد ہو جائے تو پروقار رہو۔

۹۱۔ محبت کے ساتھ ایک دوسرے سے مصافحہ کرو کہ یہ کینے کو دل سے نکال دیتا ہے۔

۹۲۔ جو شخص اس حالت میں صبح کرے کہ مسلمانوں کے امور کی اصلاح کی فکر میں نہ ہو تو وہ شخص مسلمان نہیں ہے۔

۹۳۔ خوش روئی کینے کو دل سے نکال دیتی ہے۔

۹۴۔ کہیں لوگوں کا خوف تمہیں حق بات کہنے سے باز نہ رکھے!

۹۵۔ عقل مند ترین انسان وہ ہے جو دوسروں کے ساتھ اچھی طرح بنا کے رکھے۔

۹۶۔ ایک ہی سطح پر زندگی گزارو تا کہ تمہارے دل ایک ہی سطح پر رہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ

میل ملاقات رکھو تا کہ باہم مہربان رہو۔

۹۷۔موت کے وقت لوگ پوچھتے ہیں کہ کتنا مال و دولت چھوڑا ہے؟ اور فرشتے پوچھتے ہیں کہ کتنا نیک عمل آگے بھیجا ہے؟

۹۸۔اللہ کے نزدیک نفرت انگیز ترین حلال کام طلاق ہے۔

۹۹۔لوگوں کے درمیان اصلاح کرنا بہترین کار خیر ہے۔

۱۰۰۔خدایا مجھے علم سے توانا بنا' بردباری سے زینت بخش' پرہیز گاری سے عزت دے اور تندرستی سے خوبصورتی عطا فرما۔

☆☆☆

ہماری مطبوعات

ہمارے ائمہؑ اور سیاسی جدوجہد	آیت اللہ سید علی خامنہ ای
دنیائے جوان	آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ
فکرونظر	آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ
فقہ زندگی	آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ
امام حسینؑ نے کیوں قیام فرمایا؟	علامہ ابراہیم امینی؛ محمد باقر شریعتی سبزواری
حسین ابن علیؑ کا خطاب	محمد صادق نجمی
حسین ابن علیؑ مدینہ تا کربلا	محمد صادق نجمی
کلام امام حسینؑ کی چند کرنیں	حجت الاسلام محسن غرویان
نہج البلاغہ اور حیاتِ اجتماعی	شیخ حسن موسیٰ صفار
نوجوانوں کے لئے جاننے کی باتیں	رضا فرہادیان
ماہِ رمضان تزکیۂ نفس اور اصلاحِ کردار کا مہینہ	مجلسِ مصنفین
اسلامی تحریک قرآن وسنت کی روشنی میں	شیخ محمد حسن صلاح الدین
بہترین عشق	جواد محدثی
عباد الرحمٰن کے اوصاف	محمد محمدی اشتہاردی
عبادت ونماز	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
توبہ کیا ہے کیسے قبول ہوتی ہے	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
اسلام اور عصرِ حاضر کی ضروریات	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
جہاد	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
معنوی آزادی	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
سیرتِ نبویؐ ایک مطالعہ	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
ائمہؑ اہلِ بیتؑ کی فکری وسیاسی زندگی	رسول جعفریان (زیرِ طبع)
خاتمیت	استاد شہید مرتضیٰ مطہری (زیرِ طبع)

دار الثقلین